اُردو کا کلاسیکی ادب
توبۃ النصوح
از
شمس العلماء ڈپٹی نذیر احمد
مرتبہ
پروفیسر افتخار احمد صدیقی
مجلسِ ترقیِ ادب ۰ لاہور

بعون صانع مکین و مکان و بفضل خلاق زمین و زمان
اردو کا کلاسیکی ادب
توبۃ النصوح
از
شمس العلماء ڈپٹی نذیر احمد
ناشر
مجلس ترقی ادب ۲۔ نرسنگھ داس گارڈن کلب روڈ لاہور

فہرست

صفحہ

پیش لفظ

از پروفیسر افتخار احمد صدیقی

مجلس ترقیٔ ادب ، جس کا اولین مقصد اردو ادب کے متاعِ گم گشتہ کی باز یافت ہے ، "توبۃ النصوح" جیسی 'چالو' کتاب کیوں شائع کر رہی ہے ، جب کہ اس کے تین چار ایڈیشن بازار میں موجود ہیں ؟ یہ سوال اُن اصحاب کے ذہن میں ضرور پیدا ہوگا جو اس حقیقت سے آگاہ نہیں کہ "گلستان سعدی" ہو یا "توبۃ النصوح" ، ہمارے یہاں ہر پرانی کتاب جتنی زیادہ چھپتی ہے ، اسی قدر اس میں اغلاط و تحریفات کا تناسب بھی بڑھتا جاتا ہے ۔ آپ اس کلّیے کی مستثنیات تلاش کریں گے تو الاماشاء اللہ کی مصداق شاید ایک ہی کتاب ملے گی —— کتاب اللہ ۔ ڈاکٹر بجنوری مرحوم نے دیوانِ غالب کو ہندوستان کی الہامی کتاب کہا ہے لیکن 'نقش' غالب بھی کاتبوں اور منشیوں کی 'شوخیٔ تحریر کا فریادی' ہے ۔

مجلس نے "توبۃ النصوح" کی ترتیب کا کام ڈیڑھ دو سال پہلے مجھے سونپا تھا ۔ اسلامیہ کالج اور پنجاب یونیورسٹی کے کتب خانوں سے جو نسخے مجھے دستیاب ہوسکے انہیں سامنے رکھ کر میں نے متن کی تصیحح شروع کی ، لیکن مقابلے کے لیے آگرہ اور کانپور کے دو ابتدائی نسخے درکار تھے جو کہیں ہاتھ

نہ آئے۔ انھی دنوں عزیز گرامی، عبد الغفور صاحب ایم۔ اے
(مہتمم ادارۂ ناشرین لاہور) کی عنایت سے مسٹر ایم۔ کیمپسن
کا مرتبہ نسخہ (مطبوعہ لندن ۱۸۸۶ء) مجھے مل گیا۔ یہ
نسخہ نول کشور ایڈیشن (مطبوعہ ۱۸۸۲ء) پر مبنی ہے اور
ٹائپ میں نہایت اہتمام سے طبع ہوا ہے۔ لیکن چوں کہ مرتب
نے جگہ جگہ طویل بیانات اور مکالموں کو مختصر کر دیا
ہے، اس لیے تصحیح کا کام خاطر خواہ انجام نہ پا سکا۔ گزشتہ
سال کراچی جانے کا اتفاق ہوا تو بڑی تلاش کے بعد دو
ایسے نسخے دستیاب ہوئے کہ متن کی صحت، حسن کتابت اور
اہتمام طباعت کے اعتبار سے ان سے بہتر کوئی نسخہ اب تک
میری نظر سے نہیں گزرا۔ ان میں سے ایک خود مصنف کی
زیر نگرانی ۱۳۱۱ھ مطابق ۹۵-۱۸۹۴ء میں مطبع انصاری دھلی
میں چھپا اور دوسرا نسخہ بہ اہتمام مولوی منذر احمد صاحب
(نبیرۂ ڈاکٹر نذیر احمد) جید برقی پریس دھلی سے ۱۹۲۸ء
میں شائع ہوا۔ میں نے اول الذکر سے مقابلہ کر کے پوری
کتاب کے متن کو دوبارہ درست کیا۔ چوں کہ 'فسانۂ مبتلا'
کا مجلسی ایڈیشن مرتب کرتے وقت ابتدائی نسخوں کی اہمیت
مجھ پر پوری طرح واضح ہو چکی تھی، اس لیے آگرہ اور
کانپور کے نسخوں کی تلاش برابر جاری رہی۔ پچھلے دنوں
جب میں اپنے تحقیقی کام کے سلسلے میں ھندوستان گیا تو رام پور
علی گڑھ اور دھلی کے کتب خانوں میں آگرے کا پہلا ایڈیشن
(مطبوعہ ۱۸۷۴ء)، مطبع نظامی کانپور کا ایڈیشن (مطبوعہ
۱۸۷۹ء) اور مطبع نول کشور کانپور کے ۱۸۸۲ء اور ۱۸۸۷ء
والے نسخے دیکھنے کو ملے۔ ان تمام نسخوں کا باہم مقابلہ کرنے
کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ کانپور کے چھپے ہوئے نسخے،

املا و کتابت کے معمولی فرق کے سوا ، بالکل یکساں ہیں اور ان کا متن کئی جگہ طبع اول سے قدرے مختلف ہے ۔ مطبع انصاری دھلی کا مذکورہ بالا ایڈیشن جس سے میں نے زیر نظر نسخے کی ترتیب میں استفادہ کیا ہے ، طبع اول کے عین مطابق ہے ۔ فرق اگر ہے تو صرف یہ کہ طبع اول میں 'اس کا' ، 'ان کا' ، 'الٹا' وغیرہ الفاظ پرانے طریقے سے 'اوس کا' 'اون کا' 'اولٹا' لکھے گئے ہیں ، نیز املے کا خیال نہیں رکھا گیا ۔ مطبع انصاری دھلی والے نسخے میں جدید طرز املا و کتابت کی پیروی کی گئی ہے ۔ اس ایڈیشن کی حیثیت کا اندازہ اس اعلان سے کیا جا سکتا ہے جو کتاب کے آخری صفحے پر منصرم مطبع ، محمد عنایت اللہ صاحب کی طرف سے کیا گیا ہے ، لیکن طرز عبارت ، سخن شناسوں سے کچھ اور اشارہ کر رہی ہے ۔ ملاحظہ ہو :

> ''. . . . مصنف نے اپنی تمام تصنیفات کو نظر ثانی و اصلاح کے بعد اس مطبع میں چھپوانا شروع کیا ہے ۔ پہلا گھان[1] ہاتھوں ہاتھ بکا اور اب یہ دوسرا گھان ہے جس کا لگا لگایا ہے اور خدا نے چاہا تو ایسے کتنے گھان نکلیں اور لوگوں کو بے انتہا فائدے پہنچائیں گے ۔ کیوں کہ ہم دیکھتے

۱۔ تلہن کی جو معین مقدار تیل نکالنے کے لیے بہ یک وقت کولھو میں ڈالی جاتی ہے ، اسے تیلیوں کی اصطلاح میں 'گھان' کہتے ہیں ۔ ایڈیشن کے معنی میں یہ لفظ ، نذیر احمد کی خاص ایجاد اور ان کے لسانی ذوق اجتہاد کی ایک مثال ہے ۔ لیکن اسے قبول عام کی سند حاصل نہیں ہوئی ۔ (مرتب)

ھیں کہ یہ کتابیں، خدا جھوٹ نہ بلوائے تو
سینکڑوں بار چھپیں اور لوگ ویسے ھی مشتاق
ھیں جیسے تھے ۔"

اضعف عباد اللہ ، محمد عنایت اللہ ،
منصرم مطبع انصاری دھلی (ص : ۱۶۸)

اب ذرا متداول نسخوں پر بھی ایک نظر ڈالتے چلیے ۔
متن کی تصحیح کے لیے جس نسخے کو استعمال کیا گیا ، وہ
بازار میں سب سے زیادہ دیدہ زیب اور صحیح نسخہ ھے ۔
لیکن توبۃالنصوح گزشتہ ایک صدی کی بے شمار اشاعتوں
میں اس طرح پیہم شکستوں اور جراحتوں سے دو چار ھوتی
رھی کہ اس کا مداوا محض حسن کتابت اور سر ورق کی
تزئین و آرائش سے ممکن نہ تھا ۔ ھو سکتا ھے کہ اس
ایڈیشن کے کاتب نے غلطیوں میں مزید اضافہ نہ کیا ھو
لیکن اس غریب کو اپنے پیش روؤں کی اغلاط و تحریفات کے
بار امانت کو تو سنبھالنا ھی پڑا ھوگا ۔ یہاں کتابت کی
بے شمار غلطیوں سے قطع نظر کرکے صرف فصل دھم سے ان
'کارستانیوں' کے کچھ نمونے پیش کروں گا جنھیں
سہو کاتب سے منسوب نہیں کیا جا سکتا ۔

۱۔ املا کا التزام نہیں رکھا گیا ۔ مثلاً ظاھر دار بیگ
کے مکالمے کا ایک جملہ یہ ھے : "اس بات کے
مشورے ھو رھے ھیں کہ بندے کو منا لے جائیں ۔"
یہاں آپ کو 'بندے' کی جگہ 'بندہ' کھڑا ملے گا ۔

۲۔ 'ھامی بھرنا' میں 'ھامی' کو ھر جگہ حائے حطی
سے 'حامی' لکھا گیا ھے ۔

۳- اهل دهلی کے محاورے میں 'جوں ہی' کی جگہ صرف 'جوں' آتا ہے۔ نذیر احمد عموماً اسی طرح لکھتے ہیں۔ مثلاً "جوں گلی سے باہر نکلا کہ میاں فطرت اس کو مل گئے۔" لیکن متداول نسخوں میں ہر جگہ مصنف کو اصلاح دے کر 'جوں ہی' کر دیا گیا ہے۔

۴- نذیر احمد نے کہیں کہیں قدیم محاورے کے مطابق 'نسبت کر' لکھا ہے۔ نصوح کلیم سے کہتا ہے: "غالباً میری نسبت کر تم کو اس گھر میں زیادہ رہنا ہے۔" مرتبین نے ہر جگہ 'نسبت کر' جیسے متروک محاورے کو تبدیل کر کے 'بہ نسبت' لکھا ہے۔

۵- فاضل منشیان مطبع نے فارسی و عربی مرکبات کی تسہیل و تحلیل کا بھی اہتمام کیا ہے۔ مثلاً 'اہتمام خاص' کو 'خاص اہتمام' سے بدل دیا ہے۔ کلیم و فطرت کی ملاقات کے سلسلے میں ایک فقرہ یوں ہے: "ورنہ فی الاصل باپ کا اس کو گھر سے نکال دینا مرکوز خاطر تھا۔" یہاں 'فی الاصل' کی ثقالت دور کرنے کی غرض سے 'در اصل' لکھ دیا گیا ہے۔

۶- وہ الفاظ و محاورات جو مرتبین کے لیے نا قابل فہم یا نامانوس تھے بے تکلف نکال باہر کیے گئے۔ کتاب کے دوسرے ابواب میں اس کی بڑی دل چسپ مثالیں ملتی ہیں۔ مثلاً گیارھویں باب میں دولت آباد

کے صدر اعظم کے بارے میں کاتب کا تاثر یوں بیان کیا گیا ہے : ''واقع میں یہ شخص بڑی پایگاہ کا آدمی ہے۔'' یہاں 'پائے کا آدمی' لکھ کر 'پایگاہ' کی الجھن رفع کر دی گئی۔ دسویں باب میں بھی اس کی مثالیں موجود ہیں۔ فطرت کاتب سے کہتا ہے : ''شکوہ غیر سے نہیں کرتے۔ گلہ اوپری سے نہیں ہوتا۔'' مرتب کو یہاں 'اوپری' کچھ اوپری سا لگا۔ اسے ہٹا کر 'اوپر ہی' رکھ دیا۔

۷۔ عبارت کی محاوراتی ساخت کو توڑ پھوڑ کر اپنی مرضی کے مطابق ڈھالنے کی اکثر کوشش کی گئی ہے۔ صرف فصل دہم سے یہ تین مثالیں پیش کی جاتی ہیں :

(ا) ''نہ اس وجہ سے کہ وہ فطرت سے عداوت رکھتا تھا'' (ص : ۲۹۹)۔ اصلاح کے بعد فقرہ یوں ہو گیا : ''اس وجہ سے نہیں کہ وہ فطرت سے عداوت رکھتا تھا۔''

(ب) ''میں کیا کوئی نہیں کہہ سکتا کہ مجھ کو آپ کے ساتھ نسبت فرزندی باقی رہی'' (ص : ۳۰۷)۔ مرتّب نے 'میں کیا' کو حشو سمجھ کر حذف کر دیا۔ اب سادہ سا فقرہ باقی رہ گیا : ''کوئی نہیں کہہ سکتا کہ۔۔۔۔''

(ج) ''کیا ہزار تو پایا ایک۔ کیا مَن تو بھکتا چھٹانک۔ بلکہ ایک اور چھٹانک بھی نہیں ،

حاشا نہیں زینہار نہیں" (ص : ۳۰۸) - یہاں
'ایک اور چھٹانک' کی جگہ 'ایک آدھ
چھٹانک' رکھ دیا گیا ہے تا کہ جملے کی
ساخت عام محاورے کے مطابق ہو جائے -

مندرجہ بالا تمام مثالیں صرف ایک باب سے پیش کی گئی ہیں لیکن اس 'مشتے از خروارے' سے پوری کتاب کی حالت کا بہ خوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اور یہ مروجہ نسخوں میں سب سے بہتر نسخہ ہے - دوسرے اداروں کے ایڈیشن اس کے بعد چھپے ہیں اور اسی کی نقل ہیں لیکن کتابت کے ناقص انتظام کی وجہ سے اس سے بدرجہا بدتر ہیں - دیکھا آپ نے ، یہ ہے وہ سلوک جو کلاسیکی ادب کے ایک شاہکار کے ساتھ اب تک روا رکھا گیا ہے -

زیر نظر نسخے میں علاماتِ اوقاف ، پیراگرافوں کی تقسیم ، املے کی رعایت ، جدید طریقِ املا و کتابت کی پیروی ، غرض ہر لحاظ سے مجلس ترقیٔ ادب کی مطبوعات کا معیار قائم رکھنے کی کوشش کی گئی ہے - خیال آیا کہ ہر فصل کی ابتدا میں جو عبارتیں بہ طور عنوان درج ہیں ، انھیں حذف کر دیا جائے کہ یہ داستانی اسلوب ، جدید کہانیوں کو زیب نہیں دیتا - نیز بعض فصلوں کی (بالخصوص فصل دہم کی جو طویل اور گوناگوں واقعات پر مشتمل ہے) نئے سرے سے تحدید و تعین کی جائے - لیکن یہ دونوں باتیں 'مجلسی' آداب و رسوم کے خلاف نظر آئیں -

ڈاکٹر نذیر احمد نے اپنی بعض تصانیف میں حواشی و فرہنگ کا اضافہ خود ہی کیا تھا - اب چوں کہ عربی و

فارسی زبانوں سے بے گانگی اور دہلی کے روزمرے اور محاورے سے اجنبیت بڑھتی جا رہی ہے اس لیے حواشی و فرہنگ کے دائرے کو وسیع کرنا پڑا ۔ فرہنگ کی ترتیب میں بہ غرض اختصار و سہولت ، اصول لغت نویسی کی پیروی نہیں کی گئی بلکہ محل استعمال کے مطابق مفہوم لکھ دیا گیا ہے ۔ آیات قرآنی کے ترجموں کے ساتھ حوالے بھی درج کر دئے گئے ہیں ۔ مصنف کے تمام حاشیے بجنسہ نقل کر کے انہیں ستارے کے نشان سے ممیز کر دیا گیا ہے ۔

اس نسخے کی تصحیح میں مزید احتیاط یہ کی گئی ہے کہ پوری کتاب کے آخری دو پروف میں خود دیکھتا رہا ہوں ۔ لیکن اگر تحقیق پریس ، اردو بازار (لاہور) کے مالک ، محبی ایس ۔ ایم ۔ شفیق صاحب اور پریس کے مستعد کارکن ، انتہائی توجہ و تحمل سے اس صبر آزما مہم میں میرا ساتھ نہ دیتے تو غالباً توبۃ النصوح کا صحیح ترین نسخہ مرتب کرنے کی یہ ساری کوششیں رائگاں جاتیں ۔

اس احتیاط و اہتمام کے باوجود ، بہت سی خامیاں اور خرابیاں اس نسخے میں بھی رہ گئی ہوں گی ۔ لیکن کیا کیا جائے کہ بہر صورت ۔ ع :

مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی

و ۔ ا ۔ ص

مقدمہ

(۱)

بعض نقادوں نے "توبۃ النصوح" کو فنی حیثیت سے اردو کا پہلا باقاعدہ ناول قرار دیا ہے - لیکن حیرت کی بات ہے کہ شہرت و مقبولیت اور کثرتِ اشاعت کے اعتبار سے اردو کا کوئی ناول بلکہ اردو نثر کی کوئی کتاب اب تک اس کی برابری نہیں کر سکی - ۱۸۷۴ء میں جب یہ کتاب پہلی مرتبہ چھپی تو سر ولیم میور، لفٹیننٹ گورنر شمالی و مغربی صوبہ (موجودہ یو - پی - انڈیا) نے مصنف کو حکومت کی طرف سے ایک ہزار روپے کا اول انعام پیش کیا اور سرکاری جریدے میں مصنف اور تصنیف دونوں کی دل کھول کر تعریف[1] کی - گزشتہ صدی کے ربع آخر میں ہندوستان کی مختلف زبانوں میں اس کے ترجمے ہوئے - اس زمانے کے ڈائرکٹر تعلیمات صوبہ شمالی و مغربی، مسٹر ایم - کمپسن، ایم - اے نے انگریزی میں اس کا ترجمہ کیا جو ۱۸۸۴ء میں لندن میں شائع ہوا - ۱۸۸۶ء میں انہوں نے توبۃ النصوح کا ایک

---

۱ - سر ولیم میور کا نوٹ جو ترمیم و اضافے کے بعد مسٹر کیمپسن کے ترجمے کا دیباچہ بنا، نیز مسٹر کیمپسن صاحب کا مفصل تبصرہ اپنی تاریخی اہمیت کی بنا پر، زیر نظر کتاب کے آخر میں بہ طور ضمیمہ شامل ہے - (مرتب) -

ایڈیشن انگریزی کے حواشی و فرہنگ کے ساتھ مرتب کر کے لندن میں چھپوایا ۔ اشاعت اول سے لے کر اب تک دھلی ، لاھور ، لکھنؤ ، حیدرآباد (دکن) ، کراچی اور دیگر ادبی و طباعتی مراکز سے اس کے بے شمار ایڈیشن شائع ہو چکے ھیں ۔ گزشتہ ایک صدی میں اردو ناول پر کئی دور آئے اور گزر گئے ۔ اصلاحی ، رومانی ، تاریخی ، جاسوسی ، سماجی اور نفسیاتی ناولوں کے اس انبار میں گنتی کے چند ناول ھیں جو زندگی ، فن اور ادب کے حسین امتزاج سے نقشِ دوام ثابت ھوئے ، اور توبۃ النصوح کا نام ان میں سر فہرست ھے ۔ ھر زمانے کے ادیبوں اور نقادوں نے اس کی خوبیوں کو سراھا ھے ۔ علامہ شبلی کی بلند مذاق سے کون واقف نہیں ۔ توبۃ النصوح اردو کی ان چند کتابوں میں سے ھے جنھیں وہ دل سے پسند کرتے تھے[۲] ۔ دور حاضر میں اس پر اتنا کچھ لکھا جا چکا ھے کہ ان تمام تبصروں کا صرف حوالہ دینا بھی باعث طوالت ھوگا ۔ یہاں صرف دو فاضل نقادوں کے اقوال نقل کیے جاتے ھیں ۔ یہ دونوں ، بقول کسے ، اردو کے کم سواد 'پروفیسران ادب' نہیں بلکہ انگریزی کے پی ایچ۔ ڈی ھیں ۔

---

۲ - ۱۹۱۱ء میں 'زمانہ' کانپور کا علمی ضمیمہ شائع ھوا تھا جس میں مشاھیر ادب سے ان کی زندگی اور علمی کارناموں سے متعلق چند سوالات کیے گئے تھے ۔ اسی ضمن میں ایک سوال یہ بھی تھا : ''کن کن کتابوں کے مطالعہ نے آپ کو سب سے زیادہ فائدہ پہنچایا اور محظوظ کیا ؟'' علامہ شبلی اس سوال کے جواب میں لکھتے ھیں : ''اردو میں حیات سعدی ، آبِ حیات ، بعض تصانیف سر سید ، توبۃ النصوح ، دیوانِ غالب ، دیوانِ میر کو میں دل سے پسند کرتا ھوں ۔'' (ص : ٦٨ ۔ علمی ضمیمہ رسالہ "زمانہ" بابت جنوری ۱۹۱۱ء) ۔

چونکہ ہمارے یہاں ناول کے فن اور ناول کی تنقید کا ماخذ انگریزی ادب ہے اس لیے ظاہر ہے کہ توبۃ النصوح کے بارے میں ایسے فن شناسوں کی رائے یقیناً وقیع سمجھی جائے گی ۔

ڈاکٹر تاثیر مرحوم ، اپنے ایک مقالے میں نذیر احمد کی ابتدائی تصانیف ، مرآۃ العروس اور بنات النعش کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

> ''ان کتابوں کو لکھ کر مولوی صاحب افسانے کے انداز کو خوب سمجھنے لگے اور توبۃ النصوح میں انہوں نے جیتی جاگتی گفتگو ہی نہیں ، جیتے جاگتے کردار بنا ڈالے ۔ یہ کتاب اردو کا پہلا ناول ہے اور شاید اس سے بہتر ناول اردو میں نہیں لکھا گیا ۔'' (نثر تاثیر ، ص ۱۱۰ ۔ مطبوعہ اردو اکادمی ، بہاول پور)

ڈاکٹر احسن فاروقی صاحب ، بہ زعم خود ، ناول نگاری کے فن اور فنی شعور میں یگانہ ہیں ۔ وہ اردو ناول کے ایسے سخت گیر مبصر ہیں کہ ان کے نزدیک ''اردو میں اب تک ناول وجود ہی میں نہیں آئی'' (ادبی تخلیق اور ناول ۔ ص : ۱۹۶) اور ''اردو میں ناول کا فن ابھی تک اپنے ابتدائی مدارج ہی طے کر رہا ہے ۔'' (ایضاً ۔ ص : ۹۱) توبۃ النصوح کا اعجاز دیکھیے کہ وہ بھی یہ کہنے پر مجبور ہو گئے :

> ''ـــــ باوجود ان تمام خامیوں کے ان کی فطری قصہ گوئی داد کے قابل ہے ۔ ایک تو اس وجہ سے کہ وہ اردو کے سب سے پہلے واقعاتی قصہ گو ہیں ، مگر خاص طور پر اس وجہ سے کہ ان کے

قصوں کی دل چسپی اپنی جگہ پر مسلم ہے۔
مسائل پر بحثوں اور وعظوں سے قطع نظر کرلیجیے
تو اُن کے قصوں میں ایسا دل چسپ تسلسل ملتا
ہے کہ انھیں ختم کیے بغیر چھوڑا ہی نہیں جاتا۔
یہ بات توبۃ النصوح میں سب سے زیادہ ہے۔ تمام
واقعات اس طرح پر ایک دوسرے سے منسلک
ہیں اور بذات خود اس مزے کے ہیں کہ کتاب
کے سوا تین سو صفحے نہایت جلدی سے کٹ
جاتے ہیں اور کتاب کو ختم کرنے سے پیشتر
چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا۔ معلوم ہوتا ہے
کہ مولانا جب اس کتاب کو تصنیف کر رہے
تھے تو قصہ گوئی کے فرشتے نے اُن کے قلم کو
اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا اور اس طرح یہ کتاب
ایک آسانی اور دائمی چیز ہو کر وجود میں آئی۔
(اُردو ناول کی تنقیدی تاریخ۔ ص : ۵۳ - ۵۲)

ڈاکٹر تاثیر مرحوم کا یہ دعویٰ کہ توبۃ النصوح سے بہتر ناول اُردو میں نہیں لکھا گیا ، اگر ربع صدی پہلے نہیں تو آج ضرور محل نظر ہے۔ اسی طرح ڈاکٹر فاروق کا یہ قول بھی ، کہ توبۃ النصوح کی تصنیف کے وقت ''قصہ گوئی کے فرشتے نے مصنف کے قلم کو اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا اور اس طرح یہ کتاب ایک آسانی اور دائمی چیز ہو کر وجود میں آئی'' میرے نزدیک کوئی ناقدانہ رائے نہیں بلکہ شاعرانہ مبالغہ ہے۔ لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اگر اس ناول میں فن کے بنیادی عناصر موجود نہ ہوتے تو دور حاضر کے یہ نامور فن کار و نقاد اس کی تعریف میں

زطب اللسان نظر نہ آئے۔

★

نذیر احمد کی 'فطری قصہ گوئی' اور اُن کے 'قصوں کی دل چسپی' ممکن ہے قابل داد ہو، لیکن کیا محض دل چسپی کسی ناول کی فنی عظمت و شہرت کی ضامن ہو سکتی ہے؟ کیا پرانی کہانیاں اور داستانیں، جدید افسانوں اور ناولوں کے مقابلے میں اور 'سنسنی خیز' جاسوسی و رومانی ناول، معیاری ناولوں کے مقابلے میں کچھ کم دل چسپ ہوتے ہیں؟ فسانوی ادب کی ان تمام قدیم و جدید اصناف میں دل چسپی تو قدر مشترک کی حیثیت رکھتی ہے۔ ڈاکٹر فاروقی صاحب جو توبۃ النصوح کی تعریف میں، قصے کی دل چسپی اور مزے دار واقعات پر زور دے رہے ہیں، تو در اصل ایک خاص مصلحت کی بنا پر (جس کا ذکر آخر میں آئے گا) وہ 'دست وتیغ غازی' سے چشم پوشی کر کے محض اسپ و برگستواں کی زیب و زینت کو سراہنے پر مجبور ہیں۔ لیکن چوں کہ ہمیں ایسی کوئی مصلحت یا مجبوری درپیش نہیں، اس لیے آئیے ہم غور کریں کہ اس ناول کی فنی قدر و قیمت کا انحصار کن باتوں پر ہے۔ اس ضمن میں سب سے پہلے ہمیں یہ طے کرنا پڑے گا کہ صنف ناول کی بنیادی شرائط میں سے کس چیز کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے؟ وہ کیا خصوصیت ہے جسے ہم قدیم داستانوں اور جدید ناولوں کے درمیان حد فاصل قرار دے سکتے ہیں؟ اگر آپ اس سوال پر غور کریں گے. تو بالآخر اسی نتیجے پر پہنچیں گے کہ وہ چیز جو ناول کو داستان سے امتیاز بخشتی ہے، روز مرہ کی واقعاتی زندگی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ داستانوں کے خواب ناک ماحول میں

بھی زندگی کی پرچھائیاں کہیں کہیں رینگتی نظر آتی ہیں لیکن ناول کے پردۂ سیمیں پر زندگی کا جو بھرپور عکس ، جو روشن ، مربوط اور متحرک فلم دکھائی جاتی ہے ، اس کے سامنے ان دھندلی پرچھائیوں کی کیا حقیقت ہے ۔

کہا جاتا ہے کہ ناول میں پلاٹ کی حیثیت ریڑھ کی ھڈی کی سی ہے ۔ اگر اس تشبیہ کو وسعت دی جائے تو یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ زندگی ، ناول کا دل ہے اور زندگی کے بارے میں مصنف کا نقطۂ نظر ، ناول کا دماغ ۔ ریڑھ کی ھڈی ، انسان کی بدنی ساخت میں بنیادی حیثیت رکھتی ہے لیکن انسان کے مرتبے ، اس کی انفرادیت اور شخصی عظمت کا انحصار ، اُس کے دل اور دماغ کی کیفیات پر ہے ۔ اسی طرح پلاٹ خواہ کتنا ہی دل چسپ اور اُس کی تعمیر کیسی ہی فن کارانہ ہو لیکن اگر ناول میں زندگی کی ترجمانی ، تفسیر اور تنقید کے عناصر نہ ہوں تو اُسے ادب میں کوئی بلند مقام حاصل نہیں ہو سکتا ۔

جب یہ بات واضح ہو گئی کہ ناول کی قدر و قیمت کا معیار زندگی ہے ، تو اب ہمیں یہ دیکھنا چاہیے کہ زندگی کے گوناگوں مظاہر اور اُس کے منتشر اجزا و عناصر ناول کی لڑی میں کس طرح پروئے جاتے ہیں ۔ ناول نگار کے پیش نظر اس بکھری ہوئی ، لامتناہی زندگی کا کوئی ایک پہلو ، یعنی زمین کے کسی محدود خطے اور کسی مخصوص زمانے سے وابستہ کوئی انسانی طبقہ یا معاشرہ ہوتا ہے جو اپنے عصری حالات کے تحت کشمکش حیات سے دو چار ہو ۔ ناول نگار کی نگاہیں اس معاشرے کے پس منظر و پیش منظر ،

اُس کے ماضی و حال ، اس کی روایات و رجحانات کا ہر پہلو سے جائزہ لیتی ہیں ۔ یہی مشاہدہ اس کے فن کی بنیاد ، اور اس کی پہنائی اور گہرائی ، کمال فن کا پیمانہ ہے ۔ معاشرے کے روشن و تاریک پہلوؤں کے ایک واضح تصور کے ساتھ وہ کچھ ایسے کردار تخلیق کرتا ہے جو اس معاشرتی ماحول کے پروردہ ، جیتے جاگتے ، حقیقی انسان معلوم ہوں اور اپنی انفرادی خصوصیات کے باوجود اُس طبقے یا معاشرے کے بعض اجتماعی رجحانات کی نمائندگی کرتے ہوں ۔ یعنی کرداروں کی یہ خیالی تصویریں معاشرتی پس منظر کے اس فریم میں بالکل فٹ آ جائیں ۔ انھی افراد کے واقعات و حادثات زندگی کے تانے بانے سے ناول کا پلاٹ تیار ہوتا ہے ۔ انھی کے عمل و رد عمل کے آئینے میں اس سماج کے رنگ روپ کی جھلکیاں دکھائی جاتی ہیں ۔

اس اعتبار سے ظاہر ہے کہ ناول میں سماجی پس منظر کو اولیت حاصل ہے ۔ افراد کی زندگی اسی معاشرتی کل کا جزو ہوتی ہے ۔ لہٰذا توبۃ النصوح کا فنی مقام متعین کرنے کے لیے یہ سہ گانہ معیار ہمیں اپنے سامنے رکھنا ہوگا : (الف) زندگی کا خارجی پہلو یعنی سماجی پس منظر (ب) زندگی کا داخلی پہلو یعنی کردار نگاری (ج) مصنف کا زاویۂ نظر ۔ کسی ناول یا ناول نگار کی عظمت کا انحصار بس انھی تین باتوں پر ہے ۔ آرنلڈ بینٹ نے سچ کہا ہے : ”تین چیزیں ناول نگار کے فن کو پرکھنے کے لیے کافی ہیں ـــــ اس کا دائرۂ عمل ، تنقید حیات اور افراد قصہ سے اس کا برتاؤ ۔“

(۲)

فیلڈنگ نے اپنے ناولوں کو سماجی تاریخ کہا ہے ۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر اچھا ناول کسی نہ کسی حد تک ایک سماجی تاریخ ہوتا ہے ۔ دنیائے ادب میں جو ناول آفاق شہرت کے حامل ہیں ، اُن میں سب سے بڑی خصوصیت یہ پائی جاتی ہے کہ وہ اپنے معاشرے اور زمانے کی روح کے آئینہ دار ہیں ۔ نذیر احمد کے ناولوں مین بھی یہ خصوصیت نمایاں ہے اور اس کا اعتراف تقریباً ہر نقاد نے کیا ہے ۔ قدیم قصوں کی طلسماتی اور تخئیلی فضا کے فوراً بعد ہم نذیر احمد کے ناولوں کی ارضیت اور واقعیت دیکھ کر چونک سے پڑتے ہیں ۔ اس سے زیادہ حیرت ہمیں اس بات پر ہوتی ہے کہ بعد کے ناولوں میں دور دور تک زندگی کے ایسے جیتے جاگتے مرقعے نظر نہیں آتے ۔ نذیر احمد کے بعد سرشار نے اپنے ناولوں میں لکھنؤ کے معاشرے کی عکاسی کی ، لیکن اُن کے تخیل نے حقیقی زندگی کے خاکوں میں ایسے گہرے اور شوخ رنگ بھر دیے ہیں کہ اُن کی تصویریں ، دبستان لکھنؤ کی شاعری کی طرح نہایت پرتصنع معلوم ہوتی ہیں ۔ نذیر احمد اور سرشار کے بعد اُردو ناولوں میں ایک مدت تک تاریخی رومانیت کا دور دورہ رہا ۔ اگرچہ اُردو ناول کے حق میں یہ ایک فال نیک تھا کہ اس کی بنیاد نذیر احمد جیسے حقیقت نگار کے ہاتھوں پڑی ، جس نے ابتدا ہی میں ناول کو زندگی کی شاہراہ پر ڈال دیا، لیکن افسوس ہے کہ بقول پروفیسر اختر اورینوی ”نذیر احمد کے دکھائے ہوئے راستے پر بعد میں آنے والے ناول نویس سلیقے سے نہ چل سکے ۔“

(تحقیق و تنقید ۔ ص : ۱۳۶)

نذیر احمد نے اپنے ناولوں میں دہلی کے مسلمان شرفا اور متوسط گھرانوں کی زندگی پیش کی ہے ۔ لیکن اُن کا مطالعہ نہایت وسیع تھا ۔ اس معاشرے کا کوئی پہلو ایسا نہیں جس کی تمام جزئیات پر اُن کی گہری نظر نہ ہو ۔ اُن کی ناول نگاری کے سلسلے میں ایک اہم نکتہ یہ ہے کہ اُن کے قصوں کا بیشتر مواد اُن کے ذاتی مشاہدات سے ماخوذ ہے ۔ واقعات ہوں یا کردار ، کم و بیش سب کا تعلق اُن کے مشاہدات و تجربات کی دنیا سے ہے ۔ تخیل کا عمل دخل اُن کے قصوں میں صرف اتنا ہے کہ وہ تحت الشعور اور لا شعور کے کونے کھدروں سے تجربات کے موتی چن چن کر قصے کی لڑی میں پروتا چلا جاتا ہے ۔ کلیم ہو یا ظاہر دار بیگ ، مبتلا ہو یا ابن الوقت ، سب سے مصنف کی پرانی جان پہچان رہی ہے ۔ غدر کے ہنگامے ، وبا کی ہلاکت آفرینی ، گھریلو زندگی میں سگھڑاپے اور پھوہڑ پن کے نمونے ، نوجوانوں کے دل چسپ مشاغل ، دیوان خانوں کی چہل پہل ، مشاعروں کی محفلیں ، سب ان کی آنکھوں دیکھی باتیں ہیں ۔ اُن کے ناولوں میں بہت سے واقعات ایسے بھی ہیں جو بجنسہ یا بادنٰی تغیر اُن کی داستان حیات کے ٹکڑے ہیں ۔

نذیر احمد کی حقیقت نگاری کا ایک خاص سبب اُن کی مقصدیت ہے ۔ اگر وہ محض تفریح طبع کی غرض سے کہانی لکھتے تو یقیناً وہ حسن و عشق کا دل پسند موضوع اختیار کرتے اور چوں کہ ایک صدی پہلے مسلمان شرفاء کے معاشرے میں اس قسم کے واقعات عام نہ تھے ، لہذا وہ اپنے تخیل کی مدد سے ایک حسین و رنگین دنیا بناتے ، ہجر و وصل کی

لذیذ حکایت سناتے یا پھر کسی قحبہ خانے کی سیر کراتے ۔ لیکن نذیر احمد تو یہ چاہتے تھے کہ جو لوگ اس افیونی ادب کی چسکیوں میں مست پڑے ہیں وہ آنکھیں کھول کر اپنے گرد و پیش دیکھیں اور ان میں زندگی کا شعور پیدا ہو ۔ اس لیے انھوں نے عام زندگی کے واقعات اور مسائل پر اپنی توجہ رکھی ۔ بعض من چلوں کا خیال ہے کہ عشق و رومان کی کمی سے نذیر احمد کے ناولوں میں زندگی کی تصویریں ادھوری بھی ہیں اور بے رنگ بھی ۔ یہ ایک طفلانہ رائے ہے ۔ مصور کا کمال شوخ رنگوں کے استعمال اور حسین چہروں کے خد و خال پر منحصر نہیں ۔ بالغ نظر قارئین ان کے ناولوں میں رومان کی کمی سے کوئی اکتاہٹ محسوس نہیں کرتے ۔ نذیر احمد کی زندہ دلی اور حسن بیان قابل داد ہے جس کی بدولت مجرد و معریٰ واقعیت میں رومان سے زیادہ دل چسپی پیدا ہو گئی ہے ۔

دوسرا اعتراض یہ ہے کہ مقصدیت کی وجہ سے ان کے ناولوں کا دائرہ تنگ ہے ۔ ڈاکٹر قمر رئیس نے اپنی تصنیف 'پریم چند کا تنقیدی مطالعہ' میں جگہ جگہ اس خیال کو دھرایا ہے ۔ نذیر احمد کی ناول نگاری پر تبصرہ کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں : ''جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے نذیر احمد نے یہ ناول چند اصلاحی مقاصد کو پیش نظر رکھ کر لکھے تھے ۔ ان کے مقاصد محدود تھے اس لیے اس زندگی کا دائرہ بھی محدود ہے جسے انھوں نے اپنے ناولوں میں پیش کیا ہے ۔ یہ زندگی چہار دیواری کی زندگی ہے ۔'' (ص : ۱۲۱) پھر دوسری جگہ فرماتے ہیں : ''نذیر احمد کے کردار جس زندگی کی

نمائندگی کرتے ہیں یہ اس عہد کی واقعیت کو پوری طرح گرفت میں نہیں لاتی ۔ ان ناولوں کا مقصد مسلمانوں کی معاشرتی ، اخلاق اور مذہبی اصلاح تھا ۔ اس لیے اُن کا دائرۂ عمل اور نذیر احمد کا حلقۂ فکر مسلمانوں کی گھریلو زندگی تک محدود ہے ۔'' (ص : ۵۰۳) ڈاکٹر احسن فاروقی اور سید علی عباس حسینی نے بھی سرشار کے مقابلے میں نذیر احمد کے فن پر کچھ اسی قسم کا اعتراض کیا ہے ۔ حقیقت یہ ہے کہ اس بے کراں زندگی کے کسی محدود سے محدود پہلو کو بھی ناول کے دامن میں پورے طور پر سمیٹا نہیں جا سکتا۔ لہٰذا ترک و انتخاب کے سوا ناول نگار کے لیے اور کوئی چارہ نہیں رہتا ۔ لیکن بعض حضرات نذیر احمد کی 'مولویت' کو مطعون کرنے کے لیے سرشار کو اُن کے مقابلے میں لے آتے ہیں اور گونا گوں واقعات و بوقلموں مخلوقات کے اس جنگل کو جس کا نام 'فسانۂ آزاد' ہے ، نذیر احمد کے ناولوں پر ترجیح دیتے ہیں ۔ اگر نذیر احمد کے کردار قدیم داستانی انداز میں 'جہانیاں جہاں گشت' بن کر روم و روس کے ہفت خواں طے کرتے نظر نہیں آتے تو اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ سرشار کے مقابلے میں نذیر احمد بہتر فن کار تھے اور انھیں کسی ہفت روزہ اخبار کے کالم بھرنے کے لیے اپنے قلم کو فن کی حدود و قیود سے آزاد چھوڑ دینے کی ضرورت نہیں پڑی ۔

یہ درست ہے کہ نذیر احمد کے ناولوں کا موضوع مسلمانوں کی گھریلو زندگی ہے ۔ لیکن اگر 'گھریلو زندگی' سے چہار دیواری تک محدود زندگی مراد لی جائے (غالباً معترضین کا مطلب یہی ہے) اور یہ سمجھا جائے کہ نذیر احمد نے

صرف چولہے ہانڈی کی باتیں اور خانہ داری کے مسائل بیان کیے ہیں، تو یہ رائے اُن کے کسی ناول پر منطبق نہیں ہوتی ۔ اُن کے ناولوں کا دائرہ گھر کی چہار دیواری سے لے کر شہری زندگی کے گوشے گوشے تک پھیلا ہوا ہے، جہاں مکتب و مدرسہ، مسجد و بازار، عدالت و کچہری، اُمراء کے دیوان خانے اور غریبوں کی جھونپڑیاں، سبھی مقامات اور سبھی طرح کے لوگ نظر آتے ہیں ۔ اس زمانے میں مسلمانوں کی یہ حالت تھی گویا آوے کا آوا بگڑا ہوا تھا ۔ چناں چہ اصلاح کی غرض سے انھوں نے ثقافتی اور سماجی زندگی کے تمام پہلوؤں کا جائزہ لیا ہے ۔ لہٰذا یہ اعتراض بے جا ہے کہ مقصدیت کی وجہ سے اُن کے ناولوں میں زندگی کا دائرہ تنگ ہو گیا ہے ۔

★

دور کیوں جائیے، توبۃ النصوح آپ کے سامنے موجود ہے ۔ اس ناول کا مرکزی نقطہ تربیت اولاد ہے ۔ لیکن آپ دیکھیے کہ اس نقطے کے گرد جو محدود دائرہ کھینچا گیا ہے اس میں معاشرتی زندگی کے کتنے پہلو سمٹ آئے ہیں ۔ مثلاً ابتدائی فصل کو لیجیے ۔ اس کا موضوع نصوح کے ایک خواب کا بیان ہے ۔ لیکن اس خواب کے ساتھ کتنی نفسیاتی حقیقتیں اور بیان آخرت کے ساتھ دنیاوی زندگی کے کتنے جھگڑے بکھیڑے موجود ہیں ۔ قصے کا آغاز وبا کے ذکر سے ہوتا ہے ۔ شہر کی ویرانی، بازاروں کے سناٹے کی ہول ناک تصویر جہاں دکھائی گئی ہے، وہاں لوگوں کی نفسا نفسی کا عالم بھی ملاحظہ ہو ۔ موت کا خوف کس طرح دلوں کو علائق دنیاوی سے کاٹ کر

خدا پرستی اور صلح کاری کے نور سے معمور کر دیتا ہے۔ نصوح صابر و شاکر ہے۔ اپنے آپ کو دنیا سے بے تعلق سمجھتا ہے، گویا عام لوگوں سے زیادہ جاں سپاری کا حوصلہ رکھتا ہے۔ لیکن جب جان پر آ بنتی ہے تو پتا چلتا ہے کہ اس کے وجود کا بال بال دنیا کے جنجال میں جکڑا ہوا ہے۔ اولاد میں دو کنواری بیٹیوں کی فکر سب سے زیادہ ہے۔ اس زمانے میں بھی لڑکیوں کی شادی کا مسئلہ آج کل کی طرح بڑا کٹھن ہوگا۔ وبا کے انسداد کے لیے جو تدبیریں کی گئیں ان کی تفصیل ذرا طویل ہے، لیکن جن علاقوں میں عموماً ہیضے کی وبا پھیلتی ہے وہاں کے خوش حال گھرانوں میں بھی کچھ اہتمام کیا جاتا ہے۔ دیسی دواؤں کے ساتھ آپ کو کئی انگریزی دواؤں کے نام بھی ملیں گے۔ انگریزی حکومت کے زیر سایہ طب مغرب کو کتنی تیزی سے فروغ حاصل ہو رہا تھا۔ علاج کے لیے پہلے حکیم صاحب ہی بلائے جاتے ہیں، لیکن یہ وہمی قسم کے آدمی، خود ہیضے کے نام سے کوسوں بھاگتے تھے۔ پرانے تعلقات کا خیال کر کے چلے آئے اور 'کھڑے کھڑے چھدا سا اتار کر چلے گئے'۔ جب حکیموں کے یہ لچھن ہوں تو ڈاکٹروں کی طرف رجوع خلق کیوں نہ ہو۔ عوام کی توہم پرستی دیکھیے سمجھتے ہیں کہ وبا کسی بڑے رئیس کی بھینٹ لیے بغیر نہ جائے گی۔ نواب عمدۃ الملک کا ہیضے میں انتقال ہوا تو لوگ کہنے لگے کہ بس اب خدا نے ٹھنڈک ڈالی۔

اس فصل کی جان نصوح کا خواب ہے، جسے نذیر احمد کے زور قلم کا شاہ کار مانا جاتا ہے۔ اس خواب میں سب سے

پہلے آپ کو ایک عدالت کا ذکر ملے گا ۔ اس آسمانی عدالت کا نقشہ دنیاوی عدالتوں کے تصور ہی سے ابھرا ہے اور اس میں عدل حقیقی کے بیان کے ساتھ انگریزی عہد کے نئے عدالتی نظام کا پول بھی کھولا گیا ہے ۔ مصنف خود اس نظام سے وابستہ رہ چکا ہے ۔ تعزیرات ہند کا مترجم ہونے کی وجہ سے عدالتی اصطلاحیں اور قانون کی دفعات اسے ازبر ہیں ۔ وہ پولیس کے ہتھکنڈوں ، دیوانی و فوجداری کے عملے کی کارستانیوں اور مقدمہ بازوں کی دھاندلیوں سے اچھی طرح واقف ہے اور اپنے ناولوں میں جہاں کہیں موقع ملتا ہے وہ اس پورے نظام کا کچا چٹھا کھول کر رکھ دیتا ہے ۔ توبۃ النصوح کی دیگر فصلوں میں بھی تھانہ ، پولیس اور عدالت ، کچہری کا ذکر آیا ہے لیکن گیارھویں فصل میں بڑی وضاحت سے یہ دکھایا گیا ہے کہ کس طرح عدالتوں میں دروغ کو فروغ حاصل ہوتا ہے اور مقدموں کے فیصلے، فطرت جیسے عیاروں کے حق میں ہوا کرتے ہیں ۔ ہم ابھی صرف پہلی فصل کا جائزہ لے رہے ہیں ۔ نصوح کے اسی خواب میں مسلمانوں کے مذہبی عقائد و اعمال کا جائزہ لیا گیا ہے ۔ ہمارے معاشرے میں مذہبی رویے کے اعتبار سے مختلف طبقے پائے جاتے ہیں ۔ توبۃ النصوح میں ان سب طبقوں کے نمائندے موجود ہیں ۔ ابتدائی فصل میں نسبتاً زیادہ دیندار طبقے کی مذہبی حالت کو تبصرے کا موضوع بنایا گیا ہے ۔ نصوح کا باپ صوم و صلواۃ کا پابند تھا لیکن اخلاص کی کسوٹی پر اس کے تمام اعمال کھوٹے سکے کی طرح بے قدر و قیمت ثابت ہوئے ۔ حتیٰ کہ ایمان میں بھی کھوٹ نکلا ۔ چوں کہ یہ تبصرہ، ناول کے کسی کردار یا براہ راست مصنف

کے بجائے اس ذات سے منسوب ہے جو دلوں کے بھیدوں کو جاننے والا اور ظاہری اعمال کے ساتھ نیتوں کو پرکھنے والا ہے اس لیے نہایت ہمہ گیر اور عبرت ناک ہے ۔ اقبال کے 'جواب شکوہ' کا یہ مؤثر اسلوب ہمیں نثر میں اور کہیں نہ ملے گا ۔

آگے چل کر عام مسلمانوں کی دینی حالت کا نقشہ کھینچا گیا ہے ۔ دین دار طبقے میں اخلاص و تقویٰ کا فقدان سہی ، کم از کم شعائر دینی کا ظاہری اہتمام تو ہے ۔ لیکن عام دنیا دار مسلمانوں کو چند رسوم کے سوا مذہب سے کوئی سروکار نہیں ۔ پنج وقتی نماز کے لیے تو زندگی کی مصروفیات میں کوئی وقت ہی نہیں ملتا ۔ "اگر کپڑے خوب صاف ہوئے اور دھوپ بھی ایسی سخت نہ ہوئی ، دن ابر و باد سے پاک ہوا ، دوست آشناؤں سے ملنے کو جی چاہا" تو کبھی کبھی جمعہ کی نماز پڑھ لی ۔ ہاں عیدین کا اہتمام ضروری ٹھہرا ، کیوں کہ بھڑکیلے کپڑوں اور ساز و سامان کی نمائش کا یہ اچھا موقع ہوتا ہے ۔ روزے اور زکواۃ سے بچنے کے لیے کوئی حیلۂ شرعی ڈھونڈھ نکالنا ایسی مشکل بات نہیں ۔ غرض مذہب ایک ڈھکوسلا بن کر رہ گیا ہے ۔ چوں کہ اسلامی معاشرے کی تہذیبی اور اخلاقی قدروں کا مذہب سے بڑا گہرا رشتہ ہے بلکہ یوں کہیے کہ زندگی کی تمام اعلیٰ قدریں مذہب کی بنیاد پر قائم ہیں ، لہذا جب یہ بنیاد ہی متزلزل ہو جائے تو معاشرتی نظام کا خارجی ڈھانچہ کیسے سلامت رہ سکتا ہے ۔ چناں چہ ہم دیکھتے ہیں کہ زندگی کے ہر شعبے میں تکلف ، تصنع ، ظاہر داری اور

مکر و فریب عام ہے ۔ جو امیر ہیں وہ تو شیخی اور نمود و نمائش کے ہاتھوں تباہ ہو ہی رہے ہیں لیکن جن کے گھروں میں چوہے لوٹتے ہیں وہ بھی مرزا ظاہر دار بیگ کی طرح چھیلا بنے پھرتے ہیں ۔ اخلاق زوال کا یہ عالم ہے کہ لوگ ذاتی مفاد کے لیے غیر تو غیر ، اپنوں کا گلا کاٹنے پر تلے رہتے ہیں ۔ برادری کے جھگڑے کئی کئی پشت تک چلتے ہیں ۔ مقدمے بازیاں ہوتی ہیں، جن میں عموماً فطرت جیسے عیاروں کا داؤ چل جاتا ہے اور وہ بھائی بندوں کی جائیدادیں ہڑپ کر کے بیٹھ جاتے ہیں ۔

زمانہ بدل گیا ہے ۔ مسلمانوں کی حکومت و اقتدار کی بساط اُلٹ چکی ہے ۔ چند 'لنگڑے' نواب اور لٹے پٹے رئیس باقی رہ گئے ہیں ، جن کی جاگیریں بھی اب ہندو ساہوکاروں کے ہتھے چڑھ رہی ہیں ۔ لیکن بد بختی سے جاگیر داری دور کی تمام معاشرتی لعنتیں اب تک قوم پر مسلط ہیں ۔ وہی شاہ خرچیاں ہیں ، وہی خرمستیاں ہیں ۔ شریف زادوں کے روز و شب ، کیسے کیسے مشاغل ، کن کن 'بازیوں' میں صرف ہوتے ہیں ، ذرا میاں کلیم کی زبانی اس کی تفصیل سنیے:

> "دنیا میں جیسے اور شریف معزز خاندانوں کے بیٹے ہیں ، اگر میں سب میں اچھا نہیں تو کسی سے برا بھی نہیں ۔ مشاعرے میں میری غزل ، ساتھ کے مشق کرنے والوں میں سب سے بڑی چڑھی ہوتی ہے ۔ شطرنج ، مرزا شاہ رخ تو خیر پرانے کھیلنے والوں میں ہیں اور اچھی شطرنج کھیلتے ہیں ، مگر دوسرا کوئی مجھ کو مات

کردے تو البتہ میں اس کی ٹانگ تلے سے نکل جاؤں۔
ہمارے محلے میں میاں وزیر بادشاہی پیادوں کے جمعدار، بڑے شاطروں میں مشہور ہیں۔ میں فرزیں اٹھا کر ان کے ساتھ کھیلتا ہوں۔ گنجفہ، اگرچہ میں کم کھیلتا ہوں لیکن بیٹھ جاؤں تو ایسا بھی نہیں کہ کوئی صفو پر نادری چڑھائے اور قریب قریب یہی حال تاش اور چوسر کا ہے۔ کبوتر، جیسے آج ہماری چھتری کے دم دار ہیں، شہر میں شاید ہی دو چار جگہ اور ہوں گے۔ پتنگ میں ایسا اڑاتا ہوں کہ ایک دھیلچیے سے دو ٹھڈے کی تکل ایک نہیں سینکڑوں کاٹی ہوں گی۔ لکھنے سے میں عاری نہیں۔ پڑھنے سے میں عاجز نہیں۔ میں نہیں جانتا کہ امیروں اور امیر زادوں کا وہ کون سا ہنر ہے جو مجھ کو نہیں آتا...»

یہ تمام مشاغل جو انیسویں صدی کے نصف اول کی پر امن و با فراغت زندگی میں قلعے کے 'سلاطینوں' اور شہر کے شریف زادوں کے معمولات میں داخل تھے، انقلاب ۵۷ء کے بعد بھی، بہ قول میاں کلیم، امیروں اور امیر زادوں کے ہنر سمجھے جاتے ہیں۔ دہلی کا سہاگ لٹ چکا ہے لیکن 'بادۂ شبانہ کی سرمستیاں' ابھی تک باقی ہیں۔ کلیم جیسے بے فکر، رنگیں مزاج نوجوانوں کے 'خلوت خانے' اور 'عشرت منزل' کا نقشہ ہو بہ ہو وہی ہے جو قبل انقلاب، امراء کے دیوان خانوں کا تھا۔ سارا دن، کبوتر بازی،

بٹیر بازی یا گنجفہ اور شطرنج کی بازیوں میں گزرتا ہے اور رات کے وقت ناچ گانے یا مشاعرے کی محفلیں جمتی ہیں۔ ان تمام بازیوں میں سب سے زیادہ مہلک بلکہ اُم الخبائث ، 'مشاعرہ بازی' ہے۔ یہ وبا اس قدر عام ہو چکی ہے کہ ہر موزوں طبع نوجوان ، مشاعرہ باز ہو کر دین و دنیا سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔ اپنی زندگی بھی برباد کرتا ہے اور شاعری کی بھی مٹی پلید کرتا ہے۔ یہ شاعری بالعموم ادنیٰ درجے کی تک بندی یا زیادہ سے زیادہ تعیش زدہ طبقے کی تفریح طبع کا ذریعہ ہے۔ اسی کی بدولت ، رندی، ہوس ناکی ، وارستہ مزاجی اور ذہنی آوارگی کی قدیم روایت نئی نسلوں میں منتقل ہوئی اور اب اُن کے کردار کا ایک مستقل جزو بن گئی ہے۔ یہی نشہ ہے جس کی ترنگ میں وہ زمانے کے تقاضوں سے بے خبر اور قوم کی بربادی و تباہ حالی سے بے پروا ہیں۔

★

دھلی کے مسلم معاشرے کی یہ تصویر نہایت بھیانک ہے۔ لیکن آپ یہ نہ سمجھیے کہ مصنف کی نگاہ صرف تاریک پہلوؤں پر پڑتی ہے۔ اس گھٹا ٹوپ اندھیرے میں کہیں کہیں آپ کو سچی دین داری ، نیکی اور شرافت کے چراغ بھی فروزاں نظر آئیں گے۔ فصل چہارم میں نصوح کے چھوٹے بیٹے سلیم کی زبانی 'حضرت بی' کا بکھان سنئے۔ اُن کے گھر کا ماحول کیسا پاکیزہ ہے۔ انھوں نے کس شفقت و محبت سے سلیم کی تمام بری عادتیں چھڑا دیں۔ فصل ھشتم میں بھی حضرت بی کا ذکر خیر موجود ہے۔ صالحہ ، نعیمہ کو سمجھاتی

ہے کہ دنیا میں دین دار لوگوں کی کمی نہیں - اسی محلے میں حضرت بی رہتی ہیں جو غریب غربا کے کپڑے مفت سیتی ہیں - امیروں سے سلائی لیتی ہیں لیکن جو کچھ ملتا ہے سب اللہ کی راہ میں خرچ کر دیتی ہیں - گھر کا سارا کام کاج اپنے ہاتھوں کرتی ہیں - ''اس پر نماز کی یہ پابندی کہ نماز تہجد تک قضا نہیں ہونے پاتی - محلے میں کتنی لڑکیوں کو انھوں نے پڑھنا سکھایا اور حسبۃً للّٰہ، بے غرض، بے مطلب .... مسجد کے کوئی پندرہ بیس مسافر دونوں وقت روٹی پکوانے، آٹا بھیج دیتے ہیں - اپنے ہاتھوں سے سب کا آٹا گوندھنا، پکانا، گھر سے دال سالن جو کچھ وقت پر موجود ہو دینا - اکثر ایسا ہوا ہے کہ سالن نہیں بچا - آپ روکھی روٹی ہی کھا کر اٹھ کھڑی ہوئیں ....''

اسی قسم کا دوسرا گھرانا، خود صالحہ کا گھرانا ہے - فصل پنجم میں فہمیدہ کی زبانی، قارئین اس گھرانے سے متعارف ہوتے ہیں - صرف یہی نہیں کہ فہمیدہ کی بہن کے یہاں روزہ نماز کا چرچا زیادہ ہے، بلکہ خوش انتظامی اور نیک نیتی کی برکت سے آن کا گھر حسن معاشرت کا ایک اچھا نمونہ ہے - صالحہ کی ماں، تنگ دستی کے باوجود غریبوں کی خدمت بھی کرتی ہیں - گویا صالحہ کے الفاظ میں 'وہ بھی اپنے محلے کی حضرت بی ہیں' - نصوح جیسے لوگ بھی اسی معاشرے میں موجود ہیں جو خود خواب غفلت سے بیدار ہو کر نیند کے ماتوں کو جگا رہے ہیں -

★

توبۃ النصوح میں نئے سیاسی حالات اور نئی تہذیب کے

آثار و شواھد بھی ، جا بجا مختلف صورتوں میں ملتے ھیں ۔ علاج کے سلسلے میں ایلو پیتھی دواؤں اور سرکاری ھسپتال کے ڈاکٹر کا ذکر آیا ھے ۔ تعلیم کے ضمن میں جہاں مدرسے اور مدرسے کے نصابات کا بیان ھے وھاں نئے طرز کے سرکاری سکول ھی مراد ھیں ۔ مثلاً فصل ششم میں نصوح علیم سے پوچھتا ھے : ''مدرسے میں تاریخ و جغرافیہ و ھندسہ و ریاضی کے سوائے کوئی دوسری چیز پڑھاتے نہیں ، تم نے دینی معلومات حاصل کی تو کہاں سے کی ؟'' ۔ اسی فصل میں ھم دیکھتے ھیں کہ عیسائیت کے مبلغ پادریوں نے کمپنی کے عہد کی جارحانہ روش کو خلاف مصلحت سمجھتے ھوئے ، خوش خلقی اور مسکینی اختیار کر لی ھے ۔ گیارھویں فصل میں جہاں والئ ریاست دولت آباد کے مسلوب الاختیار ھوجانے کا ذکر آیا ھے وھاں انگریزی حکومت کے ملک گیر سیاسی اثرات کی طرف اشارہ کیا گیا ھے ۔ عدالت ، کچہری ، تھانہ اور پولیس کے بیانات میں جدید نظم و نسق کی نشان دھی کی گئی ھے ۔ غرض اس ناول کے مطالعے سے ھمیں احساس ھوتا ھے کہ ھم انقلاب ۵۷ء کے بعد کی ایک نئی تمدنی و سیاسی فضا میں سانس لے رھے ھیں ۔

لیکن ان سطحی حالات کے علاوہ کچھ مخفی رجحانات بھی اس معاشرے کے بعض گوشوں میں کارفرما تھے ۔ یہ رجحانات ، جدید تعلیم اور مغربی تہذیب کے ثمر ھائے پیش رس تھے اور ایک طوفان تہ نشیں کی طرح شہر کے تعلیم یافتہ نوجوانوں کے دل و دماغ میں تموج اور تلاطم پیدا کر رھے تھے ۔ انھیں سمجھنے اور پرکھنے کے لیے بڑی

بصیرت اور ایک گہرے سماجی شعور کی ضرورت تھی ۔ ہمارے نقادوں کو نذیر احمد جیسے 'کٹھ ملا' سے اس قسم کے سماجی شعور کی توقع نہیں ۔ اَور تو اَور ڈاکٹر قمر رئیس جیسے محقق بھی یہ کہہ گزرتے ہیں : ''وہ اس نئی تہذیب، کلچر اور نظامِ فکر و عمل سے جو غدر کے بعد تیزی سے ابھر رہا تھا، یا تو بے خبر ہیں اور یا پھر گریزاں'' ۔ (پریم چند کا تنقیدی مطالعہ ۔ ص : ۱۲۰) لیکن حقیقت یہ ہے کہ اُس نئی تہذیب اور نظامِ فکر و عمل کے تمام خفی و جلی پہلوؤں پر نذیر احمد آج کل کے باخبر محققوں اور مورخوں کے مقابلے میں بڑی گہری نظر رکھتے تھے ۔ اور خبر و نظر کا فرق ظاہر ہے ۔ وہ اُن چند مسلمانوں میں سے تھے جو سر سید سے پہلے، جدید علوم کی اصل قدر و قیمت سے بہ خوبی آگاہ ہو چکے تھے ۔ انھوں نے شبلی و اکبر سے بہت پہلے، قوم کو مغربی تعلیم و تہذیب کے خطرات سے متنبہ کر دیا تھا ۔ وہ اس دور کے واحد مفکر تھے جنھوں نے عہدِ اقبال سے پہلے، بہت پہلے، ان تمام مسائل کے بارے میں ایک مثبت رویہ اور صحیح، ناقدانہ اندازِ نظر اختیار کیا ۔ ہاں یہ الزام اُن پر ضرور لگایا جا سکتا ہے کہ انھوں نے اِس لا دین تہذیب اور مغربی نظامِ فکر و عمل کی کورانہ تقلید کو قوم کے لیے ایک خطرہ کیوں سمجھا ؟ اس خطا پر آپ انھیں 'گریزاں' یا کچھ اور کہہ لیجیے لیکن 'بے خبر' تو نہ کہیے ۔

بات یہ ہے کہ شمالی ہند میں نئے علوم کی روشنی سب سے پہلے قدیم دہلی کالج کے وسیلے سے پھیلی ۔ نذیر احمد ۱۸۴۵ء سے ۱۸۵۴ء تک اس کالج میں زیرِ تعلیم رہے ۔ اگرچہ وہ انگریزی جماعت کے طالب علم نہ تھے لیکن ذریعۂ تعلیم اُردو ہونے کی

وجہ سے وہ سائینس اور دیگر مغربی علوم سے بہرہ اندوز ہو سکے ۔ یہی وہ زمانہ تھا جب کالج کی ٹرانسلیشن سوسائٹی کی مساعیٔ جمیلہ سے اردو میں مختلف جدید علوم کی کتابیں منتقل ہو رہی تھیں اور کالج کے مشہور استاد، پروفیسر رام چندر صاحب اپنے علمی رسائل، 'محبِ ہند' (۱۸۴۷ء تا ۱۸۵۱ء) 'فوائدالناظرین' (۱۸۴۸ء تا ۱۸۵۲ء) اور کالج کے نہایت بلند معیار ہفت روزہ اخبار، 'قِران السعدین' (۱۸۴۸ء تا ۱۸۵۴ء) کے ذریعے نئے خیالات اور نئے علوم کی ترویج و اشاعت میں سرگرم عمل تھے ۔ سی ۔ ایف۔اینڈریوز صاحب نے نذیر احمد کے ہم جماعت اور دوست، منشی ذکاءاللہ کے حوالے سے، نئے علوم میں طلبہ کے انہماک اور جدید تعلیم کے اثرات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے :

> ''قدیم دھلی کالج میں تعلیم کا نہایت ہر دل عزیز پہلو وہ تھا جس کا تعلق سائنس سے تھا . . . جب نوجوان طلبا اپنے گھروں کو لوٹا کرتے تھے تو اُن کے دماغوں اور اختراعی قوتوں پر حیرت انگیز خیالات چھائے رہتے تھے ۔ یہ امر زیادہ حیرت ناک نہیں کہ کہیں کہیں ان طلبا نے . . جو علم کی نئی شراب سے سرشار ہو رہے تھے پرانی بندشوں اور قیود و رسوم کو توڑ ڈالا ہو (تذکرہ مولوی ذکاءاللہ دھلوی ۔ص :۷۴-۷۵)

کیا یہ ممکن ہے کہ نذیر احمد جیسا ذہین طالب علم ان نئے افکار و خیالات سے متاثر نہ ہوا ہو، جن کی اشاعت اس زور شور سے ہو رہی تھی ۔ واقعہ یہ ہے کہ نئے خیالات کے اس ریلے میں اُن کے عقائد کی بنیادیں بھی ہل گئیں

اور وہ پھسل کر تشکیک کے دلدل میں جا پھنسے ۔ لیکن بعد میں جب انھیں مزید مطالعے کا موقع ملا اور ذہن و فکر میں پختگی پیدا ہوئی تو خدا خدا کر کے وہ اس دلدل سے صحیح سلامت نکل بھی آئے ۔ پھر چند سال تک محکمۂ تعلیم سے وابستہ رہنے کی وجہ سے جدید نظام تعلیم کی جملہ خرابیاں اُن پر منکشف ہوئیں ۔ الغرض وہ نئی نسل کی ذہنی و نفسیاتی کیفیات سے کماحقہ آگاہ تھے ۔ کیوں کہ اقبال کی طرح وہ بھی ع ۔ 'مدت ہوئی گزرے تھے اسی راہ گزر سے' ۔ وہ جانتے تھے کہ جدید تعلیم کے اثر سے نہ صرف قدیم علوم اور پرانے فلسفیانہ نظریات کا بھرم کھل گیا ہے بلکہ مذہبی حقائق بھی ، جن کی تفسیر و توثیق میں ان علوم اور نظریات سے کام لیا گیا تھا ، نوجوانوں کے طنز و تمسخر کا نشانہ بن رہے ہیں ۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ نئے دور کے آزاد خیال نوجوان ، ہر قید و بند سے آزاد ہو رہے ہیں اور معاشرتی آداب و رسوم کی بھی مطلق پروا نہیں کرتے۔

توبۃ النصوح میں کلیم ان تمام رجحانات کی نمائندگی کرتا ہے ۔ وہ مسجد کے نمازیوں کو 'مردہ شو ، فلاؤزی ، مسجد کا ٹکڑ گدا' کہتا ہے ۔ گھر میں اس کا چھوٹا بھائی ، سلیم نماز پڑھتا ہے تو وہ اور اس کے یار دوست اسے ہنسانے کی کوشش کرتے ہیں ، جانماز اُلٹ دیتے ہیں ، سجدے میں جاتا ہے تو اوپر چڑھ بیٹھتے ہیں ۔ وہ اپنے باپ کو خبطی سمجھتا ہے اور اُن کی دین داری کو خلل دماغ قرار دیتا ہے ۔ باپ کے بلانے پر ملنے سے انکار کر دیتا ہے اور ماں کے سمجھانے پر صاف کہہ دیتا ہے : ''میں نہیں چاہتا کہ کوئی میرے افعال سے تعرض کرے ۔ میں اپنا برا بھلا آپ سمجھتا

ھوں''۔ اُس کے نزدیک دس بارہ برس کی عمر کے بعد والدین کو
اولاد کے معاملات میں دخل دینے کا کوئی حق نہیں ھے۔

جس دور میں کسی قوم کے نوجوانوں پر اس قسم کی
مادر پدر آزادی کا بھوت سوار ھو جاتا ھے اور مذھب و اخلاق
کی تمام قدریں مطلق العنان آزادی کی رو میں پامال ھونے لگتی
ھیں ، تب ذھنی آوارگی ، تہذیب و معاشرت کے ھر دائرے
میں نت نئے روپ دھارا کرتی ھے۔ کبھی نوجوانوں کی
چال ڈھال اور وضع قطع میں نسائیت جلوہ نما ھوتی ھے ، کبھی
لباس کی تراش خراش میں ، چھچھوراپن اور بدمذاق وقت کا
فیشن بن جاتی ھے۔ آپ نے آج کل کے 'ٹیڈیز' تو بہت دیکھے
ھوں گے ، ذرا انیسویں صدی کے ایک 'ٹیڈی' کی سج دھج
ملاحظہ ھو :

''کالج میں اس قسم کے بیہودہ عیب تھے جن میں
آج کل کے کم بخت نوجوان شریف زادے کثرت
سے مبتلا پائے جاتے ھیں ، یعنی عورتوں کی
طرح درپۓ تزئین رھنا اور بناؤ سنگھار رکھنا ۔
پہر دن چڑھے سو کر اٹھے ۔ ضرورتوں سے فارغ
ھو کر آئینے کی تلاوت شروع ھوئی تو دوپہر
کر دیا . . . بارے اگر اصلاح کا دن نہ ھوا تو
گھنٹوں کی محنت میں وہ بھی اپنے اکیلے کی نہیں ،
بال ٹھکانے لگے اور مانگ درست ھوئی ۔ اور اگر
اصلاح کا روز منحوس ھوا تو سارا دن گزر گیا ،
ایک وضع خاص پر سر جھکائے جھکائے گردن
شل ھو گئی ، داڑھی اور مونچھوں کے ترشوانے

میں منہ کو لقوہ مار گیا ، حجام کی آنکھوں تلے
اندھیرا آنے لگا ، مگر پھر بھی ان کا خط خاطرخواہ
نہ بنا ۔ کپڑے بدلنے کی نوبت پہنچی ، ٹوپی قالب
سے اتر کر آئی تو سر پیٹ لیا ، مگر ایسی احتیاط
سے کہ بال نہ بگڑیں ۔ اس کے بعد انگرکھے کی
چنٹ پر چین بجبین ہوئے ۔ پھر تو ادھر انگرکھے
کی آستینوں اور ادھر پاجامہ کی تنگ مہریوں کے
ساتھ ہاتھا پائی شروع ہوئی ۔ مشکل یہ آ پڑی کہ
کپڑا ‎•‎ہین ، کشاکش کا متحمل نہیں ۔ ذرا زور
پڑا اور مسکا ۔ اور ہاتھ پاؤں کہتے ہیں کہ
ہم ان چیونٹی کے بلوں میں گھسنے کے نہیں ۔ ۔ ۔
بارے کاغذ کے سہارے سے ہولے ہولے پھسلاتے
پھسلاتے ، کہیں پہروں میں جا کر مشکل آسان
ہوئی ۔ اب ملبوس خاص زیب تن تو ہوا مگر
کس کیفیت سے کہ تنگی اور چستی کے مارے
مشکیں الگ کسی ہوئی ہیں ، پاؤں علیحدہ
جکڑے ہوئے ہیں ، اور سارا بدن گویا شکنجے
میں ہے ۔ کھانسنا ، چھینکنا ، جمائی ، انگڑائی تو
درکنار ، گھنڈی تکمے کے لحاظ ، بندوں کے
پاس خاطر سے اچھی طرح سانس بھی نہیں
لے سکتے ۔ ۔ ۔ "

غنیمت ہے کہ اس زمانے میں مخلوط تعلیم کا رواج نہ
تھا ورنہ لڑکیاں بھی لڑکوں کے دوش بدوش 'ٹیڈی کلچر'
کی بہاریں دکھایا کرتیں ۔ توبۃ النصوح کی نعیمہ اپنی

بد دماغی اور کج رائی کے باوجود اس وبا سے 'شرفا کی بہو بیٹیوں کی طرح ، کالدُرالمکنون ، محفوظ و مصئون تھی' -

★

فیض احمد فیض اپنے ایک مضمون "اُردو ناول" میں لکھتے ھیں : ''ایک خاص نوع کی واقعیت نگاری میں ھم نے ابھی تک نذیر احمد کا جواب پیدا نہیں کیا'' - (میزان - ص: ۲۰۶) بہ ظاھر فیض صاحب نے نذیر احمد کی بڑی تعریف کر دی ، لیکن اس تعریف کے ساتھ 'ایک خاص نوع' کی پخ لگی ھوئی ھے - آگے چل کر وہ اپنے خیال کی وضاحت کرتے ھیں کہ یہ واقعیت محدود قسم کی ھے - صحیح واقعیت عوامی یا جمہوری شعور کے بغیر پیدا نہیں ھو سکتی - اگر عوام یا جمہور سے مراد صرف دور انقلاب کے مزدور اور کسان ھیں تو بے شک نذیر احمد عوامی یا جمہوری شعور سے بہرہ ور نہ تھے - لیکن انھوں نے اپنے دیگر معاصرین کی طرح امیروں اور نوابوں کی عیاشیوں کی داستان نہیں لکھی ، بلکہ عام مسلمانوں کے مسائل اور اُن کی روز مرہ زندگی کی عکاسی کی ھے - جاگیر داری نظام کے زوال کے بعد جو طبقہ اس نئے سماج میں اھمیت حاصل کر رھا تھا وہ کہنے کو تو متوسط طبقہ تھا ، لیکن جہاں تک مسلم معاشرے کا تعلق ھے ، یہی صحیح معنی میں عوام یا جمہور کا طبقہ تھا - کیوں کہ معدودے چند تعلقہ داروں اور رئیسوں کے سوا ، اس عوامی طبقے میں شرفاء یعنی متوسط گھرانوں کے لوگ بھی شامل تھے اور وہ بھی جو نانِ شبینہ کے محتاج تھے یا محنت مزدوری کر کے گزر بسر کرتے تھے - نذیر احمد کے ناولوں میں مزدور اور سرمایہ دار یا کسان

اور زمین دار کی طبقاتی کش مکش کا سراغ تو البتہ نہ ملے گا، کیوں کہ یہ آویزشیں اس وقت شروع ہی نہیں ہوئی تھیں ، لیکن عوام کے طبقے میں سے خوش حال اور کنگال ، مال مست اور 'کھال مست' ہر طرح کے لوگ آپ کو نظر آئیں گے ۔ انہوں نے اگر خوش حال طبقے کے امیرانہ چونچلوں اور 'سکھ روگوں' کو بیان کِیا ہے تو کنگال طبقے کے دکھ درد کو بھی سمجھا ہے ۔ اس سے زیادہ حقیقت نگاری اس دور میں اور کیا ہو گی کہ وہ عوامی زندگی کی ترجمانی کے لیے زبان کو بھی عوام کی سطح پر آتار لاتے ہیں اور اپنے انداز بیان ، لب و لہجہ ، الفاظ و محاورات میں عوامی رنگ بھر دیتے ہیں ۔ ذرا تصور تو کیجئے ، نذیر احمد جیسا جید عالم ، اپنی دستار فضیلت کے ساتھ ، عوام کے ہجوم میں کھڑا ، عوام کی بولی میں باتیں کر رہا ہے !

توبۃ النصوح کی فصل ششم میں مقروض خان صاحب اور بنیے کا واقعہ ملاحظہ ہو ۔ یہ کوئی معمولی واقعہ نہیں بلکہ غدر کے بعد مسلمانوں کی اقتصادی بد حالی کی ایک عبرت ناک تصویر ہے ۔ آپ ان بے چارے خان صاحب کو کس طبقے میں شمار کریں گے جن کی مفلسی کا یہ حال ہے کہ اپنے گھر کی ساری پونجی بلکہ بیوی کے ہاتھ سے چاندی کی دو پتلی تار جیسی چوڑیاں بھی آتار کر بنیے کے آگے رکھ دیتے ہیں ، لیکن اصل اور سود ملا کر کل سات روپے کا مطالبہ بھی ادا نہیں ہو سکتا ۔ کیوں کہ یہ تمام اثاثہ صرف چار ، ساڑھے چار روپے کا ٹھہرتا ہے ۔ دوسری طرف ان کی غیرت و حمیت کا یہ عالم ہے کہ جب بنیا عزت آتار لینے کی دھمکی دیتا ہے تو وہ اپنی آن نہ جان دینے کے لیے تلوار

سونت کر نکل پڑتے ھیں ۔ نذیر احمد کے قصوں میں ایسے بہت سے کردار ملیں گے جو اگرچہ کبھی کبھی محلوں کے خواب تو ضرور دیکھتے ھیں لیکن جھونپڑوں یا کھنڈروں میں رھتے ھیں اور افلاس و بے روزگاری یا اصراف و وضع داری کے ھاتھوں سخت کشمکش میں مبتلا ھیں ۔ کوئی ھمیں بتائے کہ نذیر احمد 'جمہوری حقیقت نگار' بننے کے لیے اپنی بستی اور اپنے سماج کے ان دکھیاروں کو چھوڑ کر کس مخلوق کو اپنی کہانیوں کا موضوع بناتے اور اسے کہاں ڈھونڈھنے جاتے ؟!

★

(۳)

پروفیسر عبدالقادر سروری لکھتے ھیں :

''کردار نگاری میں حافظ نذیر احمد کو ید طولیٰ حاصل ھے ۔ اردو افسانہ نگاروں میں سے کوئی بھی اُن کے عمیق مشاھدے ، فطرت انسانی کے وسیع مطالعے اور دل چسپ بیانات تک نہیں پہنچ سکا ۔ حافظ نذیر احمد کے قصوں کا سب سے زیادہ اھم عنصر اُن کی کردار نگاری ھے ۔''
(دنیائے افسانہ ۔ حصۂ دوم ۔ ص : ۱۵۱)

میں پروفیسر سروری کی اس رائے سے متفق ھوں کہ نذیر احمد کے قصوں میں کردار نگاری سب سے اھم عنصر ھے ۔ یہ بھی ایک حد تک درست ھے کہ اُن کے دل چسپ بیانات ھمارے فسانوی ادب میں بے مثال ھیں ۔ انھیں اردو ناول نگاروں میں فطرت انسانی کا پہلا ادا شناس بھی تسلیم

کیا جا سکتا ہے لیکن یہ کہنا کہ کردار نگاری میں انہیں 'ید طولیٰ' حاصل ہے ، یا ''اردو افسانہ نگاروں میں کوئی بھی اُن تک نہیں پہنچ سکا'' میرے نزدیک حد انصاف سے تجاوز کرنا ہے۔ دورحاضر میں نفسیاتی تجزیے اور شعور ولاشعور کے خورد بینی مطالعے کی بدولت کردار نگاری کا فن بے حد ترقی کر چکا ہے - لیکن موجودہ صدی کے ربع اول میں بھی مرزا رسوا کے ناول 'امراؤ جان ادا' ، مرزا سعید کے ناول 'خواب هستی' اور پریم چند کے کئی ناولوں میں کردار نگاری کے بہتر نمونے موجود ھیں - نذیر احمد کا امتیاز یہ ہے کہ وہ نہ صرف اردو کے پہلے ناول نگار ھیں بلکہ کردار نگاری کے فن میں بھی انہیں 'نقاش اول' کی حیثیت حاصل ہے - اور یہ کوئی معمولی امتیاز نہیں - یہی وہ مقام ہے جہاں ہمیں یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ نذیر احمد اپنے مقصدی جوش و خروش کے باوجود ایک فطری قصہ گو تھے - انھوں نے اصلاح کی دھن میں کٹھ پتلیوں کا تماشا نہیں دکھایا بلکہ اپنے عہد کے جیتے جاگتے معاشرتی ماحول کو سامنے رکھ کر اُس ماحول سے وابستہ جیتے جاگتے کردار تخلیق کیے ھیں - لیکن مصور اور فن کار میں جو فرق ھوتا ہے اُسے نہ بھولنا چاہیے - نذیر احمد کے کرداری خاکے ، اصل سے ملتے جلتے ضرور ھیں لیکن فن کی آمیزش سے وہ زیادہ دل کش ، زیادہ جان دار ھوگئے ھیں - اکبری ، اصغری ، ماما عظمت ، نعیمہ ، ھریالی ، غیرت بیگم ، آزادی بیگم ، نصوح ، کلیم ، ظاھردار بیگ ، فطرت ، مبتلا ، سید ناظر ، ابن الوقت ، حجۃ الاسلام ، یہ سب اُس معاشرے کے مختلف طبقات ، حالات اور رجحانات کی پوری پوری نمائندگی کرتے

ہیں اور اسی لیے ہمارے فسانوی ادب کے زندہ جاوید کردار ہیں ۔ اگرچہ اصلاحی مقصد کے تحت ، ان میں سے بعض کردار نذیر احمد کے محبوب کردار ہیں ، بعض معتوب ، بعض بصیرت افروز ہیں ، بعض عبرت انگیز ، اور پھر بیشتر یک رخے ہیں ۔ لیکن ناول نگار کی سعئی اصلاح اور کرداروں کے یک رخے پن کے باوجود ، سب کردار زندگی سے اتنے بھرپور ہیں کہ کسی پر مثالی ہونے کا گمان نہیں گزرتا ۔ حقیقت یہ ہے کہ بہ قول ڈاکٹر تاثیر مرحوم ''مولوی صاحب کی اخلاق آموزی ، اُن کی کردار سازی کے ہاتھوں بری طرح شکست کھا جاتی ہے'' (نثرتاثیر۔ ص : ۱۱۱) ۔ فیض صاحب نے یہی بات بڑے پرلطف انداز میں کہی ہے فرماتے ہیں : ''اُن کے ناولوں میں مولوی اور آرٹسٹ کی مسلسل ہاتھا پائی ہوتی رہتی ہے اور آرٹسٹ عام طور سے جیت جاتا ہے ۔'' (میزان ۔ ص : ۸-۲۰۷)

یادش بخیر ، ڈاکٹر احسن صاحب نے ''اُردو ناول کی تنقیدی تاریخ'' میں ایک نیا نکتہ پیش کیا ہے ۔ انھوں نے پہلے تو نذیر احمد کے قصوں کو 'اخلاقی تمثیل' ثابت کرنے کی سعئی بلیغ فرمائی پھر یہ حکم لگایا کہ اُن کے سب کردار ''تمثیلی مجسمے' ہیں ، کیوں کہ وہ یک رخے ہیں یا اُن کے ناموں میں علامتی رنگ پایا جاتا ہے ۔ وہ تو خیریت گزری کہ ادبی تنقید کی دنیا میں نعرہ بازی کا رواج عام نہیں ہوا ورنہ نذیر احمد کا نام ناول نگاروں کی فہرست سے اب تک خارج ہو چکا ہوتا ۔ پھر بھی ڈاکٹر صاحب کے بعض مقلد ، اس نظریے کی تبلیغ میں اب بھی سرگرم ہیں ، یا ادب کا کوئی بھولا بھالا طالب علم جس کے مطالعے کی آخری حد

ڈاکٹر صاحب کی 'تاریخی تنقید' ہے ، کبھی کبھی 'اخلاقی تمثیل' اور ''تمثیلی مجسمے' کی ھانک لگا ھی بیٹھتا ہے ۔ اگر ناموں کے علامتی انداز پر فیصلہ ٹھہرے تو توبۃ النصوح کے اخلاقی تمثیل ہونے میں کوئی شبہ نہیں ۔ اس ناول کے نام، اس کے کرداروں کے نام ، حتیٰ کہ شہروں ، محلوں اور گلیوں کے نام میں بھی آپ کو علامتی رنگ ملے گا ۔ رعایت لفظی ھمارے قدیم ادیبوں اور انشا پردازوں کی ایک عام کمزوری رھی ہے ۔ نذیر احمد کی تحریروں میں بھی یہ عیب نمایاں ہے ۔ خصوصاً ناموں کے انتخاب میں تو انھوں نے رعایت لفظی کا شوق جی بھر کے پورا کیا ہے ۔ لیکن ذرا ناموں سے قطع نظر کر کے اُن کے کرداروں پر غور کیجیے ۔ کیا اُن کی شخصیت اور اُن کے ماحول میں ، اُن کے خارجی اور ذہنی عمل میں ایک ہم آہنگی نہیں پائی جاتی ؟ کیا وہ ایک زندہ انسان کی طرح سوچتے اور محسوس کرتے ، حالات سے متاثر ہو کر بدلتے اور حرکت کرتے نظر نہیں آتے ؟ کیا اُن کے دلوں کی دھڑکن آپ کو سنائی نہیں دیتی ؟

★

آئیے ہم پہلے نصوح کے کردار کا جائزہ لیں ۔ کہا جاتا ہے کہ وہ تقویٰ اور دین داری کا مجسمہ ہے ۔ لیکن دراصل وہ صرف ایک عام مسلمان ہے جس کا ضمیر پوری طرح بیدار ہو چکا ہے ۔ اس بیداری سے پہلے وہ محض نام کا مسلمان اور دنیا پرست انسان تھا ۔ اس کے مزاج کی یہ کیفیت تھی کہ ''گھر والے اُس کو ہوا سمجھتے تھے'' ۔ لیکن یہ سختی اور درشتی کسی اصول یا ضابطے کے معاملے میں نہیں بلکہ اپنے نفس کی خاطر تھی ۔ وہ شعر و شاعری ، شطرنج و گنجفہ ،

تاش و چوسر جیسے مشاغل میں بھی دل چسپی رکھتا تھا ۔ عام لوگوں کی طرح اولاد کی تربیت سے مطلق غافل تھا ۔ اچانک اُس کی زندگی میں ایک زبردست موڑ آگیا ۔ انسانی سیرت میں عموماً زندگی کے گوناگوں تجربات کے اثر سے رفتہ رفتہ تبدیلی ہوتی ہے ۔ لیکن کبھی کبھی کسی واقعے یا حادثے کے اثر سے آناً فاناً دل کی دنیا بدل جاتی ہے اور دل بدلتے ھی فکر و نظر کے زاویے بدل جاتے ھیں ، اوضاع و اطوار میں نمایاں فرق آجاتا ہے ۔ نصوح کی زندگی میں انقلاب کا محرک ایک خواب تھا ، ایسا خواب جس نے اُس کے پورے وجود کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا ، اس کی روح کو بیدار کر دیا ۔ نذیر احمد نے اوروں کی طرح خواب کو ایک آسان چٹکلا بنا کر پیش نہیں کیا بلکہ ہولناک وبا اور اُس کے اثرات کے ذکر سے اس کے لیے ایک مناسب ذہنی پس منظر تیار کیا ، پھر کئی اور نفسیاتی بنیادیں فراھم کی ھیں ۔ اُن کی فن کارانہ ھنر مندی کے ثبوت کے لیے تنہا یہی مثال کافی ہے ۔ غرض یہ بیماری اس کی روحانی صحت اور یہ خواب اس کی ذھنی بیداری کا باعث ھوا ۔ اب اُس کی زندگی کی کایا پلٹ چکی تھی ۔ لیکن وہ یہ نہیں کرتا کہ بستر سے اٹھتے ھی گھر والوں کے پیچھے لٹھ لے کر پڑ جائے ۔ بلکہ کئی دن تک وہ خاموش پڑا ھوا اپنے ماضی اور حال پر غور و فکر کرتا ہے ۔ پچھلے گناھوں پر ندامت کے آنسو بہاتا ہے ۔ اپنی اولاد کی بے راہ روی کو خود اپنی غفلت کا نتیجہ قرار دیتا ہے ۔ اُن کی اصلاح کے لیے مناسب تدبیریں سوچتا ہے دوسروں کے سامنے پہلے اپنے برتاؤ اور اپنے عمل کے نمونے پیش کرتا ہے ۔ بیوی کو اپنا ھم خیال بناتا ہے ۔ پھر ایک عزم صمیم کے

ساتھ اپنی خانگی زندگی کی تنظیم نو کی مہم شروع کر دیتا ہے۔ لیکن وہ جانتا ہے کہ اصلاح کے سلسلے میں اولاد پر سختی "ایک تدبیر نامناسب ہے"۔ للہذا وہ بڑے صبر و تحمل سے کام لیتا ہے۔ اپنی بات ڈنڈے کے زور سے نہیں منواتا بلکہ افہام و تفہیم کا طریقہ اختیار کرتا ہے۔ فصل پنجم و ششم میں سلیم و علیم سے اُس کی گفتگو ملاحظہ فرمائیے۔ وعظ و نصیحت کے بجائے وہ کس بے تکلفی سے باتیں کرتا ہے۔ اُن کے رجحانات و خیالات کو سمجھنے اور اُن کی انفرادی مشکلات کو جاننے کی کوشش کرتا ہے۔ کلیم جب ملاقات سے گریز کرتا ہے تو وہ شدید مایوسی اور دل شکستگی کے باوجود، خفگی کا اظہار نہیں کرتا بلکہ مدلل و موثر پیرایے میں اپنا نقطۂ نظر واضح کرتا ہے اور تبادلۂ خیال کی کھلی آزادی دیتا ہے۔ گھر سے روٹھ کر بھاگ جانے کی خبر سن کر اپنے منجھلے بیٹے، علیم سے کہتا ہے: "افسوس ہے کہ اس کے نفس سرکش نے اس کو مجھ تک آنے نہ دیا ورنہ میں تو ہر طرح اُس کے عذرات کو سننے اور اس کے وجوہات پر لحاظ کرنے اور معقولیت کے ساتھ اس کو سمجھانے کے لیے موجود تھا۔"

غرض ہٹ دھرمی کی جگہ معقولیت اس کے کردار کا ایک نمایاں پہلو ہے۔ پورے قصے میں صرف ایک جگہ اس کے عمل میں تشدد کی جھلک نظر آتی ہے جب کہ وہ کلیم کے عشرت منزل کی بے ہودہ تصویروں اور کتبوں کو توڑ پھوڑ کر، اس کی کتابوں کو بھی نذر آتش کر دیتا ہے، جنھیں وہ نو عمر لڑکوں کے لیے سم قاتل سمجھتا ہے۔ اس

عالم میں بھی اس کی انسان دوستی کا جذبہ لائق تحسین ہے۔
کلیم کے تکلف خانے کے شاہی ٹھاٹھ باٹھ دیکھنے کے بعد وہ
ایک آہ بھر کر کہتا ہے : ''افسوس ، کتنی خدا داد دولت
اس بے ہودہ نمائش اور تکلف اور آرائش میں ضائع کی گئی ۔
کیا اچھا ہوتا کہ یہ روپیہ محتاجوں کی امداد اور غریبوں
کی کاربر آری میں صرف کیا جاتا'' ۔ ہم پہلے بھی باب ششم
میں دیکھ چکے ہیں کہ وہ خاک ساری اور ہم دردی کو
شرط انسانیت قرار دیتا ہے ۔

حق پرستی کی راہ میں اولاد کی محبت سب سے بڑی
آزمائش ہے ۔ وہ اس آزمائش میں ثابت قدم رہتا ہے ۔
لیکن اس عزم راسخ کے باوجود اپنے نافرمان بیٹے کے معاملے
میں ہمیشہ عفو و در گزر سے کام لیتا ہے ۔کلیم باپ سے بغاوت
کا اعلان کرنے کے بعد کیا کیا گل کھلا چکا ہے ۔ پھر بھی
نصوح کی شفقت دیکھیے کہ جب وہ جیل سے خط لکھ کر
سات سو روپے منگواتا ہے تو وہ خط پڑھتے ہی روپے دے
دیتا ہے ۔

نصوح کے کردار کا سب سے نمایاں پہلو یہ ہے کہ وہ
ہر حال میں پر سکون اور صابر و شاکر رہتا ہے ۔ کسی
موقع پر غیر معتدل جذباتیت اور 'اضطراب جاہلانہ' کا
مظاہرہ نہیں کرتا ۔ ایک مسلمان کی طرح ''اس کی جملہ حرکات
و سکنات ، معلم دین داری کی مطیع اور مؤدب خدا پرستی کی
تابع تھیں ۔'' حتیٰ کہ جب اس کے جوان بیٹے کی زندہ لاش
ڈولی میں اس کے دروازے پر پہنچتی ہے اور گھر بھر میں
ایک کہرام مچ جاتا ہے ، اس وقت بھی وہ صبر و ضبط سے

کام لیتا ہے اور دوسروں کو صبر جمیل کی تلقین کرتا ہے۔
بعض نقادوں نے نصوح کو جذبات سے معرّا، زاہد خشک ثابت کرنے کے لیے اس واقعے کو بہ طور دلیل پیش کیا ہے۔ میں کتاب کی وہ عبارت نقل کرتا ہوں جہاں نذیر احمد نے ایک باپ کے جذباتی رد عمل اور ایک مسلمان کے صبر و تحمل کی تصویر پیش کی ہے:

"اگرچہ نصوح (جو اس وقت بالا خانے پر مصروف عبادت تھا۔ مرتب) گریہ و بکا کی آواز سن کر کھٹکا تھا، مگر وہ اس طرح کا مستقل مزاج، ضابط آدمی تھا کہ اسی ترتیل کے ساتھ معمولی تلاوت کو پورا کیا اور اس کے بعد نیچے اتر کر باہر پالکی کے پاس آیا۔ فہمیدہ کا رونا سن کر اور بیٹے کی ردی حالت دیکھ کر بے اختیار اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو چلے آتے تھے اور بار بار ٹھنڈی سانسیں بھرتا تھا، مگر نہ کچھ بولتا تھا، نہ چالتا تھا۔ آدھ گھنٹے کامل اس کی یہی کیفیت رہی۔ اس کے بعد اس نے اپنے آنسو پوچھے اور کہا انا للّٰہ و انا الیہ راجعون ...."

کیا یہ کیفیت ایک سچے دین دار مسلمان کے مزاج سے ہم آہنگ نہیں؟ کیا ایک اسلامی معاشرے میں ہم آج بھی اپنی آنکھوں سے صبر و استقامت کا یہ منظر نہیں دیکھتے؟
"انا للّٰہ و انا الیہ راجعون" تو وہ منتر ہے جو ہر صاحب ایمان کے دل کو غم کا پہاڑ اٹھا لینے کی قوت بخش دیتا ہے۔

—

القصہ ، نصوح اپنے ناصحانہ رول کے باوجود ، نہ محض ناول نگار کے ذوق خطابت کا بے جان وسیلۂ اظہار ہے اور نہ کوئی مثالی انسان ۔ اپنے انقلاب آفریں خواب سے پہلے وہ ایک بگڑے ہوئے معاشرے کا عام فرد تھا ، خواب کے بعد وہ اسی معاشرے کے ان افراد میں شامل ہو گیا جو اپنی پوری زندگی کو اسلام کے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش اور صبر و سکون سے اس راہ کی دشواریوں کا مقابلہ کئے جاتے ہیں ۔ اس کش مکش میں اسے ایک عارضی شکست کے بعد فتح ہوتی ہے ۔ یہ فتح ناول نگار کی طرف سے انعام نیکو کاری نہیں بلکہ ہر صاحب عزیمت انسان کا فطری حق ہے ۔ اگرچہ نذیر احمد نے نصوح کی زندگی کے دو رخ دکھائے ہیں ، لیکن ناول کے سیدھے سادے پلاٹ میں اتنی گنجائش نہ تھی کہ وہ کردار نگاری کا پورا حق ادا کر سکتے ورنہ امہات الامہ کا مصنف ، انسانی فطرت سے اس درجے نا آشنا نہیں کہ کسی کردار کو فرشتے کے روپ میں پیش کرے ۔

نصوح کے بالمقابل فہمیدہ کا کردار نذیر احمد کی فطرت شناسی کا ایک واضح ثبوت ہے ۔ فہمیدہ پہلے بھی نصوح سے زیادہ دین دار تھی ۔ نصوح کا خواب سن کر اتنا متأثر ہوئی کہ بے اختیار رونے لگی ۔ اولاد کے بارے میں اسے پوری طرح احساس ہے کہ ”میں نے ان کے بدنوں کو پالا اور ان کی روحوں کو تباہ اور ہلاک کیا ۔“ وہ بھی نصوح کے عزم اصلاح میں برابر کی شریک ہے ۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ اس راہ میں وہ نصوح کے قدم بہ قدم نہیں چل سکتی ۔ مامتا اس کے پاؤں میں بیڑیاں ڈال دیتی ہے ۔ نعیمہ کی

گستاخیوں پر غیرت دینی سے بے اختیار ہو کر طمانچہ مار بیٹھتی ہے لیکن بار بار پچھتاتی ہے اور مختلف طریقوں سے بے قراری ظاہر کرتی ہے ۔ نصوح نے نعیمہ کی بے دینی کی باتیں سن کر کہا ''بہتر ہو گا کہ ابھی پالکی منگا ، اس کو سسرال پہنچا دو'' تو اُس نے بیٹی کو بے طلب بے تقریب ، سسرال بھیجنے کی مخالفت کی کہ اس طرح بیٹی کی بڑی سبکی ہو گی ۔ نعیمہ جب چپکے سے اُٹھ کر خالہ کے گھر چلی جاتی ہے تو اسے اس بات کا بے حد ملال ہوتا ہے کہ وہ بغیر ملے چلی گئی ۔ صالحہ سے کہتی ہے ''بھلا کہیں ایسا بھی غضب ہوا ہے کہ بیٹی ماں کے گھر سے یوں چلی جائے ۔ اگر میں اس کی باتوں پر جاؤں تو جیتے جی صورت نہ دیکھوں ، لیکن کیا کروں یہ دل کم بخت نہیں مانتا ۔'' نصوح جب طعنہ دیتا ہے کہ وہ دل کی کچی ہے اور اگر یہی حال رہا تو خاندان کی اصلاح نہیں ہو سکتی تو ماں کا دل یوں بول پڑا : ''کیا اولاد کے واسطے جی نہیں کڑھتا میں نے ان کو اسی دن کے لیے پالا تھا کہ یہ بڑے ہو کر مجھ سے چھوٹ جائیں ۔ بےشک مجھ سے تو اتنا صبر نہیں ہو سکتا ۔'' نصوح کے سمجھانے سے وہ اس بات کا اقرار کرتی ہے کہ بے دین اولاد کے بجائے وہ ایمان کی پاس داری کرے گی اور اولاد کی طرف سے 'چھاتی پر پتھر' رکھ کر اس آزمائش میں ثابت قدم رہے گی ۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ شعوری کوشش کے باوجود اُس کا دل ہر موقع پر مچلنے لگتا ہے ۔ کلیم جب گھر چھوڑ کر چلے جانے کا ارادہ ظاہر کرتا ہے تو وہ رو پڑتی ہے اور بیٹے کو وہ دھمکی دیتی ہے جو ایک ماںتا کی ماری ، بےبس اور دکھیاری ماں ہی

دے سکتی ہے : ''کلیم سچ کہتی ہوں ، ذرا جا دیکھ ، قیامت تک تو دودھ بخشنے ہی کی نہیں ۔'' کلیم جب گرفتار ہو کر آتا ہے اور پھر بھاگ جاتا ہے تو وہ شوہر سے بھی لڑنے لگتی ہے : ''کیوں کر تمہارے دل نے صبر کیا اور کن آنکھوں سے تم نے بیٹے کو اس حالت میں دیکھا ؟ ..... تم سے اتنا بھی نہ ہو سکا کہ اس کو مجھ تک لے آتے ۔'' اور آخری بار جب وہ زخموں سے چور ، نیم مردہ حالت میں پالکی پر سوار ہو کر گھر آتا ہے تو ایک طرف بالا خانے پر نصوح ہے جو آہی سکون کے ساتھ پوری نماز ادا کرتا ہے ، دوسری طرف فہمیدہ ، جو بے تاب ہو کر بے حجاب باہر نکل آئی اور بیٹے کی حالت دیکھ کر ''اس طرح بلک کر روئی کہ سننے والوں کے کلیجے ہل گئے ۔''

★

کلیم کا کردار نذیر احمد کی بہترین تخلیقات میں سے ہے ۔ وہ مختلف خوبیوں اور خامیوں کا مجموعہ ایک مکمل کردار ہے جو اپنی انفرادیت اور خاص کشش کی وجہ سے تمام نقادوں کی توجہ کا مرکز رہا ہے ۔ حتیٰ کہ ڈاکٹر احسن فاروقی صاحب کے نزدیک بھی ''وہ مجسمے کے دائرے سے نکل کر کردار کے دائرے میں آ جاتا ہے ۔'' (تنقیدی تاریخ ص : ۵۸) ۔

کلیم کی سیرت کا روشن پہلو یہ ہے کہ وہ ایک ذہین ، طباع ، با مذاق ، فن پرست نوجوان ہے ۔ وہ حاضر جواب ، لسّان و خوش بیان بھی ہے ۔ ذہین نوجوانوں میں بننے اور بگڑنے کے لا محدود امکانات ہوتے ہیں ۔ نذیر احمد نے اس

قصے میں یہی بات دکھائی ہے کہ مناسب تربیت کے بغیر ذہین بچوں کے اطوار اور کردار کتنے مسخ ہو جاتے ہیں۔ ہمارے نقاد ، بالعموم ، کلیم کی خوش مذاق اور ذہانت سے اتنے متاثر ہیں کہ وہ کسی اور پہلو پر نظر ڈالنے کے لیے تیار نہیں ۔ وہ اس کی نفس پروری کو کلچر ، اس کی ہٹ دھرمی اور بغاوت کو 'انکارِ ابلیس' کی طرح خود نگری ، خود شناسی اور اجتہاد قرار دیتے ہیں۔ ڈاکٹر احسن فاروقی کو کلیم کے واقعات میں ''ادب یا کلچر اور مذہب کے چند خشک اصولوں کی پابندی کے درمیان کشمکش دکھائی دیتی ہے ۔'' (ایضاً ۔ ص : ۴۰) حالاں کہ اس کشمکش کے آغاز سے پہلے ہی گھر والے اس کے کرتوتوں سے نالاں تھے ۔ ابھی نصوح کی اصلاحی کوششوں کا آغاز نہیں ہوا ؛ نصوح و فہمیدہ کے درمیان گفتگو ہو رہی ہے ۔ فہمیدہ ایک جگہ کہتی ہے : ''ماں باپ کو جیسی اولاد کی ممتا ہوتی ہے ، ظاہر مگر دیکھو کلیم کی حرکتوں سے میرا تمہارا ، دونوں کا جی آخر کھٹا ہو ہی گیا ۔'' اور اسی سلسلے میں نصوح کی زبان پر کلیم کا ذکر آتا ہے : ''ایک نابکار کو دیکھو ، وہ ماش کے آٹے کی طرح ہر وقت اینٹھا ہی رہتا ہے ۔ کبھی سینے پر نظر ہے ، کبھی بازوؤں پر نگاہ ۔ آدم زاد ہو کر لقّا کبوتر کا پٹھا بنا پھرتا ہے ۔ اتنا اکڑتا ہے کہ گردن گدی میں جا لگی ہے ۔''

یہ اکڑفوں کلیم کی خاص ادا ہے ۔ وہ محلے کے غریب لوگوں کو نہایت حقارت کی نظر سے دیکھتا ہے اور اپنے باپ کو اُن کے ساتھ نماز پڑھتے اور اُٹھتے بیٹھتے دیکھ کر اُن کی اس 'سفلہ پروری' پر طعنہ زن ہے ۔ ناول کے آخری باب

میں جہاں اس کے بانک پن کی تصویر کھینچی گئی ہے ، وہ عبارت پہلے نقل کی جا چکی ہے ۔ وہ "عورتوں کی طرح درپۓ تزئین" رہتا اور اپنی سج دھج کا بہت زیادہ خیال رکھتا تھا ۔ پھر اس پر شاعری کی پھٹکار الگ تھی ۔ "جب انسان شبانہ روز داد و تحسین کی فکر میں منہمک رہے گا تو ضرور ہے کہ خود پسندی ، خود بینی ، خود ستائی کے عیوب اس کی طبیعت میں راسخ ہوں ۔" وہ اس زعم میں مبتلا تھا کہ گھر سے نکلتے ہی اسے کسی امیر کی مصاحبت یا کسی ریاست کی مسندِ وزارت نصیب ہو گی ۔ اپنے باپ سے کس دعوے کے ساتھ کہتا ہے : "ذرا مجھ کو دھلی سے نکلنے دیجیے تو پھر آپ اور سب لوگ دیکھ لیں گے کہ میں کیا تھا اور کیا ہو گیا ۔" شاعری میں اس کی لن ترانیوں کا یہ عالم تھا لیکن عملی حیثیت سے وہ بالکل کورا تھا ۔ "دنیا کے معاملات میں از بس کہ اس کو غور و خوض کرنے کی عادت نہ تھی ، اسی وجہ سے اکثر اس کی رائے غلطی پر ہوتی تھی ۔" پھر ایسا شخص جو خود بین و خود پرست ہو اور دنیا کے تجربے بھی نہ رکھتا ہو ، کبھی مردم شناس نہیں ہو سکتا ۔ ظاہر دار بیگ کی دوستی پر اس کے بے جا اعتماد کی یہی وجہ تھی ۔ دراصل شروع سے آخر تک جو جو افتاد اس پر آئی ، وہ محض اس لیے نہیں کہ ناول نگار خواہ مخواہ اسے کیفر کردار تک پہنچانا چاھتا تھا بلکہ تمام واقعات اس کی خود بینی و ناتجربہ کاری یا اس کے 'شوقِ فضول و جرأت رندانہ' کا نتیجہ ھیں ۔

پہلے پہل جب ہم اس ناول کا سرسری مطالعہ کرتے ھیں تو کلیم کے سلسلے میں بعض جگہ ہم اس کی مکاری و

بے غیرتی دیکھ کر حیرت سے سوچنے لگتے ہیں کہ یہ باتیں ایک شاعر کو کسی طرح زیب نہیں دیتیں ۔ لیکن یہاں ہم ایک بات بھول جاتے ہیں کہ کلیم محض شاعر نہیں ، وہ 'ٹیڈی شاعر' ہے ۔ اس کا لباس ، اس کے رہن سہن کا طریقہ ، اس کی ذہنیت ، سب 'ٹیڈیانہ' ہے ۔ لباس اور ظاہری طور طریقے تو ہر زمانے میں بدلتے رہتے ہیں لیکن کردار اور ذہنیت کے اعتبار سے انیسویں اور بیسویں صدی کے ٹیڈیوں میں سر مو کوئی فرق نہیں ۔ ادب اور فنونِ لطیفہ میں وہ اُن چیزوں کو پسند کرتے ہیں جن میں فحاشی و عریانی کا پہلو نمایاں ہو۔ مذہب سے تو انہیں نفرت ہوتی ہی ہے لیکن وہ کسی بھی آئین و قانون کے پابند نہیں ہوتے ۔ اپنے نفس کی ہر خواہش پوری کرنے کے لیے انہیں مطلق العنان آزادی مطلوب ہے ۔ بے مقصدیت ان کی زندگی کا مقصد اور بے اصولی ان کا سب سے بڑا اصول ہے ۔ کلیم کی ان حرکتوں پر حیرت نہ کیجیے۔ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ ایک ٹیڈی ، کسی موقع پر کیا کر گزرے گا ۔

ہمارے بعض نقاد کلیم کی اسی کج ادائی پر فریفتہ ہیں ۔ چناں چہ ڈاکٹر فاروقی صاحب لکھتے ہیں :

''کلیم کے اندر وہ سب باتیں موجود ہیں جنھیں ہم کلچر کے دائرے میں لاتے ہیں ۔ اس کا لباس ، رہن سہن کا طریقہ ، ادبی ذوق ، شاعری سے مناسبت ، مذہبی پابندیوں سے نفرت ، اُسے اس کلچر کا نمونہ دکھاتی ہیں جو اُس وقت کے شریف زادوں میں نمایاں تھی ۔ مگر مولانا اس

کلچر کے دشمن ہیں . . .'' (ایضاً - ص : ۴۰)

ظاہر ہے کہ 'مولانا' جیسے کٹھ مُلّا جس کلچر کے دشمن تھے ، ڈاکٹر صاحب اُس کلچر کے والہ و شیدا ہیں ، اسی لیے کلیم اُن کا محبوب کردار ہے - وہ ایک جگہ لکھتے ہیں :
''ہمیں اس سے اس قدر ہم دردی ہو جاتی ہے کہ ہم مولانا سے نفرت کرنے لگتے ہیں -'' (ایضاً - ص : ۵۸) تعجب اس بات پر ہے کہ جب تصویر اتنی پسند ہے تو مصور سے یہ نفرت کیوں ؟

اگر کلیم ، نذیر احمد کا بہترین کردار ہے تو ظاہر دار بیگ اُن کا بہترین خاکہ - غالباً اتنے مختصر اور محدود کینوس پر اتنا اچھا خاکہ اُردو میں آج تک نہیں پیش کیا گیا - خوجی ، اُردو ناولوں کا بہترین مزاحیہ کردار مانا جاتا ہے لیکن فن کے اعتبار سے دیکھیے تو کوئی بہت بڑا کارنامہ نہیں - ''فسانۂ آزاد'' کے ہزاروں صفحات میں ، ہزاروں بار اُچھل پھاند مچانے اور اپنی قرولی پر اترانے کے باوجود وہ ایک کارٹون سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا - ہم جتنی دیر فسانۂ آزاد میں اسے دیکھتے ہیں ، اس کی حماقتوں اور مُضحک حرکتوں سے محظوظ ہوتے ہیں ، پھر اس کے بعد بھول جاتے ہیں ، کیوں کہ موجودہ ماحول میں ایسے درباری مسخرے کہیں نظر نہیں آتے - لیکن ظاہر دار بیگ ، زمان و مکان سے ماورا ، ایک آفاقی کردار ہے - وہ آج بھی ہوٹلوں ، کلبوں ، بازاروں اور درس گاہوں میں ہر جگہ ، نئے نئے روپ اور بھروپ میں ہمیں دکھائی دیتا ہے - اس کی سج دھج ، اس کی

ڈینگیں ، اس کی چالیں ، اس کی لسانی ، سخن سازی ، دیدہ دلیری ، بے خیالی ، غرض اس کا ہر ہر انداز ، کہیں نہ کہیں اُس کے ہم زادوں میں نظر آ جائے گا ۔ ڈاکٹر تاثیر مرحوم اپنے ایک مقالے میں تحریر فرماتے ہیں :

> "اس ناول میں ظاہر دار بیگ اور کلیم کی ملاقات ، اردو ادب کے منتخب ابواب میں سے ہے ۔ خود ظاہر دار بیگ کی انفرادی حیثیت کوئی نہیں ۔ وہ محض ایک خاص صفت کی تجسیم ہے ، جیسا کہ اُس کے نام سے ظاہر ہے ۔ مگر اس کی یہ صفت یوں ہی خیالی چیز نہیں ۔ یہ صفت ایک خاص طبقے کا خاصہ ہے ۔ وہ طبقہ جو نہ امیر ہے ، نہ غریب — سفید پوش طبقہ ، جسے غریبوں سے الگ رہنے کے لیے ، اپنی حالت چھپانے کے لیے امیروں میں شامل ہونے کی کوشش میں ظاہر داری کرنی پڑتی ہے ۔"
>
> (نثر تاثیر ۔ ص : ۱۱۱)

اُستاد مرحوم نے ، ظاہر دار بیگ کو خوب پہچانا ، تاہم "کچھ اختلاف کے پہلو نکل ہی آتے ہیں ۔" میں یہ نہیں مانتا کہ اس کی کوئی انفرادی حیثیت نہیں ۔ بے شک وہ ایک طبقے کا نمائندہ ہے لیکن نذیر احمد نے اسے بعض صفات کا مجسمہ بنا کر پیش نہیں کیا بلکہ ایک زندہ فرد کی حیثیت سے روشناس کرایا ہے ۔ کیا آپ نے اسے بھڑکیلے کپڑوں میں ملبوس ، ریشمی ازار بند میں بے قفل کی کنجیوں کا گچھا لٹکائے ، سرِ بازار چھم چھم کرتے ہوئے آتے جاتے

نہیں دیکھا ۔ ذرا سوچیے تو اس کا چہرہ مہرہ ، ڈیل ڈول سب یاد آ جائے گا ۔ وہی وہی ، جس کی "رنگت زرد زرد ہے آنکھیں کرنجی ، چھوٹا قد ، دبلا ڈیل ، اپنے تئیں بہت بنائے سنوارے رہا کرتا ہے ۔" اس کی کرنجی آنکھوں میں ہمیں بے وفائی کی جھلک نظر آتی ہے ۔ یہ چھوٹے قد ، دبلے ڈیل ، زرد ، مدقوق چہرے کا نوجوان یقیناً ایک احساس کم تری میں مبتلا ہے ، جبھی تو اپنے تئیں بہت بنائے سنوارے رہتا ہے اور زبان کی تیزی و طراری سے اپنی کم روئی و کم زوری کی تلافی کرتا ہے ۔

توبۃ النصوح میں ظاہر دار بیگ کے علاوہ فطرت بھی ایک کام یاب خاکہ ہے ۔ ظاہر دار بیگ ایک مفت خور ، لیمو نچوڑ ، باتونی مگر بے ضرر قسم کا آدمی ہے ۔ اپنے دوستوں کو لچھے دار باتوں سے رجھا کر مزے اڑاتا ہے ۔ لیکن فطرت ، بڑا گھاگھ ، نہایت کینہ پرور اور عیار ہے ۔ اس کی باتیں سنیے ۔ کس کس ڈھنگ سے کلیم کو اپنے دام فریب میں پھنساتا ہے ۔ اسے بہلا پھسلا کر اپنے گھر لے جاتا ہے ۔ نصوح کو مجنون ، بد مزاج اور ظالم باپ اور اپنے آپ کو اس کا سب سے بڑا ہم درد و خیر خواہ ثابت کرتا ہے ۔ پھر کیسی صفائی سے کلیم کو بے وقوف بنا کر ہزاروں کی جائداد ، صرف ایک ہزار روپے کے عوض میں اپنے نام لکھا لیتا ہے ۔ یہی نہیں بلکہ اس فرضی کارروائی کے بل پر مقدمہ لڑ کر جائداد پر قبضہ جما لیتا ہے ۔ ایسے جعل ساز و مقدمہ باز ، آج بھی آپ کو ایک دو نہیں چار سو بیس مل جائیں گے ۔

نعیمہ کا کردار نذیر احمد کے بہترین نسوانی کرداروں میں شمار کیا جاتا ہے۔ نعیمہ ایک ذہین اور قدرے تیز مزاج لڑکی ہے جسے ماں باپ کے لاڈ پیار نے بے حد ضدی، منہ پھٹ اور بد زبان بنا دیا ہے۔ نذیر احمد نے اس کی گستاخی، بد مزاجی اور تریاہٹ کی منہ بولتی تصویر کھینچی ہے۔ نعیمہ کا کردار اس لحاظ سے بھی قابلِ توجہ ہے کہ اس میں ایک ارتقائی کیفیت پائی جاتی ہے۔ وہی نعیمہ جو ماں کو تڑاق پڑاق اُلٹے سیدھے جواب دیتی، دین کے بارے میں گستاخانہ کلمے بکتی، نماز کو "اُٹھک بیٹھک" اور جا نماز کو طنزاً "نماز کا چیتھڑا" کہتی تھی، بعد میں ایک دین دار، خوش اخلاق اور مہذب عورت ہو جاتی ہے۔ لیکن اس تبدیلی کے بیان میں نذیر احمد نے بڑی نفسیاتی بصیرت سے کام لیا ہے۔ نذیر احمد کو عموماً واعظِ ناداں سمجھا جاتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ وہ اپنی بسیار گوئی کی عادت سے مجبور ہو کر کہیں کہیں طویل مکالمے لکھ جاتے ہیں لیکن وہ اس حقیقت سے بے خبر نہ تھے کہ انسان کی اصلاح محض وعظ و پند سے نا ممکن ہے۔ نعیمہ کے سلسلے میں ایک جگہ انہوں نے اپنے اس عقیدے کا اعلان بھی کیا ہے: "خالہ کے گھر رہ کر نعیمہ کی عادتوں کا خود بخود درست ہو جانا، عمدہ مثال ہے اس کی کہ صحبت سے بڑھ کر تعلیم کا کوئی اچھا طریقہ نہیں۔"

نعیمہ کے کردار کی تصویر کشی میں نذیر احمد نے حسب معمول برجستہ و بر محل مکالموں سے بہت کام لیا ہے۔ فصل پنجم کی ابتدا میں فہمیدہ اور نعیمہ کی لڑائی سنیے۔ کس طرح بد مزاج عورتیں بات کا بتنگڑ بنا دیتی ہیں! کیسے

وہ اپنے حسبِ مطلب امر واقعہ کو توڑ موڑ کر بیان کرتی ہیں ؛ آپس کی نوک جھوک کا لہجہ ، بولی ٹھولی اور لعن طعن کا انداز کیا ہوتا ہے ؛ غرض گھریلو جھگڑوں کا پورا نقشہ آنکھوں کے سامنے کِھنچ جاتا ہے ۔ پروفیسر عبدالقادر سروری ، نعیمہ کے کردار پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

''اگر ایک بگڑے ہوئے خاندان کی بد مزاج لڑکی کا اپنے چاہنے والے بزرگوں کے ساتھ لڑنے کا بہترین سماں دیکھنا ہو تو اردو زبان میں توبۃ النصوح کے سوا اور کہیں دست یاب نہ ہوگا ۔ نعیمہ اور فہمیدہ کی جھوڑ میں ، حافظ نذیر احمد نے انسانی طبائع کے اختلافات ، فطرت شناسی ، عمیق مشاہدہ اور معمولی اور پیش پا افتادہ واقعات کے مطالعے کا اس قدر کافی ثبوت دیا ہے کہ شاید اس سے بہتر سماں کھینچا ہی نہ جا سکے ۔ لڑائی کے شروع سے آخر تک مصنف نے ایک لفظ ، بلکہ ایک اشارہ بھی ایسا داخل نہیں کیا جو زائد کہا جا سکے'' ۔
(دنیائے افسانہ ، حصۂ دوم ، ص : ۱۶۰)

★

نذیر احمد کو مکالمہ نگاری کا بادشاہ تو کہا جاتا ہے لیکن عموماً یہی سمجھا جاتا ہے کہ وہ مکالموں میں دہلی کے روز مرے اور محاورے سے جان ڈال دیتے ہیں ۔ بے شک روز مرہ اور محاورہ بھی اُن کے مکالموں کی ایک خصوصیت ہے ، لیکن ناول میں جہاں مختلف مزاج اور طبیعت ، مختلف

ذهنیت اور حیثیت کے کئی افراد سامنے آتے ہیں ، کیا اُن کی تشخیص کے لیے محض محاورہ بندی کافی ہے ؟ نذیر احمد کا کمال یہ ہے کرداروں کی شخصیت اور ایک ہی کردار کی مختلف نفسیاتی کیفیات کے مطابق ، مناسب پیرایہ اور مخصوص لب و لہجہ اختیار کرتے ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ ہر کردار اپنی گفتگو سے صاف پہچانا جاتا ہے ۔ توبۃ النصوح کے صفحے صفحے پر اس کی مثالیں دیکھی جا سکتی ہیں ۔ اس امر کی وضاحت کے لیے کہ وہ کس طرح مکالموں میں ذہنی کیفیات کی ترجمانی کرتے ہیں اور بہ ظاہر ایک ہی وضع کے مختلف کرداروں کے مکالموں میں کس طرح فرقِ مراتب قائم رکھتے ہیں ، صرف دو مثالیں پیش کروں گا ۔

کلیم گرفتار ہو کر نصوح کے پاس آیا اور گھر تک پہنچنے کی نوبت نہ آئی تھی کہ باہر ہی باہر رفو چکر ہو گیا ۔ فہمیدہ کو جب خبر ملی تو دیوانہ وار دروازے پر آ کھڑی ہوئی اور اپنے شوہر سے گھبرا کر پوچھا : 'میرا کلیم کہاں ہے ؟' شوہر بے نیازی سے کہتا ہے کہ تمھارا کلیم ہوتا تو تمھارے گھر میں ہوتا ۔ اب ذرا ایک ماں کی بے قراری اور ناز پروردہ بیٹے کی حالت پر اُس کے غم و غصے کا عالم دیکھیے :

> "اچھے ، خدا کے لیے ذرا مجھ کو اس کی صورت دکھا دو ! میں نے سنا ہے کہ سر سے ننگا ہے ، پاؤں میں جوتی نہیں ۔ اس نے کاہے کو کبھی زمین پر پاؤں رکھا تھا ۔ کنکر تلووں میں چبھتے ہوں گے ۔ کون سے وہ موئے سپاہی تھے

میرے بچے کے پکڑنے والے ؟ گھورا ہو تو
الٰہی دیدے پھوٹیں - ہاتھ لگایا ہو تو خدا
کرے پور پور سے کوڑھ ٹپکے - وارے تھے وہ
..چاھی ، اور قربان کیا تھا وہ کوتوال - میرا
بچہ اور چوری کرنے کے قابل ؟ !''

کلیم جب دولت آباد کے صدر اعظم کی خدمت میں
پہنچتا ہے تو وھاں مولویوں کی قیل و قال ملاحظہ ہو -
کلیم نے مجرا عرض کیا تو و علیکم السلام و رحمۃاللہ و برکاتہ
کہنے کے بعد یہ پوچھنے کے لیے کہ تم کہاں سے آتے ہو،
لگے عربی بگھارنے - کلیم کہتا ہے : ''حضرت قبلہ ، میں
فہم عربی سے قاصر ہوں'' - تو فرماتے ہیں : ''کہاں سے
اتفاق مجی ہوا'' یہ خالص مولویانہ زبان ہے - تمام گفتگو
کا انداز یہی ہے - چند مختصر سے جملے ہیں لیکن ان میں قرآن
کی آیت بھی ہے ، منطق اور صرف و نحو کی اصطلاحیں بھی -
اس اظہار فضیلت کے باوجود یہ محسوس ہوتا ہے کہ بڑی
ٹھس طبیعت اور کھٹل دماغ کے آدمی سے پالا پڑا ہے - پھر
اس کے فوراً بعد صدر اعظم کی گفتگو سنئیے - ان کی زبان بھی
عالمانہ ہے - مگر صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اب ایک ذہین ،
با وقار اور مدبر شخص ہم کلام ہے -

نذیر احمد کے ناولوں میں اگر کوئی کردار ایک
لمحے کے لیے سامنا آتا ہے تو اس کی زبان سے نکلا ہوا ایک
آدھ جملہ یا فقرہ ، اس کی شخصیت کی جھلک دکھا دیتا ہے -
مثلاً توبۃ النصوح کی فصل ششم میں جہاں علیمؔ ، مقروض
خان صاحب کی امداد کا واقعہ سناتا ہے ، وھاں ایک بنیے کا

ذکر آیا ہے ۔ جب لوگ خان صاحب کی حالت پر ترس کھا کر اسے سمجھاتے ہیں کہ لالہ جی ، جہاں تم نے اتنے دنوں صبر کیا ، دس پانچ روز اور صبر کر جاؤ تو بنیا بولا :
''اچھی کہی میاں جی ، اچھی کہی ! برسوں کا نانواں اور روج روج کی ٹال مٹول ۔ بھگوان جانے ، ابھی کھان صاحب کی اجت اتروائے لیتا ہوں'' ۔ مجھے یقین ہے کہ اس مکالمے کو پڑھتے ہی آپ نے چشم تصور سے لالہ جی کے درشن بھی کر لیے ہوں گے ۔ ان چند فقروں میں اس بنیے بلکہ پوری بنیا برادری کی روح کھنچ کر آ گئی ہے ۔

فیض صاحب نے شرر پر ایک مقالہ لکھا ہے جس میں ایک جگہ وہ شرر کی مکالمہ نگاری پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

> ''ان کے سب کردار ایک ہی زبان میں اور ایک ہی طریقے سے گفتگو کرتے ہیں ۔ اور وہ ان کی اپنی زبان نہیں ، قصہ گو کی زبان ہے ۔ اس میدان میں اگر شرر کا مولوی نذیر احمد سے مقابلہ کیا جائے تو ان دونوں کے ادبی مرتبے کا نہایت صحیح اندازہ ہو سکتا ہے ۔ مولوی نذیر احمد کے مکالموں کا ہر لفظ زندگی اور واقعیت کا رنگ لیے ہوئے ہے ۔ اسی لیے ان کے کردار زندہ اور اپنے اعمال کے ذمے دار معلوم ہوتے ہیں ۔ لیکن شرر کے کردار کٹھ پتلیاں ہیں جو لکھنے والے کے اشارے پر چلتے ہیں اور اس کے بغیر ہاتھ پاؤں نہیں ہلا سکتے ۔ مثال کے طور پر

اس ٹکڑے کا توبۃ النصوح کے کسی صفحے سے
مقابلہ کیجیے ۔ (یہاں انھوں نے شرر کے ایک
ناول میں سے پورے ایک صفحے کا مکالمہ نقل
کیا ہے ، اور پھر لکھتے ہیں) دیکھیے تین مختلف
اشخاص گفتگو کر رہے ہیں جن میں عورت بھی
ہے لیکن ان کے انداز اور الفاظ میں ذرہ بھر
بھی فرق نہیں ہے ۔''

(میزان ۔ ص : ۳۳-۲۳۱)

آج بھی ماشاءاللہ ، شرر کے بہت سے جانشین موجود ہیں ۔
اُن کے سیکڑوں ناولوں میں سے کسی ایک کو اٹھا کر
کھولیے اور توبۃ النصوح کے کسی صفحے سے مقابلہ کیجیے
تو آپ کو دونوں کے مکالموں میں زندہ اور مردے کا فرق
محسوس ہوگا ۔

★

(۴)

نذیر احمد کی ادبی زندگی کا آغاز ایک ایسے نازک دور
میں ہوا ، جب ہمارے با شعور ادیبوں اور شاعروں کو ، آگ
بجھانے والوں کے اضطراب و انہماک کے ساتھ قوم کی اصلاح
میں کرشاں ہونا پڑا ۔ نذیر احمد کے تمام ناولوں میں اس
دور کا مقصدی جوش نمایاں ہے ۔ ناول میں مقصدیت فی نفسہ
کوئی قابل اعتراض بات نہیں ۔ شرط صرف یہ ہے کہ مقصد
کے غلبے سے فن مجروح نہ ہونے پائے ۔ ہنر مند ناول نگار
اپنے پیغام کو پلاٹ اور کرداروں میں اس طرح سمو دیتا ہے
کہ بظاہر کچھ کہے بغیر قارئین کے دل و دماغ چپکے چپکے
اس سے متاثر ہوتے چلے جاتے ہیں ۔ نذیر احمد کے ناولوں

میں پیغام کہانی کا جزو بدن نہیں بن سکا ۔

بعض حضرات بڑی معصومیت سے یہ پوچھ بیٹھتے ہیں کہ آخر نذیر احمد نے انیسویں صدی کے اعلیٰ درجے کے انگریزی ناول نگاروں کی پیروی کیوں نہیں کی ؟ لیکن وہ بھول جاتے ہیں کہ یورپ میں صنعتی انقلاب کے بعد یہ فن برابر ترقی کی منزلیں طے کرتا ہوا ، لگ بھگ ایک صدی ڈیڑھ صدی میں اس مرتبے تک پہنچا تھا اور ہمارے یہاں ابھی تک وہ نیا سماجی نظام رونما نہیں ہوا تھا جس میں عوام ایک نئی تہذیبی قوت بن کر ابھرے اور ان کی کشمکش کی داستان ناول کے روپ میں بیان ہونے لگی تھی ۔ ہاں یہ ضرور ہوا کہ مغربی تہذیب و جدید تعلیم کے اثر سے کلکتہ اور دہلی جیسے مرکزی شہروں میں ذہنی بے داری پیدا ہونے لگی ، جس کے آثار اس دور کی نثر میں ہمیں جا بہ جا ملتے ہیں ۔ لیکن نئی روشنی اور ذہنی بےداری کی لہریں ابھی قدیم دہلی کالج کے تربیت یافتہ نوجوانوں اور غالب ، سرسید ، آزردہ اور صہبائی جیسے دانش وروں کے ایک محدود طبقے سے آگے نہیں بڑھی تھی ۔ اس ذہنی بےداری سے ہمارے فسانوی ادب کو داستان سے ناول تک پہنچنے میں بڑی مدد ملی ۔ تاہم جب ملک کے عام معاشرے میں وہ حالات ہی ناپید تھے جو یورپ میں جدید ناول کی تخلیق و تکمیل میں سازگار ہوئے تو اردو کے ان ابتدائی ناولوں میں مغربی ناول کے وہ فنی محاسن کس طرح پیدا ہو سکتے تھے جو صدیوں کی ترقی کا نتیجہ تھے ۔

پھر کسی صنف ادب کی ترقی کے لیے قارئین کی ایک

ایسی جماعت ضروری ہے جو اس کا صحیح مذاق رکھتی ہو۔ نذیر احمد کے مخاطب جو لوگ تھے اُن کی طبیعت پر "طلسم ہوش ربا" اور "فسانۂ عجائب" کا رنگ چڑھا ہوا تھا۔ چناں چہ نذیر احمد کو مجبوراً اپنے ناولوں کی مقصدی حیثیت کو بھی واضح کرنا پڑا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ وہ اپنے ہر ناول کے دیباچے میں اپنے مقصد کا اعلان کرتے ہیں۔ قصے کے دوران میں اپنے کرداروں کے ہر عمل و رد عمل کی توجیہہ و تعبیر کو اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ واقعات کے بیان ہی پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ ان کے نتائج بھی کھول کر سامنے رکھ دیتے ہیں۔ لیکن اگر ہم اس عہد کے عام قارئین کے ذوق و فہم کی سطح کو پیش نظر رکھیں تو ہمیں نذیر احمد کی ان فنی کوتاہیوں پر ہرگز تعجب نہ ہو۔

★

اوپر ذکر آچکا ہے کہ نذیر احمد جدید علوم کے قدر دان ضرور تھے لیکن جدید نظام تعلیم کے اثرات و نتائج سے بھی بے خبر نہ تھے۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ ایک طرف تو مذہب کو سلسلۂ درس سے خارج کر دیا گیا ہے اور دوسری طرف نئے ماحول کے اثر سے آزادی کی ہوا سروں میں سمائی ہے، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ "لوگ ہر طرح کی قیود سے نکلنے کی خواہش کرنے لگتے ہیں، یہاں تک کہ قید عبودیت سے بھی۔" فسانۂ مبتلا میں انھوں نے اس صورت حال کا تفصیل سے جائزہ لیا ہے۔ (ملاحظہ ہو صفحہ ۱۶۴ تا ۱۷۴ مجلسی ایڈیشن) ان حالات میں نئی نسلوں کی اصلاح کا مسئلہ ایک قومی اہمیت اختیار کر چکا تھا۔ نذیر احمد اس زمانے کی مجبوریوں کو دیکھتے ہوئے اس مسئلے کا اس سے بہتر کوئی حل تجویز نہ کر سکے کہ بچوں کو نئے

طرز کے مدرسوں میں تعلیم دلائی جائے لیکن ساتھ ہی ساتھ گھر میں اُن کی تربیت پر خاص نظر رکھی جائے۔توبۃالنصوح میں تربیتِ اولاد کی اہمیت اور اس فرض سے غفلت کے نتائج دکھائے گئے ہیں۔

نذیر احمد اپنی فنی کوتاہیوں کے باوجود انسانی فطرت کے رمز شناس تھے اور جانتے تھے کہ براہ راست وعظ و تلقین کا خاطر خواہ نتیجہ کبھی برآمد نہیں ہوتا۔ اُن کی اس نفسیاتی بصیرت کا ثبوت خود توبۃ النصوح میں بھی ملتا ہے جو اُن کا سب سے زیادہ واعظانہ ناول کہا جاتا ہے۔ اس ناول میں نصوح کی ناصحانہ باتیں تو بہت ہیں لیکن اُن کی بے اثری بھی دکھا دی گئی ہے۔ کلیم اور صالحہ تو جوان اولاد تھی، نصوح کے کم عمر بیٹے، سلیم و کلیم بھی ماں باپ کی نصیحت نضیحت سے درست نہیں ہوئے، اگر متاثر ہوئے ہیں تو دوسروں کے حسنِ عمل اور حسنِ سلوک سے۔ نذیر احمد نے توبۃالنصوح کے دیباچے میں اس نفسیاتی حقیقت کو مندرجہ ذیل الفاظ میں بیان کیا ہے:

> ”کوئی شخص تربیتِ اولاد کے فرض کو پورا پورا ادا نہیں کر سکتا، تا وقتے کہ وہ خود اپنی شائستگی کا نمونہ اُن کو نہیں دکھاتا۔ پرلے درجے کی بے وقوفی ہے، اولاد کو اپنے کردار نا سزا کی بری مثالیں دکھانا اور اُن سے یہ توقع رکھنا کہ یہ لوگ بڑے ہو کر زبانی پند یا کتابی نصیحت پر کاربند ہو کر صالح اور نیک وضع ہوں گے۔“

نذیر احمد کے ناولوں میں مذہب اور مذہبی اقدار کا ذکر بار بار آتا ہے ، اس لیے کہ یہ کہانیاں جس معاشرے کی عکاسی کرتی ہیں اس کی بنیاد مذہبی عقائد و نظریات پر ہے ، اور اس لیے بھی کہ نذیر احمد بہ حیثیت مسلمان اور ادیب مخلص تھے ، منافق نہ تھے - چوں کہ توبۃ النصوح کا موضوع تربیت اولاد ، ''تلقین حسن معاشرت اور تعلیم نیک کرداری'' ہے اور بہ قول مصنف ''نیکی کو مذہب سے جدا کرنا ایسا ہے جیسے کوئی شخص روح کو جسد سے . . . علیحدہ کرنے کا قصد کرے'' اس لیے اس ناول میں مذہب کا چرچا نسبۃً زیادہ ہے - لیکن مصنف کا یہ دعویٰ بالکل صحیح ہے کہ ''تمام کتاب میں کوئی ایسی بات نہیں ہے جو دوسرے مذہب والوں کی دل شکنی اور نفرت کا موجب ہو '' بلکہ ہم سمجھتے ہیں کہ پورے ناول میں کوئی ایسی بات نہیں جو اسلامی فکر کی حرکیت اور ارتقائی کیفیت کے خلاف یا زندگی کی اعلیٰ اقدار سے متصادم ہو ، کیوں کہ اس کا مصنف اپنے زمانے میں علانیہ طور پر اوہامِ باطل ، تقلیدِ جامد اور رسمی مذہبیت کا کٹر مخالف تھا - اب اگر ڈاکٹر احسن فاروقی صاحب ، "توبۃ النصوح" میں نماز روزے کا ذکر پڑھ کر جز بز ہوتے ہیں اور اپنی خفگی کا اظہار یوں فرماتے ہیں :

> ''مولانا اس خاص قسم کی کٹھ مُلّائیت ہی کو مذہب سمجھتے ہیں جو عام بے تخیّل کٹھ مُلّاؤں میں پائی جاتی ہے -''
>
> (ایضاً ص : ۴۰)

تو اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اسلام کے ان بنیادی ارکان کو

'قصۂ ماضی' سمجھتے ہیں جیسا کہ ایک جگہ لکھتے ہیں :
''زیادہ تر آن کے یہاں وہی باتیں ملتی ہیں جن سے بدلتا ہوا
زمانہ ہم کو اس وقت بہت دور اور بہت آگے لے آیا ہے۔''
(ایضاً ص : ۳۸)۔ نذیر احمد بے چارے نہ تو اتنے ترقی پسند
تھے اور نہ ایسے تجریدی فن کار کہ اسلامی زندگی کا نقشہ
ان ارکان کے بغیر کھینچ دیتے اور اگر وہ ایسا کرتے بھی
تو یہ واقعیت اور فنی صداقت کے خلاف ہوتا ۔

شعر و ادب اور دیگر فنونِ لطیفہ کے بارے میں
نذیر احمد اور اس دور کے افادیت پسند مصلحوں کا نقطۂ نظر
قدیم جا گیر داری عہد کے عیش پرستانہ رجحانات کے خلاف
ایک رد عمل تھا اور اس قسم کا ہر رد عمل ابتدا میں نہایت
شدید ہوتا ہے ۔ بعد میں دعویٰ (Thesis) اور جواب دعویٰ
(Anti-Thesis) کے امتزاج سے ایک معتدل اور معقول روش
نکل آتی ہے ۔ توبۃ النصوح میں نصوح نے کلیم کے کتب خانے
کو آگ لگا دی ۔ اس پر غضب یہ ہوا کہ نذیر احمد کی
بذلہ سنجی کی شہ پا کر علیم بھی اپنا کلیات آتش اور دیوان شرر
اٹھا لایا اور اس نے ''آتش کو دھکتی آگ اور شرر کو جلتے
انگاروں میں پھینک دیا ۔'' اس واقعے نے بعض نقادوں کے
شعلۂ غضب کو ایسا بھڑکایا کہ جب سے اب تک برابر
واسوخت پر واسوخت لکھے جا رہے ہیں ۔ بہرحال یہ تو ماننا پڑے
گا کہ جس شاعری کا موضوع، نذیر احمد کے الفاظ میں ''ہجو ،
مدح بے جا ، عشق و عاشقی کے ناپاک خیالات اور دین اور
اہلِ دین کے تمسخر و استہزا'' پر مشتمل ہے اور جس کے
بارے میں حالی کا قول یہ ہے :

وہ شعر اور قصائد کا ناپاک دفتر
عفونت میں سنڈاس سے جو ہے بد تر

وہ شاعری ، ممکن ہے دور زوال کی ایک تاریخی یادگار کے طور پر پڑھی جائے لیکن اس قابل ہرگز نہیں کہ اسے طلبہ کے درسی نصاب میں شامل کیا جائے ۔ اور نذیر احمد کا منشا یہی ہے کہ نو عمر لڑکوں کو ان زہریلے سانپوں سے نہ ڈسوانا چاہیے ۔ توبۃ النصوح کے باب ششم میں بھی ایک پادری کی زبان سے انھوں نے ایسے فحش اور بے ہودہ ادب کے بارے میں یہی رائے ظاہر کی ہے :

''میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ ایسے پڑھنے سے نہ پڑھنا تمھارے حق میں بہتر ہے ۔ یہ کتاب جو تم پڑھتے ہو تم کو گناہ اور برائی سکھاتی اور بد اخلاقی اور بے حیائی کی خراب راہ دکھاتی ہے ۔''

یہ مسئلہ آج بھی اربابِ تعلیم کی توجہ کا مستحق ہے کہ تعلیم کے ابتدائی مدارج میں شعر و ادب کے ''گلستاں'' کا باب پنجم پڑھانا کہاں تک مناسب ہے ۔

الغرض اگر ہم نظر انصاف سے دیکھیں اور نذیر احمد کے ساتھ کم از کم اتنی رواداری برتیں جتنی سر ولیم میور جیسے متعصب عیسائی نے ، اپنی حکم رانی کے غرے اور تبلیغی جوش کے باوجود برتی تھی تو ہم نذیر احمد کی اس فنی کمزوری کے ساتھ خوبی کا ایک پہلو بھی پائیں گے ۔ ہماری مشرقی زبانوں میں نذیر احمد وہ پہلے فن کار ہیں جنھوں نے اپنے قصوں میں زندگی کے مسائل پر اسلامی فکر کی روشنی میں غور کیا ۔ سر ولیم میور کا وہ دیباچہ ملاحظہ کیجیے جو

کتاب کے آخر میں درج ہے ۔ اسلام کے ایک نکتہ چیں کا یہ اعتراف کوئی معمولی بات نہیں :

''اس کتاب کی افادیت اس لحاظ سے بھی کچھ کم نہیں ہے کہ یہ ہمیں مذہب اسلام کی اعلیٰ قدروں اور نیکی کو فروغ دینے اور بدی کو مٹانے کے رحجانات سے آگہی بخشتی ہے ۔ درحقیقت اس قصے کا مذہبی سانچا بے مثال ہے . . . سماجی اور خانگی زندگی میں مذہب کو ایک فعال عنصر کی حیثیت سے پیش کرنا ، مسلمان مصنفوں کے لیے اچھوتا موضوع ہے ۔''

(۵)

نذیر احمد کے فن کا دوسرا کمزور پہلو اُن کے ناولوں کا پلاٹ ہے ۔ ہمارے قدیم داستان نگاروں کا تخیل اس ارض و سما سے دور ، خیالی دنیاؤں کی سیر کیا کرتا تھا ۔ اس کے برعکس نذیر احمد کا تخیل زمین پر رینگتا ہوا چلتا ہے ۔ معلوم ہوتا ہے کہ حقیقت نگاری کے پیش نظر نذیر احمد ضرورت سے زیادہ محتاط ہو گئے تھے ، گویا پھونک پھونک کر قدم رکھتے تھے کہ کہیں اُن کی کہانیوں میں غیر واقعاتی عناصر شامل نہ ہو جائیں ۔

توبۃ النصوح کا قصہ ایک انگریزی ناول ''دی فیملی انسٹرکٹر'' (The Family Instructor) مصنفہ ڈینیل ڈی فو ، سے ماخوذ ہے ۔ ۱۸۷۲ء سے ۱۸۷۷ء تک نذیر احمد، اعظم گڑھ میں ڈپٹی کلکٹر رہے ۔ وہاں ایک پادری سے اُن کی دوستی ہو گئی ۔ 'موعظۂ حسنہ' کے ایک خط (نمبر ۲۷) میں اس پادری

سے بائیبل پڑھنے کا ذکر انہوں نے کیا ہے ۔ (ص : ۸۷ ۔ مجلسی ایڈیشن) چوں کہ مذکورہ ناول عیسائیت کی تبلیغ کے لیے لکھا گیا تھا لہذا پادریوں اور مبلغوں کے حلقے میں عرصے تک مقبول رہا ۔ میرا خیال ہے کہ انھی پادری صاحب کے ذریعے نذیر احمد اس ناول سے متعارف ہوئے ۔ جس خوبی سے یہ انگریزی قصہ ، ہندوستان کے معاشرتی سانچے میں ڈھالا گیا ہے ، اس کی داد کچھ وہی لوگ دے سکتے ہیں جن کی نظر سے اصل کتاب گزر چکی ہو ۔ اس کے واقعات خشک اور کردار بے جان ہیں ۔ توبۃ النصوح کا سارا معاشرتی پس منظر، بیشتر دل چسپ واقعات اور تمام اہم کردار نذیر احمد کی اپنی تخلیق ہیں ۔ ڈاکٹر محمد صادق صاحب ، جنھوں نے توبۃ النصوح کے انگریزی ماخذ کا سراغ لگایا ہے ، اپنے مقالے میں رقم طراز ہیں :

”نذیر احمد نے اپنا پلاٹ ڈی فو سے لیا ہے لیکن اس کا ناول ڈی فو کے قصے سے بدرجہا بہتر ہے ۔ جس طرح شیکسپیئر نے پیش پا افتادہ کہانیاں لے کر انھیں اپنے ڈراموں میں کہیں کا کہیں پہنچا دیا ہے ، اسی طرح نذیر احمد نے ڈی فو کے مدھم اور ادھورے نقوش میں ایک نئی جان ڈال دی ہے ۔“ (ماہ نو ، دسمبر ۵۴ء ۔ ص : ۱۷)

انگریزی ناول کے اس خاکے میں نذیر احمد نے اپنے تخیل سے جو رنگ بھرا ہے وہ یقیناً زندگی کے حقیقی تجربات سے مستعار لیا گیا ہے ۔ مثلاً ناول کی ابتداء میں وبا کا بیان پڑھتے ہی ہمیں یاد آ جاتا ہے کہ ناول کی تصنیف سے کل بارہ برس پہلے (۱۸۶۱ء کی گرمیوں میں) دھلی میں ہیضے کی

وبا اس شدت سے پھیلی تھی کہ مرزا غالب نے تاریخ وفات پیشگی کہہ لینے کے باوجود اس وبائے عام میں مرنا گوارا نہیں کیا ۔ فصل یازدہم میں ایک مولوی صاحب کو ریاست دولت آباد کا صدر اعظم دکھایا گیا ہے ۔ شاید کسی کو یہ گمان گزرے کہ مصنف نے یہاں کوئی ان ہونی بات بیان کر دی ہے ۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس زمانے میں بھوپال ، حیدر آباد اور کئی دیسی ریاستوں میں پرانے طرز کے علماء مدار المہام ، وزیر اور وزیر اعظم کے عہدوں پر متمکن تھے ۔ نذیر احمد کے عزیزوں ، دوستوں اور آشناؤں میں سے کئی ایک جانی پہچانی شخصیتیں ناول کے مختلف کرداروں میں منعکس ہوئی ہوں گی لیکن یہاں اس موضوع پر تفصیل سے روشنی ڈالنا ممکن نہیں ۔ کہنا صرف یہ ہے کہ پلاٹ کی ترتیب و تشکیل میں نذیر احمد کا تخیل تجربے و مشاہدے کی حدود سے بہت کم آگے بڑھتا ہے اور چوں کہ توبۃ النصوح میں قصے کا خاکہ انگریزی ناول سے ماخوذ ہے لہذا اُن کا تخیل یہاں یوں بھی رشتہ بپا نظر آتا ہے ۔

نذیر احمد کے ابتدائی ناولوں میں قصے کی وحدت تقریباً مفقود ہے ۔ توبۃالنصوح میں بھی ، اگرچہ یہ کیفیت تو نہیں کہ واقعات کی کڑیاں علت و معلول کے ایک ہی رشتے میں پروئی ہوئی ہوں اور ہر واقعہ پچھلے واقعات کا منطقی نتیجہ ہو ، لیکن چوں کہ تمام واقعات نصوح کے مرکزی کردار اور ایک ہی خاندانی ماحول سے مربوط ہیں ، اس لیے کثرت میں وحدت کی صورت نکل آئی ہے ۔ اسی بنا پر اسے اردو کا پہلا ناول کہا جاتا ہے ۔ نذیر احمد کے قصوں کا آغاز نہایت بے ساختہ اور دل کش ہوتا ہے ۔ توبۃالنصوح کا آغاز بھی

ایسے بے تکلف اور حسین پیرائے میں ہوا ہے کہ اس قصے کے لیے اس سے بہتر آغاز قیاس میں نہیں آتا ۔ آگے چل کر واقعات اور جزئیات کی ترتیب سے قدرے کشمکش اور تذبذب کی کیفیت بھی پیدا ہو جاتی ہے ۔ لیکن قصے کے خاتمے پر پہنچتے پہنچتے وہ نتائج کو اس طرح کھول کھول کر بیان کرنے لگتے ہیں کہ اُن کی فن کاری کا بھرم کھل جاتا ہے ۔

★

پلاٹ کے جھول جھال اور پھسپھسے پن کے باوجود نذیر احمد کے ناول غیر دل چسپ نہیں ہوتے، کیوں کہ اُن کا شگفتہ انداز ، بے تکلف لہجہ اور محاکاتی اسلوب ، دیگر فنی کوتاہیوں کی تلافی کرتا جاتا ہے ۔ اُردو ناول پر نذیر احمد کا سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ انھوں نے ابتدا ہی میں اُسے ایک ایسی زبان بخش دی جو عوامی زندگی کی ترجمانی کے لیے بہت موزوں تھی ۔ اُردو کے ابتدائی ناول نگاروں میں سے سرشار نے تو 'سرور مہرور' کی پیروی میں انشاپردازی کو اپنا مطمح نظر بنایا ۔ شرر نے بھی رنگیں بیانی میں زور قلم صرف کیا ۔ لیکن نذیر احمد ایسی برجستہ اور بے ضغطہ زبان لکھتے ہیں جس میں شرفاء کے روز مرے اور محاورے کے علاوہ عوامی بول چال کی بہت سی غلط ترکیبیں اور بندشیں ، غلط‌العام ہی نہیں ، غلط‌العوام الفاظ و محاورات بھی بے تکلف استعمال ہوئے ہیں ۔ نذیر احمد اس گر سے واقف تھے کہ قصہ کہانی میں بعض اوقات فصیح و شستہ زبان سے ، عوام کی بگڑی ہوئی زبان ہی زیادہ موزوں ثابت ہوتی ہے ۔

نذیر احمد کو عوام و خواص ، ہر طبقے کے روز مرے

پر دسترس حاصل تھی - پھر وہ عورتوں کی مخصوص زبان
اور لہجے پر بھی عبور رکھتے تھے - معاشرتی زندگی کے ہر
شعبے اور ہر فن مثلاً بٹیر بازی ، پتنگ بازی ، شطرنج ،
گنجفہ ، کھانوں اور کپڑوں کے اقسام یا عدالت ، کچہری
اور مختلف علوم جیسے طب ، نجوم ، فلسفہ و منطق وغیرہ
کی اصطلاحیں اُن کے نوک زبان تھیں - الفاظ و محاورات کے
اس وسیع اور متنوع ذخیرے سے انھوں نے واقعہ نگاری اور
کردارنگاری میں بہت کام لیا ہے - کرداروں کی ذہنی سطح
اور حالات کے تنوع کے ساتھ اُن کی تحریر میں بھی جزر و مد
کی کیفیت پیدا ہوتی رہتی ہے - مثلاً اگر ایک کردار عالمانہ
انداز سے بحث و استدلال میں محو ہے تو دوسرا دھلی کے
کرخنداروں کی زبان اور عامیانہ لہجے میں گفتگو کر رہا ہے -

بعض اوقات جہاں اُن کے مکالموں یا عام بیانات میں
خطابت کا رنگ آ گیا ہے وہاں مترادف الفاظ کی بھر مار ہوتی
ہے - ہم وزن لفظوں اور قافیوں کے کھٹکے بھی پیہم سنائی دیتے
ہیں - مترادفات کا استعمال ، بقول سید عابد علی عابد " ایک
شہ سوار کے پیچھے بہت سے چھوٹے چھوٹے سواروں کو دوڑانے
کا کھیل ہے" اور عربیت زدہ انشا پرداز اس کھیل کے بہت
شائق ہوتے ہیں - لیکن یہ قافیہ پیمائی اور مترادفات کی
بہتات ، نذیر احمد کے اسلوب کا حسن نہیں ، عیب ہے - دھلی
کے ادیبوں میں سے جن اصحاب نے نذیر احمد کی تقلید کی
در اصل وہ اسی انداز کی تقلید کر سکے - مولانا راشدالخیری
کی تحریر میں لفظ و معنی کی بے لطف تکرار اور مترادفات کی
بھر مار ، اسی تقلید کا نتیجہ ہے -

نذیر احمد کی تحریر کا اصل جوہر وہ شگفتگی اور

شوخی ہے جو اُن کے ناولوں میں ، بذلہ سنجی ، نکتہ آفرینی
پھبتی اور طنز و مزاح کی مختلف صورتوں جلوہ گر ہوتی ہے۔
توبۃالنصوح کا پہلا ہی جملہ ، جہاں حکیم بقا کے کوچے میں
موت کی گرم بازاری کا ذکر ہے ، بذلہ سنجی کی عمدہ مثال ہے
(بہ خوف طوالت مثالیں کم از کم دی جا رہی ہیں ۔)
پھبتی بازی میں بھی کوئی ادیب نذیر احمد کا مقابلہ نہیں
کر سکتا ۔ 'لقا کبوتر کا پٹھا' (کلیم کی اکڑفوں پر)
'چھلا ہوا کسیرو' (سلیم کے منڈے ہوئے سر کے لیے)
'مردہ شو ، قلاوزی ، مسجد کا ٹکڑ گدا' (ملایان مسجد
کے لیے) ، 'کلھیا جتنا گھر' (پڑوسن کے تنگ مکان کے لیے)
اور اسی طرح کے بے شمار مزاحیہ فقرے اور پھبتیاں موقعے
موقعے سے آئی ہیں ۔ نذیر احمد کی شوخیٔ طبع ، بسا اوقات
طنز کے روپ میں ظاہر ہوتی ہے ۔ ناول کے کرداروں کی
ذہنی و اخلاق نا ہمواریوں اور بد اطواریوں کا مضحکہ تو
وہ اڑایا ہی کرتے ہیں ، ان کے علاوہ مذہب فروش ملا ،
ریا کار دیندار، نیم حکیم خطرۂ جان ، ناقص مدعیان علم و فن
نکھٹو اور نکمے لوگ ، انگریز بہادر اور اُن کے اندھے مقلد،
سب باری باری نذیر احمد کے طنز و طعن کا نشانہ بنتے ہیں۔
مثلاً توبۃالنصوح کے دوسرے باب میں روزوں سے بچنے کی
ترکیب کے ضمن میں طبیبوں کا ذکر ہے جن کے نزدیک
دنیا میں کوئی تندرست ہی نہیں ۔ "ملاقات کرنے جاؤ تو
پان کے عوض نسخہ حوالے کر دیتے ہیں ۔ ایک دفعہ دوا
پی اور روگ لگا ۔" کلیم ایک جگہ اپنی ماں سے شکایۃً کہتا
ہے کہ اگر مسجد کا ملا بنانا تھا تو شروع ہی سے مجھے
ایسی تعلیم دی ہوتی تا کہ "کہیں مردہ مر جاتا ، جانے نماز

مجھ کو ملتی - کہیں قربانی ہوتی ، کھال میرے پاس آتی - صدقے کا مین آڑھتیا ہوتا ، زکواۃ کا ٹھیکیدار - دعوتوں کا مستحق ، خیرات کا حق دار - نہ یہ کہ پڑھاؤ کچھ ، پوچھو کچھ . . .'' اس طنز کی نشتریت کسی تبصرے کی محتاج نہیں !

نذیر احمد کے اسلوب کی سب سے نمایاں خصوصیت ، موزوں ترین لفظوں کا انتخاب و استعمال ہے - وہ کسی حالت کو بیان کرنے یا کسی مطلب کے ادا کرنے کے لیے شاعرانہ رنگیں بیانی یا بے جا لفاظی سے کام نہیں لیتے بلکہ نہایت سلیقے سے زندہ اورے اور مصورانہ استعارے استعمال کرتے ہیں - کبھی لفظوں کے صوتی اثر سے مفہوم کو اجاگر کرتے ہیں کبھی عام بول چال کے مبتذل اور عامیانہ الفاظ ایسے موقعے سے جڑ دیتے ہیں کہ اس حالت یا کیفیت کی تصویر کھنچ جاتی ہے - چند مختصر مثالیں ملاحظہ ہوں :

۱ - ''نصوح کو اس حالت میں بیٹھے ہوئے دیکھ کر سب کے کلیجے دھک سے رہ گئے - ۲ - جی ہی جی میں کہتی تھی کہ ذرا بھی اس بھڑوں کے چھتے کو چھیڑوں گی تو میرا سر مونڈ کر بھی بس نہیں کرے گی - ۳ - سب سے پہلے تو اس نے دے دھواں دھوں اپنے معصوم بچے کو پیٹ ڈالا - ۴ - اب کوئی گھر آ کر تھوکتا بھی نہیں - گھر ہے کم بخت اکیلا پڑا بھائیں بھائیں کرتا ہے - ۵ - غرض دیکھا تو مرزا صاحب اس ہئیت کذائی سے چھیلا بنے ہوئے سر بازار چھم چھم کرتے چلے جا رہے

ہیں ۔ ٦ ۔ یہ تو اس توقع سے خوشی خوشی
اندر گیا کہ بانکے ٹیڑھے ، رنگیلے سجیلے ،
وضع دار لوگ دیکھنے میں آئیں گے مگر جا کر
دیکھتا ہے کہ ریشائیل سولوی پگڑ اور عمامے
باندھے بیٹھے ہیں ۔''

پرسی لیوبک نے ناول نگار کے بیانیہ اسلوب کو
سلولائیڈ سے تشبیہ دی ہے کہ اس کے ذریعے ہم افراد اور
ان کی مختلف کیفیات کو زندہ اور متحرک صورت میں
دیکھتے ہیں ۔ مندرجہ بالا اقتباسات میں آخری دو مثالیں
ایسی ہیں جہاں مختلف کرداروں کی ساکن اور متحرک
تصویریں آنکھوں کے سامنے آ گئی ہیں ۔ اس قسم کے طویل
مصورانہ بیانات ، بعض اوقات اصل قصے سے کچھ زیادہ
ربط نہیں رکھتے ، لیکن در اصل یہی وہ ٹکڑے ہیں جو
نذیر احمد کے ناولوں کو معاشرتی زندگی کا ایک جیتا جاگتا
مرقع بنا دیتے ہیں اور یہیں نذیر احمد کے محاکاتی اسلوب کا
کمال نظر آتا ہے ۔

★

اس تمام بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ توبۃالنصوح اپنی
بعض فنی خامیوں کے باوجود ، اردو ناول کے ابتدائی دور کی
ایک قابل قدر تخلیق ہے ۔ یہ ناول ہمارے فسانوی ادب میں
ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے ۔ کیوں کہ یہیں سے
قصہ گوئی کا فن (واقعیت اور تعمیری وحدت دونوں اعتبار
سے) داستانی حدود سے آگے بڑھ کر ناول کے دائرے میں
داخل ہو جاتا ہے ۔ اس کے مکالمے اتنے جاندار اور فطری
ہیں کہ انیسویں صدی کا کوئی ناول نگار اس سے بہتر مکالمے

نہیں لکھ سکا۔اس کے کرداروں کے نام علامتی ہوں تو ہوں لیکن سب کے سب زندہ اور متحرک نظر آتے ہیں ۔ مقصدیت کے باوجود اس کی دل چسپی کا یہ عالم ہے کہ جہاں سے پڑھیے ، ''کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا این جا ست ۔''
اس زمانے میں اردو نثر کی بساط کو مد نظر رکھتے ہوئے فن ناول کی اس اٹھان پر ہمیں حیرت ہوتی ہے ۔ لیکن اس سے زیادہ حیرت کی بات یہ ہے کہ ڈاکٹر احسن فاروقی صاحب توبۃالنصوح کو (جسے وہ خود ہی قصہ گوئی کا آسانی صحیفہ قرار دے چکے ہیں) سرے سے ناول تسلیم ہی نہیں کرتے ۔ آپ آن کی تصنیف ''اردو ناول کی تاریخ و تنقید'' ملاحظہ فرمائیے تو آپ دیکھیں گے کہ ڈاکٹر صاحب کی 'ضرب کلیمی' سے کوئی ناول نگار سلامت نہیں بچا ۔ لیکن اس طرز تنقید کو محض ذہنی عدم توازن کا نتیجہ قرار دینا صحیح نہ ہوگا ۔ آن کی تازہ ترین تصنیف ''ادبی تخلیق اور ناول'' سے یہ نکتہ آشکار ہوا کہ در اصل ڈاکٹر فاروقی صاحب فن ناول میں اولیت کا تاج اپنے سر پر رکھنا چاہتے ہیں ۔ ''لا'' سے ''الا'' تک پہنچنے میں فاروقی صاحب کو استدلال کی جن منزلوں سے گزرنا پڑا آس کی تفصیل درج ذیل ہے :

۱ ۔ اپنی تاریخی تنقید کے دس برس بعد 'ادبی تخلیق اور ناول' میں انھوں نے ''لا'' کی پرانی گردان کا اعادہ کیا ہے ۔ ملاحظہ ہو : ''اردو میں ناول کا فن ابھی تک اپنے ابتدائی مدارج ہی طے کر رہا ہے ۔ ہمارا وہ دور ہے جو انگریزی فسانہ نویسی کا بنین اور فیلڈنگ کے درمیان تھا ۔'' (ادبی تخلیق اور ناول ۔ ص : ٦۱) ۔ ''میری اس رائے سے شاید اتفاق نہ کیا جائے کہ اردو میں ابھی تک ناول وجود

ھی میں نہیں آئی ہے ۔'' (ایضاً ۔ ص : ۹۶)

۲ ۔ اپنے عجیب و غریب دعووں کو منوانے کے لیے اُردو کے تمام نقادوں کو ناول کے فن سے بے بہرہ قرار دیا اور اُن کے مقابلے میں اپنی فضیلت کا رعب جمایا ہے ۔ ملاحظہ ھو :

''ھمارے پروفیسران ادب ناول کے بابت ٹکی بندھی باتیں بھی تک سے کہنا نہیں جانتے ۔ ممکن ہے کہ میرے قصوں میں دل چسپی لیتے لیتے ... وہ ناول کو پوری طرح سمجھنے کے اھل ھو جائیں ۔ (ایضاً ۔ ص : ۷۳) ''ھمارا عالم ادب یا نقاد یہ شعور نہیں رکھتا کہ فلاں ناول تخلیقی ہے کہ نہیں'' (ص : ۶۶) '' ھمارے ناول نگار اور ناول کے نقاد دونوں کو شعور چھو کر نہیں گزرا ۔ تخلیق کی دنیا سے دونوں بے بہرہ ھیں ۔'' (ص : ۶۷) ''میں نے کبھی پست درجے کی کوئی ناول نہیں پڑھی ... پھر انگریزی ناول پڑھانے والا بھی مجھے ایسا شخص ملا جو ھندوستان میں ایک تھا ... شاید اُردو کا کوئی ناول نگار مجھ سے زیادہ ناول کے فن سے کبھی واقف ھوا ھو ۔'' (ص : ۷۳)

۳ ۔ فاروقی صاحب نے اپنی تاریخی تنقید میں یہ رائے ظاھر کی تھی کہ اُردو ناول کی فنی تکمیل کے لیے ایک فیلڈنگ کی ضرورت ہے (تاریخی تنقید ۔ ص: ۲۹۵) ۔ یہاں اس ضرورت کا دوبارہ اظہار یوں کیا ہے : ''ناول کو اب تک کوئی راہ نہیں ملی ہے وہ اب تک اپنے فیلڈنگ کی تلاش میں ہے ۔'' (ایضاً ۔ ص: ۶۲) ۔ پھر اشارۃً فیلڈنگ کے ظہور کی پیش گوئی بھی فرمائی : ''شاید وہ آ بھی گیا ھو ۔ ھمیں اس کی پہچان نہیں ہے ۔'' (ص : ۶۳)

۴ ۔ فاروقی صاحب نے لوگوں کو اردو ناول کے فیلڈنگ کی پہچان بھی بتا دی ۔ فیلڈنگ ، ناول نگار بھی تھا اور فن ناول کا شارح و نقاد بھی ۔ فاروقی صاحب کئی اعلی درجے کے ناول لکھ چکے ہیں اور اب ملک میں ناول کا فنی شعور پیدا کرنے کے لیے تنقیدی کتب و مقالات بھی تصنیف فرما رہے ہیں ۔ چناں چہ ارشاد ہوتا ہے : "تجدید کرنے والے ناول نگار کے لیے ناول کا نقاد ہونا بھی لازمی ہے . . . فیلڈنگ کی "جوسف اینڈ روز" پہلی مستند ناول ہے ، تو اس کا مقدمہ ناول کے فن پر پہلی مستند تنقید ہے . . . ہر کام کے لیے پہلا قدم اٹھانے والے کی ضرورت ہوتی ہے اور ناول کے سلسلے میں میں ہی کیوں نہ قدم اٹھاؤں . . ." (ص : ٦٨)

۵ ۔ جہاں تک فن ناول نگاری کا تعلق ہے فاروقی صاحب اپنے ناول "شام اودھ" کو فیلڈنگ کے "ٹوم جونس" کا جواب اور اردو میں پہلا مکمل ناول قرار دیتے ہیں ۔ انھوں نے اشارہ و کنایہ کو ناکافی سمجھتے ہوئے اپنے فنی مرتبے کی وضاحت بھی کر دی ہے تاکہ ملک کے بے بصر نقاد ، اردو ناول کے مسیح موعود کو پہچاننے میں غلطی نہ کریں ۔ ملاحظہ ہو :

"میں علم نفسیات میں بھی ایم۔اے کی ڈگری رکھتا ہوں اور جتنے کردار میرے قصوں سے وابستہ ہیں سب کے نفسیات سے میں گہرے طور پر واقف ہوں ۔ اس لیے میرے قصوں میں کردار بھی اہم اور زندہ ہوگئے ہیں ۔" (ص : ۵۲)

(اپنے ناول "شام اودھ" کا ڈھنڈورا پیٹتے ہوئے فرماتے ہیں) "غرض اس قصے میں فن ، نفسیات ، فلسفہ ، شاعری سب کچھ آ گئی ہے ... اب بھی جب کبھی لے کر بیٹھ جاتا ہوں تو یہ محسوس نہیں ہوتا کہ یہ میری تصنیف ہے ، بلکہ غالب کا یہ شعر یاد آتا ہے :

دیکھو تو دل فریبیٔ انداز نقش پا
موجِ خرامِ یار بھی کیا گل کتر گئی

میں قصے گو کی حیثیت سے پورا پورا کام یاب ہوں ۔ شاید آردو کا کوئی ناول نگار ... اتنا کام یاب ہوا ہو ۔ مجھے ترقی پسندوں سے ضد ہو گئی تھی ۔ مگر اس ناول سے زیادہ ترقی پسند ادب کی روح تک کوئی تصنیف نہیں پہنچتی ... اب بارہ برس کے بعد اس کی اہمیت اور مقبولیت نے مجھے اتنی ہمت دے دی ہے کہ بغیر کسی جھجھک کے اپنے منہ میاں مٹھو بنتا چلا جاؤں اور لوگ میری ہاں میں ہاں ملاتے دکھائی دیں !" (ص : ۴۵-۴۶) ۔

اب میں اس امر کا فیصلہ آپ ہی پر چھوڑتا ہوں ۔ خواہ توبۃالنصوح اور اس کے مصنف کے بارے میں ، سوچ سمجھ کر کوئی منصفانہ رائے قائم کیجئے ، خواہ ان "میاں مٹھو" کی ہاں میں ہاں ملاتے چلے جائیے ۔

اپریل ۱۹۶۴ء افتخار احمد صدیقی
لیکچرار شعبۂ آردو
یونیورسٹی اورینٹل کالج ۔ لاہور

دیباچہ

الٰہی ، خلعتِ ہفت پارچۂ[1] حواس خمسہ و عقل و روح سے سرفرازی دی ہے تو منصبِ ایمان داری بھی عطا کر کہ خطابِ اشرف المخلوقات میری حالت کے مناسب ہو۔ خدا وندا اپنے حبیب کا اُمّتی بنانے سے امتیاز بخشا ہے تو تقربِ عبادت بھی نصیب کر کہ الطافِ کریمانۂ شفاعت اور عواطفِ خسروانہ رحمت کی مجھ کو قابلیت ہو۔

آدمی اگر اپنی حالت میں تأملِ صحیح کرے تو اس سے زیادہ عاجز و درماندہ و مبتلا کوئی مخلوق نہیں۔

گرت چشمِ خدا بینی بہ بخشند
نہ بینی ہیچ کس عاجز تر از خویش[2]

کُلہم ساٹھ یا ستّر برس تو بہ اعتبارِ اوسط اس کی میعادِ حیات اور اس کی مدتِ قیام و ثبات ہے۔ وہ بھی شروع سے آخر تک ہر لحظہ عرصۂ خطر ، ہر لمحہ ہدفِ آفت۔ آدھی عمر تو سونے اور کاہل اور بے کار پڑے رہنے میں ضائع

---

۱ - وہ خلعت جو سات اشیاء پر مشتمل ہوتا تھا۔ بارگاہ خدا وندی سے انسان کو پانچ حواس (باصرہ ، سامعہ ، شامہ ، ذائقہ اور لامسہ) کے علاوہ عقل اور روح ، یہ کل سات نعمتیں عطا ہوئی ہیں۔ ان سب کو مصنف خلعت ہفت پارچہ سے تشبیہ دیتا ہے۔

۲ - اگر تجھے خدا کو دیکھنے والی آنکھ بخشی جائے تو اپنے آپ سے زیادہ بے بس و مجبور تو کسی کو نہ پائے گا۔

کر دیتا ہے - باقی بچے تیس یا پینتیس برس ، اسی میں اس کی طفولیت ہے اور اسی میں اس کی جوانی اور پیری - کم سے کم دس برس طفلی اور درماندگی ، علالت و پیری کے بھی سمجھ لینے چاہئیں - غرض ساری زندگی میں بیس یا پچیس برس کام کاج کے دن ہیں - مگر کتنے کام ، کتنی ضرورتیں ، کس قدر بکھیڑے ، کتنے مخمصے ؛ خدا کی پرستش ، مذہب کی تلاش ، کسبِ کمال ، فکرِ معاش ، بزرگوں کی خدمت ، اولاد کی تربیت ، بیماروں کی عیادت ، احباب کی زیارت ، تقریبات کی شرکت ، شہروں کی سیر ، ملکوں کی سیاست ، مُردوں کا رونا ، جدائی کا ماتم ، مولد کی خوشی ، ملاقات کی فرحت ، دفعِ مضرت ، جلبِ منفعت ، گزشتہ کا احتساب ، آئندہ کا انتظام ، مسرتِ بے ہودہ ، ہوسِ نام و نمود ، تأسفِ نقصان ، حسرتِ زیان ، تلافیِ مافات ، پیش بینی ماھوات[۳] ، دوستوں سے ارتباط ، دشمنوں سے احتیاط ، آبرو کا حفظ ، ناموس کا پاس ، مال کی نگہداشت ، محاصل کا احراز -

زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے
ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے

اس ضیقِ فرصت پر کاموں کا اتنا ھجوم ، یعنی فراغِ دل مفقود و اطمینانِ خاطر معدوم -

فکرِ معاش ، ذکرِ خدا ، یادِ رفتگاں !
دو دن کی زندگی میں بھلا کوئی کیا کرے

ایک عقل اور دنیا بھر کی ذمہ داری - سچ کہا ہے :

یک عشق و هزار گونه خواری

۳ - ماھوات - جو چیز کہ آنے والی ہو یعنی مستقبل *

اِنّا[۴] عرضنا الامانۃَ علی السمٰوٰتِ والارض والجبال فابَیْنَ ان یحملنھا اشفقن منھا و حملھا الانسانُ انّہ کان ظلوماً جھولاً ط

اس کتاب میں انسان کے اس فرض کا مذکور ھے جو تربیت اولاد کے نام سے مشہور ھے ۔ اس کتاب کے تصنیف کرنے کا مقصود اصلی یہ ھے کہ اس فرض کے بارے میں جو غلط فہمی عموماً لوگوں سے واقع ھو رھی ھے اس کی اصلاح ھو ، اور ان کے ذھن نشین کر دیا جائے کہ تربیت اولاد صرف اسی کا نام نہیں کہ پال پوس کر اولاد کو بڑا کر دیا ، روٹی کمانے کھانے کا کوئی ھنر اُن کو سکھا دیا ، اُن کا بیاہ برات کردیا ، بلکہ ان کے اخلاق کی تہذیب ، ان کے مزاج کی اصلاح ، ان کے عادات کی درستی ، ان کے خیالات اور معتقدات کی تصحیح بھی ماں باپ پر فرض ھے ۔ افسوس ھے کہ کتنے لوگ اس فرض سے غافل ھیں ۔ کوئی شخص تربیت اولاد کے فرض کو پورا پورا ادا نہیں کر سکتا ، تا وقتے کہ وہ خود اپنی شائستگی کا نمونہ ان کو نہیں دکھاتا اور اولاد کے ساتھ اپنا برتاؤ محتسبانہ طور پر نہیں رکھتا ۔ پرلے درجے کی بے وقوفی ھے ، اولاد کو اپنے کردار ناسزا کی بری مثالیں دکھانا اور اُن سے یہ توقع رکھنا

---

۴ - ترجمہ :۔ ھم نے امانت (عقل) کو آسمان ، زمین اور پہاڑوں پر پیش کیا تو سب نے اس کے اٹھانے سے پہلوتہی کی اور اس سے ڈر گئے اور انسان نے اس کو اٹھایا ، کچھ شک نہیں کہ بڑا ھی ظالم اور بڑا ھی نادان تھا *

کہ یہ لوگ بڑے ہو کر زبانی پند یا کتابی نصیحت پر کاربند ہو کر صالح اور نیک وضع ہوں گے ۔ بہت لوگ اولاد کے ساتھ غایت درجے کی شیفتگی پیدا کر لیتے ہیں اور بہ مصداق ''حُبُّکَ الشّئی یُعمی و یُصمّ[۵]'' اولاد کے عیوب پر آگہی نہیں ہوتی اور ہوتی بھی ہے تو عیب کو عیب سمجھ کر نہیں ، بلکہ مقتضائے عمر یا نتیجۂ ذہانت یا دوسرے طور پر اس کی تاویل کر کے ان کی خرابیوں سے در گزر اور چشم‌پوشی کیا کرتے ہیں ۔ اس کتاب میں یہ خاص اہتمام کیا گیا ہے کہ اس طرح کی غلطیوں پر لوگوں کو تنبیہ ہو ۔ یہ کتاب لوگوں کو اس بات کا اچھی طرح یقین کرا دے گی کہ تربیت اولاد ایک فرضِ مؤقت ہے، یعنی لڑکے جب تک کم سن ہیں تربیت پذیر ہیں اور بڑے ہوئے پیچھے ان کی اصلاح مشکل یا متعذر بلکہ محال ہو جاتی ہے ۔

ارادہ یہی تھا کہ بلا تخصیصِ مذہب ، تلقینِ حسنِ معاشرت اور تعلیمِ نیک کرداری اور اخلاق کی ضرورت لوگوں پر ثابت کی جائے ۔ لیکن نیکی کو مذہب سے جدا کرنا ایسا ہے جیسے کوئی شخص روح کو جسد سے یا بُو کو گل سے یا نور کو آفتاب سے یا عرض[۶] کو جوہر سے

---

۵ ۔ کسی چیز کی محبت انسان کو اندھا اور بہرا کر دیتی ہے *

۶ ۔ جوہر قائم بالذات ہوتا ہے لیکن عرض کا وجود جوہر پر منحصر ہے ، لہٰذا جوہر سے الگ ہو کر اس کا وجود قائم نہیں رہ سکتا ۔ مثلاً روح جوہر ہے اور جسم عرض ۔ مصنف کی رائے میں نیکی اور مذہب کے درمیان بھی عرض و جوہر کا رشتہ ہے ۔ مذہب کے بغیر دنیا میں نیکی فروغ نہیں پا سکتی ۔

یا ناخن کو گوشت سے علیحدہ اور منفک کرنے کا قصد کرے ۔ انتظام مذہب ایک امر ناگزیر ہے ، اور ادھر اختلاف مذہب جو اس ملک میں اس کثرت سے پھیلا ہوا ہے کہ گویا ہر کوڑی آدمی ایک جدا مذہب رکھتے ہیں ، ہر شخص آنکھیں دکھا رہا ہے ۔ لوگوں میں بلا کا تعصب آگیا ہے کہ کیسی ہی اچھی بات کیوں نہ کی جائے ، دوسرے مذہب والے اس کی طرف متوجہ نہیں ہوتے ۔ جعلوا اصابعہم فی اذانہم[۷] ۔ مضمون جس کو میں نے ایک فرضی قصے اور بات چیت کے طرز پر لکھا ہے ، مذہبی پیرائے سے تو خالی نہیں اور خالی ہونا ممکن نہ تھا ، لیکن تمام کتاب میں کوئی ایسی بات نہیں ہے جو دوسرے مذہب والوں کی دل شکنی اور نفرت کا موجب ہو ۔ بلکہ جہاں جہاں ضرورت مذہبی کا تذکرہ آگیا ہے وہ ایسے طور کا ہے کہ دوسرے مذہب والے بھی اس طرح عقیدے رکھتے ہیں ۔ صرف اصطلاح و عبادت کا تفرقہ ہے ۔ و لا مشاحۃ فی الاصلاح[۸] ۔ مثلاً مسلمانوں کی نماز، وہی ہندوؤں کی پوجا پاٹ[۹] ہے ۔ مسلمانوں کا روزہ ، ہندوؤں کا برت ۔ مسلمانوں کی زکوٰۃ ، ہندوؤں کا دان پن وَقِس علیٰ ہذا[۱۰] ۔ پس یہ قصہ اگرچہ ایک مسلمان خاندان کا ہے

---

۷ - کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیتے ہیں ۔

۸ - اصلاح کے معاملے میں کوئی تردد نہ ہونا چاہیے ۔

۹ - یہ مشابہت برائے نام ہے ۔ مصنف کا مطلب یہ ہے کہ نماز کی جگہ ہندوؤں میں بھی عبادت کا ایک خاص طریقہ رائج ہے جسے پوجا پاٹ کہتے ہیں ۔

۱۰ - اسی پر اور چیزوں کا قیاس کرلو ۔

مگر بہ تغیر الفاظ ہندو خاندان بھی اس سے مستفید ہو سکتے ہیں۔

خاندان جو فرض کیا گیا ہے ، اس میں دو میاں بیوی ہیں ، تین بیٹے اور تین بیٹیاں ۔ ایک بیٹا اور ایک بیٹی تو پکی عمر کے ہیں اور بیاہے جا چکے ہیں ، اور لاجرم ان کی عادتیں راسخ ، اُن کی خصلتیں کالطبیعۃ ہیں ۔ منجھلا بیٹا ، اگرچہ عمر اس کی بھی کم نہیں ہے لیکن اس نے مدرسے میں تعلیم پائی ہے اور وہ صرف توجہ کا محتاج ہے ، جیسے گھوڑا کہ بے راہ چلا جا رہا ہے ، اس میں رفتار پیدا کرنے کی ضرورت نہیں ، فقط باگ کا موڑ دینا کافی ہے ۔ منجھلی لڑکی کم سن ہے ۔ وہ عمر کے اس درجے میں ہے جب کہ بچوں کی قوت تفتیش و تلاش بہت تیز ہوتی ہے ، اور نقل کرنے کی اُمنگ بر سر ترقی ہوتی ہے ۔ وہ بھولے پن سے اس طرح کے سوالات کرتی ہے اور سادہ دلی سے ایسی ایسی باتیں پوچھتی ہے کہ ماں قائل ہو ہو جاتی ہے ۔ جس طرح پر اس خاندان کے لوگ زندگی بسر کرتے ہوئے فرض کیے گئے ہیں ، وہ ایک سچا بلا تصنع نمونہ ہے جو اس زمانے کے ہر ایک خاندان مدعی شرافت کے طرز ماند و بود کا فرض کیا گیا ہے ۔

رئیس البیت یعنی خاندان کا سرگروہ جس کا نام نصوح ہے ، ایک وبائی ہیضے میں مبتلا ہوا اور اس کی حالت اس قدر ردی ہوتی گئی کہ اس کو اپنے مرنے کا تیقن کرنا پڑا اور چوں کہ اسی وباء میں چند روز پہلے اسی گھر کے تین آدمی مر چکے تھے اور شہر میں موت کی گرم بازاری تھی تو ایسی حالت میں نصوح کا اپنی نسبت تیقن ایک معمولی بلکہ

ضروری بات ہے ۔ نصوح کو ڈاکٹر نے جو اس کا معالج تھا ، خواب آور دوا دی تھی ۔ وہ سو گیا اور اس کے اگلے پچھلے خیالات ایک خواب بن کر اس کے سامنے آموجود ہوئے ۔ خواب جو نصوح نے دیکھا تمام قصے کی جان ہے ۔ حشر اور اعمال نامہ اور حساب قبر کی تکلیف اور دوزخ کا عذاب یعنی قیامت کے حالات جن کا وہ مذہب اسلام کے مطابق معتقد تھا ، خواب میں اس کو واقعات نفس الامری دکھائی دیے ۔ جاگا تو خائف و ہراساں ، بیدار ہوا تو ترساں و لرزاں ۔ خوف کا نتیجہ و ہراس کا اثر جو نصوح پر مترتب ہوا قصے کے پڑھنے سے ظاہر ہوگا ۔ اس نے نہ صرف اپنے نفس کی اصلاح کی بلکہ سارے خاندان کی اصلاح کو اپنے ذمے فرض و واجب سمجھا ۔ چوں کہ خاندان کے سب چھوٹے بڑے اس طرز جدید سے نا آشنا تھے ، کنفس واحدة[11] نصوح کے مقابلے پر کمربستہ ہو گئے اور اس کو بڑی بڑی دقتیں پیش آئیں ۔ چوں کہ نصوح کے ارادے میں استحکام تھا اور وہ حق کی جانب داری کرتا تھا ، وہ غالب آیا ، مگر مشکل سے ؛ اس کو ظفر ہوا ، مگر دشواری سے ۔ اولاد میں جو جتنا عمر رسیدہ تھا اسی قدر عسیرالانقیاد تھا ۔

تربیت اولاد ، جس پر یہ کتاب لکھی گئی ، ایک شعبہ ہے اس عام انسانی ہم دردی اور نفع رسانی کا جو ہر فرد بشر پر ، اس کی استطاعت کی قدر واجب ہے ۔ اس خصوص میں جتنی غفلت اور بے پروائی ہمارے ہم وطنوں سے ہوتی ہے ، اصلی باعث اس ملک کے تنزل کا ہے ۔ لوگ مضمون ہم دردی

---

۱۱ - فرد واحد کی طرح یعنی سب متفق ہو کر ۔

سے اس قدر ناواقف ہیں کہ اس خصوص میں ان کو بچوں کی طرح تعلیم کی حاجت ہے ۔ یہ کتاب اس تعلیم کی ابجد ہے ۔ اس واسطے کہ ایک انگریزی مثل کے مطابق ، خیرات گھر سے شروع ہوتی ہے' اگر اولاد اور خاندان کی اصلاح انسان کے ذمے واجب ہے تو ضرور ان لوگوں کی اصلاح کا بھی وہ ذمہ دار ہے جو بہ تعلق خدمت اس کی نگرانی و حکومت میں ہیں ۔ پھر خدم و عبید کے بعد ''الاقرب فالاقرب''[۱۲] کے لحاظ سے ہمسائے ، پھر اہل محلہ ، پھر اہل شہر ، پھر ہم وطن اور ہم ملک ، پھر مطلق ابنائے جنس ۔

بنی آدم اعضائے یک دیگر اند
کہ در آفرینش ز یک جوہر اند[۱۳]

غرض ہمدردی کا ایک بڑا وسیع مضمون ہے ۔ مگر بالفعل اس کے ابتدائی اور ضروری حصے سے آغاز کیا گیا ہے ۔

واللہ ولی التوفیق[۱۴]

---

۱۲ ۔ جو جتنا قریب تر ہے وہ اپنے حق کے لحاظ سے بھی قریب تر ہے ۔

۱۳ ۔ آدم کی اولاد آپس میں اعضائے جسم کی طرح (باہم مربوط) ہیں ۔ اس لیے کہ ان کی تخلیق ایک ہی جوہر سے ہوئی ہے ۔

۱۴ ۔ توفیق عطا کرنا اللہ کے اختیار میں ہے ۔

فصل اول

ایک برس دھلی میں هیضے کی بڑی سخت وبا آئی - نصوح نے هیضہ کیا اور سمجھا کہ مرا چاھتا ھے - یاس کے عالم میں اس کو مواخذۂ عاقبت کا تصور بندھا - ڈاکٹر نے اس کو خواب آور دوا دی تھی - سو گیا تو وھی تصور اس کو خوابِ موحش بن کر نظر آیا -

اب سے دور ایک سال دھلی میں ھیضے کا اتنا زور ھوا کہ ایک حکیم بقا کے کوچے[1] سے ھر روز تیس تیس چالیس چالیس آدمی چھیجنے لگے - ایک بازار موت تو البتہ گرم تھا ، ورنہ جدھر جاؤ سناٹا اور ویرانی ، جس طرف نگاہ کرو وحشت و پریشانی - جن بازاروں میں آدھی رات تک

---

۱ - دھلی میں قاضی کے حوض کے پاس حکیم بقا کا کوچہ موجود تھا (حیات النذیر - ص ۱۸۴) - نذیر احمد ناموں کے انتخاب میں عموماً کوئی نہ کوئی رعایت رکھتے ھیں - یہاں بقا اور فنا کا تضاد ملحوظ ھے -

کھوے سے کھوا چھلتا تھا ایسے اجڑے پڑے تھے کہ دن دوپہر کو بھی جاتے ہوئے ڈر معلوم ہوتا تھا ۔ کٹوروں[۲] کی جھنکار موقوف ، سودے[۳] والوں کی پکار بند ۔ ملنا جلنا ، اختلاط و ملاقات ، آمد و شد ، بیمار پرسی و عیادت ، بازدید و زیارت ، مہمان داری و ضیافت کی کل رسمیں لوگوں نے اٹھا دیں ۔ ہر شخص اپنی حالت میں مبتلا ، مصیبت میں گرفتار ، زندگی سے مایوس ۔ کہنے کو زندہ پر مردہ سے بدتر ۔ دل میں ہمت نہ ہاتھ پاؤں میں سکت ۔ یا تو گھر میں اٹوانٹی کھٹوانٹی لے کر پڑ رہا یا کسی بیمار کی تیمار داری کی یا کسی یار آشنا کا مرنا یاد کر کے کچھ رو پیٹ لیا ۔ مرگِ مفاجات حقیقت میں انہیں دنوں کی موت تھی ؛ نہ سان نہ گمان ، اچھے خاصے چلتے پھرتے ، یکایک طبیعت نے مالش کی ، پہلی ہی کلی[۴] میں حواسِ خمسہ مختل ہو گئے ۔ اَلّا مَاشَآءَ اللہ[۵] کوئی جزئی بچ گیا تو بچ گیا ، ورنہ جی متلانا اور قضائے مبرم کا آ جانا ۔

---

۲ ۔ دہلی کے چاندنی چوک اور دیگر بازاروں میں ، شام کے وقت سقے کٹورا بجاتے ہوئے ٹھنڈا پانی پلایا کرتے تھے ۔

۳ ۔ دہلی کی بول چال میں سودا کا لفظ ایک خاص مفہوم رکھتا ہے ، یعنی پھل ، مٹھائی ، چاٹ اور کھانے پینے کی دوپہری چیزیں ۔

۴ ۔ پہلی ہی قے میں ۔ اردو میں 'کلی' کے معنی تو ظاہر ہیں ۔ عربی میں اس کے معنی مجموعی ہیں جس کے بالمقابل 'جزئی' کا لفظ آگے آیا ہے یہاں اسی رعایت سے 'کلی' استعمال کیا گیا ہے ۔ جزئی یا جزوی (عوامی لہجے میں ججبی ہو کر) شاذ و نادر کے معنی میں بولا جاتا ہے ۔

۵ ۔ سوا اس کے جسے خدا چاہے ۔

پھر وصیت کرنے تک کی مہلت نہ تھی - ایک پاؤ گھنٹے میں تو بیماری ، دوا ، دعا ، جان کنی اور مرنا سب کچھ ہو چکتا تھا -

غرض کچھ اس طرح کی عالم گیر وبا تھی کہ گھر گھر اس کا رونا[۶] پڑا تھا - دو پونے دو مہینے کے قریب وہ آفت شہر میں رہی مگر اتنے ہی دنوں میں شہر کچھ ادھیا سا گیا - صدہا عورتیں بیوہ ہو گئیں ، ہزاروں بچے یتیم بن گئے - جس سے پوچھو شکایت ، جس سے سنو فریاد - مگر ایک نصوح جس کا قصہ ہم اس کتاب میں لکھنے والے ہیں کہ عالم شاکی تھا ، اور وہ اکیلا شکر گزار - دنیا فریادی تھی اور وہ تنہا مداح - نہ اس سبب سے کہ اس کو اس آفت سے گزند نہیں پہنچا - خود اس گھر میں بھی اکٹھے تین آدمی اس وبا میں تلف ہوئے - اچھی خاصی طرح گھر بھر رات کو سو کر اٹھے - نصوح نماز صبح کی نیت باندھ چکا تھا - باپ بیٹے وضو کر رہے تھے - مسواک کرتے کرتے ابکائی آئی - ابھی نصوح دوگانہ فرض ادا نہیں کر چکا تھا ، سلام پھیر کر کیا دیکھتا ہے کہ باپ نے قضا[۷] کی - ان کو مٹی دے کر آیا تو رشتے کی ایک خالہ تھی ، ان کو جان بحق[۸] پایا - تیسرے دن گھر کی ماما رخصت ہوئیں - مگر نصوح کی شکر گزاری کا

---

۶ - ماتم برپا تھا - محاورے میں 'رونا' بولا جاتا ہے - یہ محاورہ نواح لکھنؤ میں بھی رائج ہے - مگر پورب والے اس کے ساتھ پٹنا بھی بولتے ہیں - (رونا پٹنا پڑا تھا) -

۷ - مر گئے - یہاں ادا اور قضا کا تضاد ملحوظ ہے -

۸ - جان بحق تسلیم کرنا (اپنی جان خدا کے حوالے کرنا) یعنی مرنا کا مخفف ہے -

کچھ اور ہی سبب تھا ۔ اس کا مقولہ یہ تھا کہ ان دنوں لوگوں کی طبیعتیں بہت کچھ درستی پر آ گئی تھیں ۔ دلوں میں رقت و انکسار کی وہ کیفیت تھی کہ عمر بھر کی ریاضت سے پیدا ہونی دشوار ہے ۔ غفلت کو ایسا کاری تازیانہ لگا تھا کہ ہر شخص اپنے فرائض مذہبی کے ادا کرنے میں سرگرم تھا ۔ جن لوگوں نے رمضان میں بھی نماز نہیں پڑھی تھی، وہ بھی پانچوں وقت سب سے پہلے مسجد میں آ موجود ہوتے تھے ۔ جنھوں نے کبھی بھول کر بھی سجدہ نہیں کیا تھا، ان کا اشراق و تہجد تک بھی قضا نہیں ہونے پاتا تھا ۔ دنیا کی بے ثباتی، تعلقات زندگی کی ناپائداری، سب کے دل پر منقش تھی ۔ لوگوں کے سینے صلاح کاری کے نور سے معمور تھے ۔ غرض ان دنوں کی زندگی اس پاکیزہ اور مقدس اور بے لوث زندگی کا نمونہ تھی، جو مذہب تعلیم کرتا ہے ۔

نصوح یوں ہی دل کا کچا تھا ۔ جب اس نے اول اول ننانوے[۹] کی گرم بازاری سنی تو سرد ہو گیا، اور رنگت زرد پڑ گئی ۔ بہ اسباب ظاہری جو جو تدبیریں انسداد کی تھیں سب کیں ۔ مکان میں نئی قلعی پھروا دی ۔ پاس پڑوس والوں کو صفائی کی تاکید کی ۔ گھر کے کونوں میں لوبان کی دھونی[۱۰] دے دی ۔ طاقوں میں کافور رکھوا دیا ۔ جا بجا کوئلہ

---

۹ ۔ ابتدائی نسخوں میں یہی لفظ موجود ہے ۔ بعد میں اسے بدل کر ''ہیضے'' کر دیا گیا ۔ ''ننانواں'' عورتوں کی زبان میں ہیضے کو کہتے ہیں ۔ یہ لفظ حرف نفی 'ن' اور 'نانوں' (نام) سے مرکب ہے یعنی بے نام ۔ 'سرد ہو گیا' یعنی مایوس و مضمحل ہو گیا ۔ یہاں سرد و گرم کا تضاد اور سرد و زرد کا قافیہ ملحوظ ہے ۔

۱۰ ۔ خوشبو یا علاج کی غرض سے کسی چیز کو جلا کر اس کا دھنواں دینے کو دھونی دینا کہتے ہیں ۔ باتوں باتوں میں وبا سے بچنے کی تمام تدبیریں گنائی جا رہی ہیں ۔

رکھوا دیا - باورچی سے کہہ دیا کہ کھانے میں نمک ذرا تیز رہا کرے - پیاز اور سرکہ دونوں وقت دسترخوان پر آیا کرے - گلاب ، نارجیل دریائی ، بادیان ، تمرہندی ، سکنجبین وغیرہ وغیرہ جو جو دوائیں یونانی طبیب اس مرض میں استعمال کرتے ہیں ، تھوڑی تھوڑی سب بہم پہنچا لیں تاکہ خدانخواستہ ضرورت کے وقت کوئی چیز ڈھونڈنی نہ پڑے - نصوح نے یہاں تک اہتمام کیا کہ انگریزی دوائیاں بھی فراہم کیں - کالرا پل[11] کی گولیاں تو وہیں کوتوالی سے لے لیں - کالرا ٹنکچر الہ آباد میڈیکل ہال سے روپیہ بھیج کر منگوا کر رکھا - آگرے سے ایک دوست کی معرفت کلوروڈائن کی دو شیشیاں خرید لیں - ایک اخبار میں لکھا دیکھا کہ بنارس میں ایک بنگالی حکیم علاج کرتا ہے ، اور سرکار سے جو دس ہزار روپے کا انعام موعود ہے اس کا دعوے دار ہوا ہے - چٹھی لکھ کر اس کی دوا بھی طلب کی - نصوح کو ایک وجہ تسلی یہ بھی تھی کہ ایک طبیب حاذق اسی کے ہمسائے میں رہتا تھا -

گو روسیاہ ہیضے کے توڑ کے واسطے اتنا سامان وافر موجود تھا ، مگر آخر نصوح کا گھر بھی فرشتوں کی نظر سے نہ بچا ، پر نہ بچا - باپ کی اجل آئی تو دوائیں رکھی ہی رہیں - دینے اور پلانے کی نوبت بھی نہ پہنچی کہ بڑے میاں سبکیاں لینے لگے - وہ رشتے کی خالہ کچھ تھوڑی دیر سنبھلی تھیں - لیکن وہ کچھ ایسی زندگی سے سیر تھیں کہ انھوں نے خود خبر کرنے میں دیر کی - غرض دوا ان کو

11 - تین ایلوپیتھی دواؤں کے نام : Cholera Pill, Cholera Tincture, Chlorodyne

بھی نصیب نہ ہوئی ۔ ماما نے البتہ انگریزی یونانی سب طرح کی دوائیں ڈھکوسیں ۔ مگر اس کی عمر ختم ہو چکی تھی ۔ اول اول نصوح کو اپنی احتیاط پر کچھ یوں ہی سا تکیہ ہوا تھا ، مگر جب وبا کا بہت زور ہوا اور اسی کے گھر میں تابڑ توڑ ایک چھوڑ تین موتیں ہوگئیں ، تو ناچار تن بہ تقدیر صبر و شکر کر کے بیٹھ رہا ۔

غرض پورا ایک چلّہ شہر پر سختی اور مصیبت کا گزرا ۔ نہیں معلوم کتنے گھر غارت ہوئے ، کس قدر خاندان تباہی میں آ گئے ، یہاں تک کہ نواب عمدۃالملک نے ہیضہ[12] کیا ۔ کوئی دو تین گھڑی دن چڑھتے چڑھتے شہر میں یہ خبر مشہور ہوئی اور نماز جمعہ کے بعد دیکھتے ہیں تو جنازہ جامع مسجد[13] کے صحن میں رکھا ہے ۔ یوں تو ہزارہا آدمی شہر میں تلف ہوئے مگر عمدۃالملک کی موت سب پر بھاری تھی ۔ اول تو ان کی ٹکر کا شہر میں کوئی رئیس نہ تھا ، دوسرے ان کی ذات سے غریبوں کو بہت کچھ فائدہ پہنچتا تھا ۔ گو ان کے مرنے کا گھر گھر ماتم تھا ، لیکن لوگ یہ بھی کہتے تھے کہ بس اب خدا نے ٹھنڈک ڈالی ، کیوں کہ معتقدات عوام میں یہ بھی ہے کہ وبا بے کسی بڑے رئیس کے بھینٹ لیے نہیں جاتی ۔ خیر لوگوں نے جو کچھ سمجھا ہو ، یوں بھی شورش بہت کچھ فرو ہو چکی تھی ، اور امن و امان ہوتا جاتا تھا ، لوگوں نے دکانیں بھی کھولنی شروع کر دیں اور دنیا کا کاروبار پھر جاری ہو چلا ۔

---

۱۲ - عام محاورہ یہ ہے : فلاں شخص کو ہیضہ ہوا یا وہ ہیضے میں مبتلا ہوا ۔

۱۳ - دہلی میں شاہجہان کی بنوائی ہوئی مشہور مسجد ۔

انھی دنوں نصوح نے اپنی بیوی سے کہا کہ دو مہینے سے چاولوں کو ترس گئے۔ اب خدا نے اپنا فضل کیا ہے آج زردہ پکواؤ، مگر تاکید کرنا کہ چاول کھڑے[۱۴] نہ رہیں۔ شام کو زردہ پکا اور گھر کے چھوٹے بڑے سب نے کھایا اور حسب عادت سو رہے۔ کوئی پہر رات باقی رہی ہوگی کہ دفعۃً نصوح کی آنکھ کھل گئی۔ جاگا تو پیٹ میں آگ پھنکی ہوئی تھی۔ اٹھتے اٹھتے کئی مرتبہ طبیعت نے مالش کی۔ اس نے ننگے سر جلدی سے صحن میں نکل کر ٹہلنا شروع کیا۔ خوب کس کر دونوں بازو باندھے۔ گلے میں توے کی سیاھی تھوپی۔ عطر کا پھویا ناک میں رکھا، اور طبیعت کو دوسری طرف مصروف کیا۔ مگر معلوم ہوتا تھا کہ حلق تک کوئی چیز بھری ہوئی ہے۔ بہتیرا ضبط کیا، بہتیرا ٹالا، آخر بڑے زور سے استفراغ ہوا۔ گھر والے سب جاگ اٹھے۔ نصوح کو اس حالت میں بیٹھے ہوئے دیکھ کر سب کے کلیجے دھک سے رہ گئے۔ کوئی پانی اور بیسن لے کر دوڑا۔ کوئی الائچی ڈال پان بنا پاس آ کھڑا ہوا۔ کوئی پنکھا جھلنے لگا۔ نصوح کو تو لا کر چارپائی پر لٹا دیا اور اب سب لوگ لگے اپنی تجویزیں کرنے۔ کسی نے کہا خیریت ہے غذا تھی۔ کوئی بولا زردے میں گھی برا تھا۔ کوئی کہنے لگا کھرچن کا فساد ہے۔ غرض یہ صلاح ہوئی کہ ہیضہ وبائی نہیں ہے۔ گلاب اور سونف کا عرق دیا جائے اور گھبرانے کی بات نہیں۔ صبح تک طبیعت صاف ہو جائے گی۔

خیر یہ تو تیمارداروں کا حال تھا۔ نصوح اگرچہ تکان

---

۱۴ - خوب گل جائیں۔ سخت یا ادھ کچرے نہ رہیں۔

کی وجہ سے مضمحل ہو گیا تھا ، مگر ہوش و حواس سب
خدا کے فضل سے برجسا تھے ۔ سب کی صلاحیں اور تجویزیں
سنتا تھا ، اور دوا جو لوگ پلاتے تھے پی لیتا تھا ، لیکن
استفراغ ہونے کے ساتھ ہی اس نے کہہ دیا تھا کہ
لو صاحب خدا حافظ ، ہم بھی رخصت ہوتے ہیں ۔ استفراغ
امتلائی مجھ کو بارہا ہوئے ہیں مگر کچھ میرا جی اندر سے
بیٹھا جاتا ہے اور ہاتھوں میں سنسنی سی چلی آ رہی ہے ۔
اتنا کہنے کے بعد تو نصوح دوسری ہی ادھیڑ بن میں
لگ گیا ، اور سمجھا کہ بس اب دنیا سے چلا ۔ صبح ہوتے
ہوتے ردایت کے کل آثار پیدا ہو گئے ۔ برد اطراف ، تشنج و
ضعف ، متلی ، اسہال ، تشنگی ، ہر ایک کیفیت اشتداد پر
تھی ۔ منہ اندھیرے آدمی حکیم کے پاس دوڑا گیا ۔ حکیم صاحب
خود خفقانی المزاج ، ہیضے کے نام سے کوسوں بھاگتے تھے ۔
مگر ہمسائگی ، مدت کی راہ و رسم ، طوعاً و کرہاً آئے اور
کھڑے کھڑے چھدا سا اتار کر چلے گئے ۔ بیمار میں تو
بولنے اور بات کرنے کی بھی طاقت نہ تھی ۔ ایک پہر ہی
بھر کی بیماری میں چارپائی سے لگ گیا تھا ۔ عورتوں نے پردے
میں سے ، جہاں تک اس گھبراہٹ میں زبان نے یاری دی ، کہا ۔
لیکن حکیم صاحب یہی کہے چلے گئے کہ برف کے پانی میں
نارجیل دریائی گھس گھس کر پلائے جاؤ ۔

تیمارداروں کو ایسی سرسری تشخیص اور ایسی رواروی
کی تجویز سے کیا خاک تسلی ہوتی ۔ فوراً آدمی کو شفا خانے
دوڑایا اور ڈاکٹر دوا لیے صدا کی طرح آ موجود ہوا ۔
اوپر تلے چار پڑیاں تو اس نے اپنے سامنے پلائیں ۔ چلتے ہوئے
ایک عرق دیتا گیا کہ پاؤ گھنٹے بعد پلا کر مریض کو

علیحدہ مکان میں اکیلا لٹا دینا ۔ کوئی آدمی اس کے پاس نہ رہے تا کہ اس کو نیند آ جائے ۔ اگر سو گیا تو جاننا کہ بچ گیا ۔ فوراً ہم کو خبر دینا ۔

ڈاکٹر کے حکم کے مطابق نصوح کو اکیلے دالان میں سلا کر لوگ ادھر اُدھر ٹل گئے ۔ مگر دبے پاؤں آ کر دیکھ دیکھ جاتے تھے ۔ نصوح کے دل کی جو کیفیت تھی وہ البتہ عبرت انگیز تھی ۔ یہ کچھ تو بیماری کا اشتداد ہوا ، مگر ہوش و حواس سب بہ دستور تھے ۔ وہ اپنے خیال میں ڈوبا ہوا تھا ، لوگ جانتے تھے کہ غش میں پڑا ہے ۔ ابتدا میں تو نصوح بھی اپنی نسبت مرنے کا تصور کرنے سے گریز کرتا تھا اور نہیں چاہتا تھا کہ اپنے تئیں مرنے والا سمجھے ، بلکہ جو لوگ اس کی علالت کو سوء ہضم اور امتلا کی وجہ سے تجویز کرتے تھے ، دل میں ان کی رائے کی تحسین کرتا تھا ۔ لیکن افسوس یہ مسرت نصوح کو بہت ہی ذرا سی دیر تک نصیب ہوئی ۔ دم بہ دم اس کی حالت ایسی ردی ہوتی جا رہی تھی کہ زندگی کے تمام تر احتمالات ضعیف تھے ۔ آخر چار و ناچار اس کو سمجھنا پڑا کہ اب دنیا میں چند ساعت کا مہمان اور ہوں ۔ اذعانِ مرگ کے ساتھ پہلا قلق اس کو دنیا کی مفارقت کا تھا ۔ وہ جانتا تھا کہ مرنا وہ سفر ہے جس کا انقطاع نہیں ؛ وہ جدائی ہے کہ جس کے بعد وصال نہیں ؛ وہ گم شدگی ہے جس کی کبھی بازیافت نہیں ؛ وہ غشی ہے جس سے افاقہ نہیں ؛ وہ بے گانگی ہے جس کے پیچھے کچھ تعلق نہیں ۔ کبھی وہ بیوی بچوں کو دیکھ کر روتا اور کبھی ساز و سامان دنیا پر نظر کر کے سر کو دھنتا اور کہتا :

حیف در چشم زدن صحبتِ یار آخر شد
روئے گل سیر نہ دیدیم و بہار آخر شد[15]

جس جس پہلو سے غور کرتا تھا ، اپنا مرنا اس کو بے وقت معلوم ہوتا تھا - بیوی کو دیکھ دیکھ کر اپنے جی میں سوچتا تھا کہ بھلا کوئی اس کی عمر بیوہ ہونے کی ہے - نہ تو اس کے میکے میں کوئی اتنا ہے کہ اس کا متکفل ہو ، نہ بیٹوں میں کوئی اس قابل ہے کہ گھر کو سنبھال لے - اندوختہ جو ہے سو واجبی ہی واجبی ہے - کب تک اکتفا کرے گا - دو ناکد خدا بیٹیاں اس کے آگے ہیں - کچا ساتھ خالی ہاتھ ، بچوں کی پرورش ، کہیں سے کوڑی کی آمد کا آسرا نہیں - کیا ہو گا اور کیوں کر یہ پہاڑ زندگی اس کے کاٹے کٹے گی - بڑا لڑکا تو پہلے ہی گویا ہاتھ سے جا چکا ہے - رہا منجھلا ، امسال انٹرنس پاس کرنے کو تھا اور امید تھی کہ یہ کچھ ہوگا مگر اب وہ تمام منصوبہ ہی غلط ہوا چاہتا ہے - میری آنکھ بند ہوئی تو کیسا پڑھنا اور کس کا امتحان - یہ دو لڑکیوں کا فرض کیسا میں اپنی گردن پر لے چلا - بڑی کی نسبت کن کن مصیبتوں سے ٹھہری تھی اور جب میرے رہتے یہ دقت تھی تو اب ان دو بچیوں کا دیکھئے کیا ہو - پیش بینی اور مآل اندیشی کر کے پار سال گاؤں لیا تھا - ابھی تک پٹی داروں نے اس میں اچھی طرح تسلط نہیں بیٹھنے دیا - اب جو چالیس پچاس بیگھہ سیر کر کے نیل بو لیا ہے وہ سب گیا گزرا ہوا - گودام پر جو روپیہ

---

۱۵ - افسوس کہ پلک جھپکتے ہی دوست کی صحبت ختم ہو گئی - ہم نے جی بھر کے پھولوں کا رنگ روپ نہ دیکھا تھا کہ بہار خصت ہو گئی -

لگا دیا تھا وہ بھی ڈوبا ۔ رہنے کے مکان میں کس قدر تنگی سے بسر ہوتی ہے ۔ کوئی مہمان آ نکلتا ہے تو شرمندہ ہونا پڑتا ہے ۔ شمال رویہ دالان در دالان بنوانے کا ارادہ تھا ۔ ڈیرہ دون[۱۶] لکڑی کا روپیہ بھیج چکا ہوں ، وہ نہیں آئی ۔ پزاوے والوں کو اینٹوں کی دادنی دی تھی ، وہ نہیں پٹی ۔ افسوس کہ موت نے مجھے مہلت نہ دی ۔ لوگوں کا لینا دینا ، حساب کتاب ، بڑے بڑے بکھیڑے ہیں ۔ آج سمجھانے بیٹھوں تو مہینوں میں جا کر طے ہوں تو ہوں ۔ اجل سر پر آ پہنچی ۔ تمام لینا لوانا مارا پڑا ۔ اے کاش میں کچھ نہیں تو دس بارہ برس ہی اور جی جاتا تو یہ سب انتظام اپنی خواہش کے مطابق درست کر لیتا ۔ بال بچے بھی ذرا اور سیانے ہو جاتے ، کھانے کمانے لگتے ۔ اُدھر اُن کی شادی بیاہ کر چکتا ۔ گاؤں کا معاملہ بھی روبراہ ہو جاتا ، مکان کو اپنے طور پر بنا لیتا ، لوگوں کا حساب کتاب سب صاف کر دیتا ، گھر والی کے واسطے کچھ ذخیرۂ وافی فراہم کر جاتا ، تب فراغت سے مرتا ۔ کیا مرنے میں مجھ کو کچھ عذر یا خدا نخواستہ کسی طرح کا انکار تھا ، یا میں اتنی ذرا سی بات نہیں سمجھتا کہ دنیا میں آ کر مرنا ضرور ہے ۔ مگر ہر چیز ایک وقت مناسب پر ٹھیک ہوتی ہے ۔ یہ بھی کوئی مرنا ہے کہ ہر ایک کام کو ادھورا ، ہر ایک انتظام کو ناقص و ناتمام چھوڑ کر چلا جاؤں ۔ ایسا بے ہنگام مرنا نہ صرف میرے لیے بلکہ میرے تمام متعلقین اور وابستگان کے لیے موجب زیان و باعث نقصان ہے ۔

---

۱۶ - یوپی کے شمال مغربی علاقے میں ایک خوش منظر ، پہاڑی مقام ۔ مسوری بھی اسی کے قریب واقع ہے ۔

اگرچہ نصوح بہ نظر ظاہر ایک آزاد اور بے گانہ وار زندگی بسر کرتا تھا ۔ نہ تو ہر وقت گھر میں گھسے رہنے کی اس کو خو تھی ، نہ بال بچوں ہی سے کچھ بہت اختلاط کرنے کی عادت ۔ انتظام خانہ داری میں بھی بی بی کے تقاضے اور اصرار سے بہ قدر ضرورت کچھ دخل دیا تو دیا ، ورنہ اس کی بھی چنداں پروا نہ تھی ۔ اور یہی سبب تھا کہ جب بھی سننے کا اتفاق ہوتا کہ فلاں شخص نے بڑی حسرت کے ساتھ جان دی ، تو نصوح کو تعجب ہوتا اور کہتا کہ خدا کی شان ہے ، ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں کہ دنیا سے نکلنے کو ان کا جی ہی نہیں چاہتا ۔ نہیں معلوم دنیا کی کون سی ادا ان کو پسند ہوتی ہے ، ورنہ استغفراللہ[۱۷] ، یہ دارالمحن انسان کے رہنے کے لائق ہے ؟ صدہا بکھیڑے ، ہزارہا مخمصے ، روز کے جھگڑے ، آئے دن کی مصیبت ۔ سچ ہے ، خدا تعالیٰ کا کوئی فعل حکمت اور بندوں کی مصلحت سے خالی نہیں ۔ ظاہر میں تو موت سب کو بری معلوم ہوتی ہے اور اس سے لوگ ایسا ڈرتے ہیں جیسے مجرم سزا سے ، لیکن غور کر کے دیکھو تو مرنا بھی ایک نعمت ہے ۔ انسان کی طبیعت تازگی پسند واقع ہوئی ہے ۔ جہاں ایک حالت سال ہا سال رہی ، گو وہ حالت کیسی ہی عمدہ اور پسندیدہ کیوں نہ ہو ، خواہ مخواہ آدمی اس سے ملول ہو جاتا ہے ۔ حضرت

---

۱۷ - میں خدا سے بخشش کی التجا کرتا ہوں ۔ توبہ و استغفار کا کلمہ جو اردو محاورے میں اظہار عجز و حیرت کے لیے بھی بولا جاتا ہے ۔ دارالمحن : رنج و غم کا گھر ، مراد دنیا ۔

موسیٰ علیہ السلام[18] کے ہمراہی من و سلوا کھاتے کھاتے ایسے اکتائے کہ آخر کو ان کے دل لہسن و پیاز پر للچائے۔ اگر دنیا میں موت نہ ہوتی تو آدمی کنوؤں میں کود کود کر اور درختوں سے گر گر کر جان دیتے اور حیات دراز کو عذاب مقیم سمجھتے ۔ میرے دل کی تو یہ کیفیت ہے کہ مجھ کو یہاں سے چلے جانے کی مطلق پرواہ نہیں ، اور کسی چیز کو میں نہیں سمجھتا کہ مجھ کو اس کی مفارقت کا قلق ہو ۔

لیکن بڑا فرق ہے ، فرض اور واقعات میں ۔ یہ بھی نصوح کے نفس کا مکر تھا کہ وہ اپنے تئیں دنیا سے بے تعلق اور اپنی زندگی کو بے همه و با همه[19] سمجھتا تھا ۔ جب تک وہ دوسروں کو مرتا دیکھتا تھا اپنے تئیں مرنے پر دلیر پاتا تھا ۔ لیکن جب خود اپنے سر پر آن بنی تو سب سے زیادہ بودا نکلا ۔ وہ اپنے تعلقات سے واقع میں اب تک بے خبر تھا ۔ جب موت سامنے آ موجود ہوئی اور چلنا ٹھہر گیا

---

۱۸ ۔ یہاں قرآن مجید (سورۂ بقرہ) کی اس آیت کی طرف اشارہ ہے جہاں اللہ تعالیٰ بنی اسرائیل کی گمراہیوں اور ناشکریوں کا ذکر کرتے ہوئے فرماتا ہے : (ترجمہ)

(اور اے بنی اسرائیل ، وہ وقت بھی یاد کرو) جب تم نے کہا تھا کہ اے موسیٰ ہم سے تو ایک ہی قسم کے کھانے پر نہیں رہا جاتا ۔ آپ ہمارے لیے اپنے پروردگار سے دعاء کیجیے کہ (من و سلویٰ کی جگہ) زمین سے جو چیزیں اگتی ہیں مثلاً ترکاری اور ککڑی اور گندم اور پیاز ہمارے لیے پیدا کرے ۔ ۔ ۔
(سورہ : ۲ آیت : ۶۱)

۱۹ ۔ سب میں رہتے ہوئے بھی سب سے بے نیاز ۔

تو حقیقت کھلی کہ ادھر زن و فرزند کا فریفتہ ہے اُدھر مال و متاع کا دل دادہ ۔ اتنا بڑا تو سفر اس کو در پیش، مگر بارِ علائق کی وجہ سے پہلے ہی قدم پر اس کے پاؤں ہزار ہزار من کے ہو رہے تھے ۔ ریل کی سیٹی بج چکی تھی، مگر یہ ابھی اسٹیشن کے باہر اسباب سنبھالنے میں مصروف تھا ۔ اگر اسی حالت میں، کہ اس کی روح تعلقاتِ دنیوی میں ڈانواں ڈول بھٹکتی ہوئی پھر رہی تھی، کہیں خدا نہ خواستہ اس کی جان نکل جاتی تو بس دونوں جہان سے گیا گزرا ہوا تھا ۔ خَسِرالدنیا وَالآخرۃ[20] ۔ ازیں سُو رانده و ازاں سُو در مانده[21] ۔ مگر خدا نے بڑا ہی فضل کیا کہ نا امیدی نے اس کی ہمت بندھائی اور اپنے دل میں سوچا کہ چلنا تو اب ٹلتا نہیں، پھر قلق سے فائدہ اور اضطراب سے حاصل ۔ مرتا ہوں تو مردانہ وار کیوں نہ مروں، اور استقلال کے ساتھ جان کیوں نہ دوں ۔ اس بات کا ذہن میں آنا تھا کہ دنیا کی تمام چیزوں پر ایک اُداسی چھا گئی ۔ اب جس چیز

---

۲۰ ۔ سورہ الحج (۲۲) کی گیارھویں آیت میں اللہ تعالیٰ اُن لوگوں کا ذکر فرماتا ہے جو اللہ کی عبادت تو کرتے ہیں لیکن ان کی ذہنی کیفیت یہ ہوتی ہے گویا وہ کفر و ایمان کی سرحد پر کھڑے ہیں ۔ جہاں آزمائشیں پڑیں وہ کفر کی طرف لڑھک گئے ۔ اس آیت کا آخری ٹکڑا یہ ہے : خسرالدنیا والآخرۃ ذالک ہوالخسران المبین ۔ ترجمہ : (ایسا شخص اپنے طرز عمل سے) دنیا اور آخرت دونوں کو کھو بیٹھتا ہے ۔ یہ کھلا ہوا خسران یا نقصان ہے ۔

۲۱ ۔ ادھر سے نکالا ہوا اور اُس طرف سے عاجز و دور افتادہ (نہ ادھر کے رہے نہ ادھر کے رہے)

کو دیکھتا ہے ، ہیچ اور بے وقعت نظر آتی ہے ۔ یہ وہ وقت
تھا کہ ڈاکٹر نے اس کو دوا پلوا کر تنہا لٹوا دیا تھا ۔
استغنا سے ایک اطمینان جو دل کو پہنچا اور ادھر علالت
کے اشتداد کا تکان تھا ہی ، اوپر سے پہنچی دوا جو بالخاصہ
خواب آور تھی ، اور تیارداروں کا ہجوم کم ہوا ، لیٹا تو
نیند کی ایک جھپکی سی آگئی ۔

آنکھ کا بند ہونا تھا کہ نصوح ایک دوسری دنیا میں
تھا ۔ جو خیالات ابھی تھوڑی دیر ہوئے اس کے پیش نظر
تھے ، سب اس کے دماغ میں بھرے ہوئے تھے ۔ اب متخیلہ
نے ان کو اگلے پچھلے تصورات سے گڈ مڈ کر کے ایک نئے
پیرایے میں لا سامنے کھڑا کیا ۔ کیا دیکھتا ہے کہ ایک
بڑی عمدہ اور عالی شان عمارت ہے ۔ اور چوں کہ نصوح خود
بھی کبھی ڈپٹی مجسٹریٹ حاکم فوج داری رہ چکا تھا ، تو اس
کو یہ تصوّر بندھا کہ یہ گویا ہائی کورٹ کی کچہری
ہے ۔ لیکن حاکم کچہری کچھ اس طرح کا رعب دار ہے
کہ باوجودے کہ ہزاروں لاکھوں آدمیوں کا اجتماع ہے
مگر ہر شخص سکوت کے عالم میں ایسا دم بہ خود بیٹھا ہے
کہ گویا کسی کے منہ میں زبان نہیں ۔ اور جو کوئی
بہ ضرورت بولتا اور بات بھی کرتا تھا تو اس قدر آہستہ کہ
کانوں کان خبر نہ ہو ۔ اتنی بڑی تو کچہری ہے مگر مختار
اور وکیل کسی طرف دیکھنے میں نہیں آتے ۔ کچہری کے
عملے اس طرح کے کھرے اور اپنے حاکم سے اتنا ڈرتے ہیں
کہ کسی اہل معاملہ اور مقدمے والے کے اپنے پاس تک
آنے کی روا دار نہیں ۔ غرض کیا مجال کہ کوئی "اپنے بارے
میں نا جائز پیروی کر کے یا روپے پیسے کا لالچ دکھا کر

یا سعی سفارش بہم پہنچا کر کار بر آری کر سکے ۔ اگرچہ انصاف اور معاملہ فہمی اور ہمہ دانی کی وجہ سے حاکم کی ہیبت ادنیٰ اعلیٰ سب پر چھائی ہوئی ہے ، مگر جتنے مجرم ہیں ، کیا خفیف کیا سنگین ، کوئی اس کے رحم سے نا امید نہیں ۔ اختیارات اس کے اس قدر وسیع ہیں کہ نہ اس کے فیصلے کی اپیل ہے ، نہ اس کے حکم کا مرافعہ ۔ کام کرنے کا ایسا اچھا ڈھنگ ہے کہ کام روز کا روز صاف ۔ کتنے ہی مقدمے پیشی میں کیوں نہ ہوں ، ممکن نہیں کہ تاریخ مقررہ پر فیصل نہ ہو جائیں ۔ پھر یہ نہیں کہ کسی مقدمے کو روا روی اور سرسری طور پر تجویز[۲۲] کر کے ٹال دیا جائے۔ نہیں ۔ جو حکم صادر کیا جاتا ہے ، ہر عذر کو رفع ، ہر جہت کو قطع ، خود مجرم کو قائل معقول کر کے اور گناہ گار کے منہ سے اس کی خطا تسلیم کرانے کے بعد ۔ غرض

جو تجویز ہے موجّہ ، جو فیصلہ ہے مدلل ، جو رائے ہے حتمی و اذعانی ، جو حکم ہے دودھ کا دودھ ، پانی کا پانی ۔ گواہوں کے باب میں ایسی احتیاط ملحوظ ہے کہ صرف عادل، ثقہ اور راست گو کی گواہی ہی لی جاتی ہے ۔ اور وہ بھی ایسے کہ واقف الحال ، چشم دید ، بلکہ ملزم کے رفیق و ہم نشین ، کہ اس کے راز دار اور معین اور مدد گار ہوں ۔ پھر کیا دیکھتا ہے کہ ہر مجرم کو فرداً فرداً فرد قرار داد جرم کی ایک نقل دی گئی ہے کہ وہ اس کو پڑھ رہا ہے ، اور جتنے الزام اس پر لگائے گئے ہیں سب کو سمجھتا اور

۲۲ ۔ عدالتی اصطلاح میں مقدمے کا فیصلہ کرنا ۔ یہاں کچھ اور اصطلاحیں آ گئی ہیں : 'جہت' : سبب ، دلیل ۔ 'تجویز' : فیصلہ ۔ 'فرد قرار داد جرم' : الزامات کی فہرست ۔ 'زیر تجویز' : عدالت کے زیر غور ، جس کا فیصلہ نہ ہوا ہو ۔

اپنی برأت کے وجوہات کو سوچتا ہے۔

کچہری کا خیال نصوح کو حوالات کی طرف لے گیا، تو دیکھا ہر شخص ایک علیحدہ جگہ میں نظر بند ہے۔ جیسا مجرم ہے اس کے مناسب حالت اس کو حوالات میں سختی یا سہولت کے ساتھ رکھا گیا ہے۔ حوالات کے برابر جیل خانہ ہے، مگر بہت ہی برا ٹھکانا ہے۔ محنت کڑی، مشقت سخت۔ جو اس میں گرفتار ہیں، سولی کے متمنی اور پھانسی کے خواست گار ہیں۔ نصوح یہ مقام ہول ناک دیکھتے ہی اُلٹے پاؤں پھرا۔ باہر آیا تو پھر حوالاتیوں اور زیر تجویزوں میں تھا۔ ان لوگوں میں ہزار ہا آدمی تو اجنبی تھے۔ لیکن جا بہ جا شہر اور محلے کے آدمی بھی نظر آتے تھے، مگر وہ جو مر چکے تھے۔ نصوح کو یہ سب سامان دیکھ کر اسی خواب کی حالت میں ایک حیرت تھی کہ الٰہی یہ کون سا شہر ہے؟ کس کی کچہری ہے؟ یہ اتنے مجرم کہاں سے پکڑے ہوئے آئے ہیں؟ اور میرے ہم وطنوں نے کیا جرم کیا کہ ماخوذ ہیں؟ اور یہ کیسے مرے تھے کہ میں ان کو یہاں جواب دہی میں دیکھتا ہوں؟ اسی حیرت میں لوگوں کو دیکھتا بھالتا چلا جاتا تھا کہ دور سے اس کو اپنے والد بزرگوار انھی حوالاتیوں میں بیٹھے ہوئے نظر پڑے۔ پہلے تو سمجھا کہ نظر غلطی کرتی ہے۔ مگر غور کیا تو پہچانا کہ نہیں، واقع میں وھی ہیں۔ دوڑ کر قدموں پر گر پڑا اور کہنے لگا کہ یا حضرت ہم سب آپ کی مفارقت میں تباہ ہیں۔ آپ یہاں کہاں؟

باپ: ”میں اپنے گناہوں کی جواب دہی میں ماخوذ ہوں۔ یہ مقام جو تم دیکھتے ہو دارالجزا ہے۔ خداوند تعالیٰ

جلّ و علٰی شانہ[۲۳] اس محکمے کا حاکم ہے۔"

بیٹا : "یا حضرت آپ بڑے متقی، پرہیزگار، خدا پرست، نیکوکار تھے۔ آپ پر اور گناہوں کا الزام؟"

باپ : "گناہ بھی ایک دو نہیں سیکڑوں ہزاروں۔ دیکھو یہ میرا نامۂ اعمال کیسی رسوائی اور فضیحت سے بھرا ہوا ہے اور میں اس کو دیکھ دیکھ کر سخت پریشان ہوں کہ کیا جواب دوں گا اور کون سی وجہ اپنی برأت کی پیش کروں گا۔"

یہ وہ کاغذ تھا جو نصوح نے ہر شخص کے ہاتھ میں دیکھا تھا اور اس کو دنیا کے خیالات کے مطابق فرد قرار داد جرم سمجھا تھا۔ باپ کا نامۂ اعمال دیکھا تو تھرا اٹھا۔ شرک اور کفر اور نافرمانی، ناشکری اور بغاوت اور بے ایمانی، کبر و نخوت، دروغ و غیبت، طمع و حسد، مردم آزاری، نفاق و ریا، حب دنیا، کوئی الزام نہ تھا کہ اس میں نہ ہو۔ چوں کہ نصوح کے دماغ میں خیالات دنیوی گونج رہے تھے، لگا باپ کے نامۂ اعمال میں تعزیرات ہند کا دفعہ اور ضمن[۲۴] ڈھونڈنے۔ سو بجائے دفعات تعزیرات ہند کے، قرآن کی سورتوں اور آیتوں کا حوالہ تھا۔ متعجب ہو کر باپ سے پوچھا کہ یا حضرت پھر کیا آپ ان تمام

---

۲۳ - اس کی شان بزرگ و اعلیٰ ہے۔

۲۴ - انڈین پینل کوڈ (۱۸۶۰ء) جس کا ترجمہ مصنف نے دو اور مترجموں کی شرکت سے ۱۸۶۱ء میں "مجموعۂ قوانین تعزیرات ہند" کے نام سے کیا تھا۔

دفعہ : Section - ضمن : Clause

جرموں کے مرتکب ہوئے ہیں ؟

باپ : ''سب کا ۔''

بیٹا : ''کیا آپ حضور حاکم اقرار کر چکے ہیں ؟ ''

باپ : ''انکار کی گنجائش ہی نہیں ۔ میری مخالفت میں گواہی اتنی وافر ہے کہ اگر میں انکار بھی کروں تو پذیرا نہیں ہو سکتا ۔''

بیٹا : ''جناب وہ کون لوگ ہیں جو آپ کی مخالفت پر آمادہ ہیں ؟''

باپ : ''اول تو دو شخص کرام کاتبین[۲۵] اس بلا کے ہیں کہ میرا کوئی فعل ان سے مخفی نہیں ۔ جتنی باتیں کہتے ہیں پتے کی اور کہتے کیا ہیں ، میرا روزنامچۂ عمری لکھتے گئے ہیں ۔ اب جو میں اس کو دیکھتا ہوں ، حرف بہ حرف صحیح اور درست پاتا ہوں ۔ دوسرے ، میرے اعضا : ہاتھ ، پاؤں ، آنکھ ، کان ، کوئی میرے کہنے کا نہیں ۔ سب کے سب مجھ سے منحرف ، سب کے سب مجھ سے برگشتہ ، میری مخالفت پر آمادہ ، میری تذلیل پر کمربستہ ہو رہے ہیں ۔''

بیٹا : ''آخر آپ کچھ اس کی وجہ بھی سمجھتے ہیں ؟''

باپ : ''میں ان کو غلطی سے اعوان و انصار ، بھیدی

---

۲۵ ۔ دو فرشتے جو ہر انسان کے ساتھ رہتے ہیں اور نیکی و بدی کا حساب لکھتے ہیں ۔

اور راز دار سمجھتا تھا ، مگر واقع میں یہ سب جاسوس ایزدی تھے ۔ انھوں نے وہ وہ سلوک میرے ساتھ کیے کہ تسمہ لگا نہیں رکھا ۔"

بیٹا : "پھر آپ کا کیا حال ہے ؟"

باپ : "جب سے دنیا کو چھوڑا ، قبر کی حوالات میں ہوں ۔ تنہائی سے جی گبھراتا ہے ۔ انجام کار معلوم نہیں ۔ شبانہ روز اسی اندیشے میں پڑا گھلتا ہوں ۔ حوالات میں مجھ کو اس قدر ایذا ہے کہ بیان نہیں کر سکتا ۔ مگر صبح و شام ، ہر روز آتے جاتے جیل خانے کے پاس سے ہو کر گزرنا ہوتا ہے ۔ دوزخ وہی ہے ۔ وہاں کی تکلیفات دیکھ کر اور بھی ہوش اڑے جاتے ہیں اور غنیمت معلوم ہوتا ہے کہ اے کاش ہمیشہ کے واسطے اسی حوالات میں رہنے کا حکم ہو جاتا ۔"

بیٹا : "پھر ہنوز آپ کا مقدمہ پیش نہیں ہوا ؟"

باپ : "خدا نہ کرے کہ پیش ہو ۔ جو دن حوالات میں گزرتا ہے ، غنیمت ہے ۔ اول اول جب میں حوالات آیا تو اعمال نامہ مجھ کو حوالے کر دیا گیا ۔ بس اسی کو دیکھا کرتا ہوں اور انجام کار سے ڈرا کرتا ہوں ۔ نجات کی کوئی تدبیر سمجھ میں نہیں آتی ۔"

بیٹا : "بھلا کسی طرح ہم لوگ آپ کی اس مصیبت میں کام آ سکتے ہیں ؟"

باپ : "اگر میرے لیے عاجزی اور خلوص کے ساتھ دعا کرو تو کیا عجب کہ مفید ہو ۔ ابھی میرے ہم سائے

میں ایک شخص کی رھائی ھوئی ہے ۔ اس پر بھی بہت سے الزام تھے ، مگر جہاں اللہ تعالیٰ میں کامل انصاف ہے ، رحم بھی پرلے ھی سرے کا ہے ۔ اس شخص کے پس ماندوں نے اس کے واسطے بہت زار نالی کی ، تو پرسوں یا اترسوں اس کو بلا کر ارشاد فرمایا کہ تیرے افعال جیسے تھے ، وہ اب تجھ پر مخفی نہیں رہے ۔ مگر ہمارے کئی بندے تیری معافی کے واسطے ہمارے حضور میں گڑگڑاتے ھیں اور وہ تیرے ہی زن و فرزند ھیں ۔ ھم کو تیری یہی ایک بات بھلی معلوم ھوتی ہے کہ تو نے اپنے خاندان میں نیکی اور دین داری کا بیج بویا ۔ جا ، ھم نے تیری خطا معاف کی ۔ بیٹا ! سچ کہنا کہ تم لوگوں نے بھی کبھی میرے حق میں دعائے خیر کی ہے ؟" ......

بیٹا : "جناب آپ کے انتقال کے بعد رونا پیٹنا تو بہت کچھ ھوا ، اور اب تک اس شد و مد کے ساتھ ھوتا ہے کہ گویا آپ نے ابھی انتقال فرمایا ہے اور یہ رونا تو ھم لوگوں کے دم کے ساتھ ہے ۔ آپ کی عنایتیں ، آپ کی شفقتیں ، جب تک جئیں گے یاد کریں گے ۔ رسم دنیا کے مطابق آپ کا کھانا[۲۶] بھی برادری میں تقسیم کر دیا ہے ۔ لوگ شاید میرے منہ پر خوشامد سے کہتے ھوں ، مگر کہتے تھے کہ اس مہنگے سمے میں باپ کا کھانا اچھا کیا ۔ دعا کے بارے میں ، غلط بات کیوں کر عرض کروں ، اہتمام نہیں ھوا ۔ آپ کے بعد ترکہ و میراث کے ایسے جھگڑے پڑ گئے کہ آج تک نہیں سلجھے ۔ مگر یہ تو فرمائیے کہ آپ تو

۲۶ ۔ وفات کے عموماً چالیسویں دن برادری کی دعوت ۔ یہ تقریب متوفی سے منسوب ھو کر "فلاں کا کھانا" کہلاتی ہے ۔

صوم و صلوٰۃ کے بڑے پابند تھے ، کیا اعمال و افعال کچھ بھی کام نہ آئے ؟"

باپ : "کیوں نہیں ۔ یہ انھی اعمال کی بدولت ہے کہ تم مجھ کو اس حالت میں دیکھتے ہو ۔ ورنہ بہتیرے مجھ سے بھی زیادہ تکلیف میں ہیں ۔ حوالات میں جیل خانے کی سی ایذا ہے ۔ مگر یہاں اعمال میں خلوص نیت شرط ہے ۔ میں نے اپنے اعمال کو آکر دیکھا تو اکثر جیسے جھوٹے موتی ، کھوٹے روپے ۔ نمازیں ، بے حضور قلب ، اکارت گئیں اور روزے ، چوں کہ پابندی رسم کے طور پر رکھنے کا اتفاق ہوتا تھا ، خالی فاقے کے شمار میں در آئے ۔"

بیٹا : "پھر اس دربار میں کچھ سعی سفارش کا دخل نہیں ؟"

باپ : "استغفراللہ ۔ کوئی کسی کی بات تو پوچھتا ہی نہیں ، نفسی نفسی پڑی ہے ۔ ہر شخص اپنی بلا میں مبتلا اور اپنی مصیبت میں گرفتار ہے ۔ دوسرے کی نجات تو کوئی کیا کرائے گا ، پہلے آپ تو سرخ رُو ہولے ۔"

بیٹا : کیوں جناب ، معاذاللہ[۲۷] ، یہ شرک و کفر کا الزام آپ پر کیسا ہے ۔ ہم لوگ تو خیر ، سارا شہر آپ کے اتقا کا معتقد تھا ۔ کیا آپ خدا کے قائل نہ تھے ؟"

باپ : "قائل تو تھا ، دل سے معتقد نہ تھا ۔"

بیٹا : "جناب آپ کے تمام اعمال ظاہر سے مستنبط ہوتا تھا کہ آپ کو خدائے کریم کے ساتھ بڑی راسخ عقیدت ہے ۔"

---

۲۷ - خدا کی پناہ ۔

باپ : ''وہ تمام عقیدت ، معلوم ہوا کہ اوپری دل سے تھی ۔ جب اول اول میرا اظہار[۲۸] لیا گیا تو پہلا سوال مجھ سے یہی پوچھا گیا تھا کہ تیرا رب کون ہے ۔ چوں کہ مرتے وقت مجھ کو ایمان کی تلقین کی گئی تھی ، میں نے جواب دیا کہ اللہ وحدہ لاشریک لہ ۔ تب اس پر جرح[۲۹] کیا گیا کہ بھلا جب تو دکھن کی نوکری سے برخاست ہو کر گھر آیا اور مدت تک خانہ نشین رہا اور جو کچھ تو نوکری پر سے کما کر لایا سب صرف ہو گیا اور تو نان شبینہ کو محتاج ہوکر نوکری کی جستجو میں ادھر آدھر پھرتا تھا اور مضطر ہو ہو کر ہم سے دعائیں مانگتا تھا ، مگر ہم تیرا صبر و استقلال آزمانے کے لیے تیرے مدعا کو حیز التوا میں ڈالے ہوئے تھے اور ایک انگریز حاکم ضلع نے کہ وہ بھی مثل تیرے ہمارا بندہ تھا ، ہمارے ایما سے تیری پرورش کا وعدہ کیا ۔ مگر ہم نے تجھ پر اپنے ایما کو ظاہر نہیں ہونے دیا اور تو یہی سمجھا کہ وہ تیری ہی کوشش کا نتیجہ تھا ۔ سچ بتا کہ تجھ کو اس انگریز کے وعدہ زبانی کا زیادہ آسرا تھا یا ہماری تحریری تمسک ''وَمَا من دابۃ فی الارض الّا علی اللہ رزقُھا[۳۰]'' کا ۔ اگر تو ہم کو صمیم قلب سے حاضر و ناظر ، سمیع و بصیر و قادر جانتا تھا ، تو گناہ پر تجھ کو کیوں کر جسارت ہوتی تھی ۔ تو

۲۸ - بیان لیا گیا (عدالتی اصطلاح) ۔

۲۹ - عموماً یہ لفظ مونث بولا جاتا ہے ۔ جرح کی گئی یا جرح ہوئی ۔

۳۰ - زمین پر کوئی چارپایہ نہیں ہے ، مگر اللہ تعالیٰ اس کی روزی کا متکفل ہے ۔ *

بھول کر کبھی بھاڑ میں تو نہیں کودا ۔ کبھی کھولتے پانی میں تو تُو نے ہاتھ نہیں ڈالا ۔ کبھی جلتی ہوئی آگ کو تو نے مٹھی میں نہیں لے لیا ۔ مگر تو گناہوں کا نہایت بے باکی سے مرتکب ہوتا تھا ۔ ضرور ہے کہ یا تو تجھ کو ہمارے فرمانے کا یقین نہ تھا کہ گناہ کی سزا آتش دوزخ ہے یا اگر یقین تھا تو اس کو دنیا کی آگ سے کم تر سمجھتا تھا ۔ دنیا میں جو کچھ رفاہ ، جو کچھ عیش و آرام ہم نے تجھ کو بے استحقاق صرف اپنی مہربانی سے عطا کیا تھا ، کیا تو نے اس کو ہمیشہ اپنی حسن تدبیر کی طرف منسوب نہیں کیا ؟ جو تکلیف تجھ کو دنیا میں پہنچی ، اگرچہ تو اپنے ہی ہاتھ سے اپنے پاؤں پر کلہاڑی مارا کرتا تھا ، مگر کیا تو اس کا الزام ہماری ذات مستجمع الصفات پر نہیں لگاتا تھا ۔

اے احسان فراموش ، ہزاروں لاکھوں احسان ہم نے تجھ پر کیے اور تجھ سے اتنا نہ ہوسکا کہ بھلا منہ سے اقرار تو کرتا ۔ اے نا شکر ، بے شمار نعمتیں ہم نے تجھ کو عطا فرمائیں مگر تجھ پر اتنا بھی اثر نہ ہوا کہ کبھی زبان پر تو لاتا ۔ جتنا ہم نے تیرے ساتھ سلوک کیا اتنا ہی تو ہماری مخالفت پر کمربستہ رہا ۔ جتنی ہم تیری رعایت کرتے رہے ، اسی قدر تو گستاخ اور شریر ہوتا گیا ۔ اس حیات بے ثبات پر تجھ کو اتنا گھمنڈ ہو گیا تھا کہ تو اپنے تئیں ہماری خدائی سے باہر لے چلا تھا ۔ اس چند روزہ زندگی پر تو اس قدر مغرور تھا کہ دائرہ عبودیت سے اپنے تئیں خارج کرنا چاہتا تھا ۔ ہم نے تجھ کو نیست سے ہست کیا اور

خلعت انسانیت سے تجھ کو سرفراز بنایا ۔ جو کچھ تجھ کو درکار تھا سو تجھ کو دیا ۔ جس کا تو حاجت مند تھا سب مہیا کیا ۔ ہر حال میں تیرے حافظ ، ہر کیفیت میں تیرے نگہبان رہے ۔ کیا اسی واسطے کہ تو کبھی بھول کر بھی ہماری طرف توجہ نہ کرے اور ہمیشہ اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد ہم سے جدا رکھے ۔

جب تو ایک مضغۂ گوشت تھا ، ضعیف و لا یعقل ، نادان و جاہل ۔ ضعیف اتنا کہ نقل و حرکت پر قادر نہیں ۔ نادان ایسا کہ خویش و بیگانے کا امتیاز نہیں ۔ ہم نے تجھ کو دودھ پلوا پلوا کر توانا کیا ، اور اپنے بندے جو تجھ پر ہر طرح کا شرف رکھتے تھے ، یعنی تیرے ماں باپ تیری خدمت گزاری کو مقرر کیے ۔ اور اُن کے دلوں میں تیری محبت ڈال دی کہ اُنھوں نے ہمارے حکم سے تجھ کو پالا پوسا ۔ اور تو روز بہ روز چونچال اور خوش حال ہوتا گیا ۔ پھر ہم نے عقل کو تیرا صلاح کار بنایا ، کہ تو اس کی مدد سے اپنی آسائش جائز کے واسطے ہر طرح کا سامان بہم پہنچائے ۔ دنیا کے چرند ، پرند ، حیوانات ، نباتات ، جمادات ، سب کو تیرا مطیع فرمان بنا دیا کہ تو اُن پر حکمرانی کرے ، اور ان میں متصرف رہے ۔ کیا اس لیے کہ تو بھول کر بھی کبھی ہماری طرف رخ نہ کرے ، اور سدا ہم سے بھاگا بھاگا پھرے ؟ تیری زندگی محض ایک ہستی بے بود تھی ۔ دو لمحے تجھ کو تنفس کے لیے ہوا نہ ملتی تو تیرا دم نکل جاتا ۔ ایک رات دن بے آب و دانہ تجھ کو جینا دشوار ہوتا ۔ منوں ہوا تو سونگھ گیا اور کبھی نہ سوچا

کہ ہمارے طفیل سے ۔ غلہ انبار کے انبار ٹھونس گیا اور کبھی نہ سمجھا کہ ہماری بدولت ۔ زندگی بھر کئی کنوئیں تو نے خالی کیے ہوں گے ، مگر کبھی دھیان نہ کیا کہ ہمارے صدقے میں ۔ اور ایک پانی اور ہوا اور غلہ و غذا کیا ، ضرورت کی کل چیزیں تو کہاں سے لاتا اور کہاں سے بہم پہنچاتا تھا ؟ ہمارے توشہ خانۂ عام سے ۔ مگر اس پر تیری یہ ہیکڑی تھی کہ گویا ہم تیرے قرض دار ہیں یا ہم پر کچھ تیرا آدھار آتا ہے ۔ تو کھاتا تھا اور مُکرتا تھا ، لیتا تھا اور بھول جاتا تھا ۔ دنیا کی باتوں میں تو تیری عقل بڑی رسا تھی مگر تو جان بوجھ کر ہمارے ہی ساتھ تجاہل کرتا تھا ۔ منہ پر آنکھیں تھیں ، اور اندھا ۔ ایک چھوڑ دو دو کان تھے ، اور بہرا ۔ زمین ، آسمان ، چاند ، سورج ، ستارے ، جنگل ، دریا ، میدان ، انواع و اقسام کے درخت ، پھل ، پھول ، کھانے کو الوان نعمت ، پہننے کو رنگا رنگ خلعت ، جواہر بیش بہا ، نقرہ و طلا ، دنیا بھر کا سامان ہم نے تیرے واسطے مہیا کیا اور ایک تیرے دم کے لیے اس قدر لوازمہ بہم پہنچایا ۔ ہم کو یہاں تک تیری خاطر عزیز اور تو ہم سے منحرف ۔ ہم کو اس قدر تیری بزرگ داشت ملحوظ اور تو ہم سے برگشتہ ۔ ہم چاہتے تو ایک ادنیٰ سی چیونٹی تیرے ہلاک کرنے کو کافی تھی ۔ ہم حفاظت نہ کرتے تو خود تیرے جسم میں فساد کا مادہ ایسا تھا کہ ایک ذرا سا روگ تیرے فنا کر دینے کو بہت تھا ۔ مگر ہم تجھ سے دوستی کرتے تھے اور تو ہم سے عداوت ۔ ہم عنایت کرتے تھے اور تو بغاوت ۔ کیا یہی تھا بدلہ جو تو نے ہم کو دیا ؟ کیا یہی تھا صلہ جو تجھ سے

ہم کو ملا ؟

ہم نے تجھ کو دنیا میں بھیجتے وقت کیا تاکید کی تھی کہ دیکھ ، روح ایک جوہر لطیف ہے اور مجھ کو بہت ہی عزیز ہے ، ایسا نہ کرنا کہ اس کو دنیا میں جا کر بگاڑ لائے ۔ یہ میری عمدہ امانت اور نفیس ودیعت ہے ۔ دیکھ اس کی احتیاط کما ینبغی اور حفاظت کماحقہ کیجیو ۔ جیسا اُجلا ، شفاف ، براق ، روشن ، یہاں سے لیے جاتا ہے ایسا ہی دیکھ لوں گا ۔ آج تو اے روسیاہ ، اس کو لایا ہے پوتھ سے بدتر اور ٹھیکری سے کم تر بنا کر ؛ نجس ، ناپاک ، تیرہ ، بے آب ، بد رونق ، خراب ۔ ہم نے تو چلتے چلتے تجھ سے کہہ دیا تھا کہ تو دنیا میں دل مت لگائیو اور اس طرح رہیو جیسے سرائے میں مسافر ۔ تو وہاں گیا تو بس وہیں کا ہو رہا اور ایسی لمبی تان کر سویا کہ قبر میں آ کر جاگا ۔ تھا تو مسافر اور بن بیٹھا مقیم ۔ تھا تو سیاح اور ہو گیا متوطن ۔ کیا تو تمام عمر دنیا میں مال نہیں جمع کرتا رہا اور کیا تو نے پکی پکی عمارتیں اس خیال سے نہیں بنوائیں کہ مدتوں ان میں رہے گا ؟ مسافر کا یہی کام ہے ؟ سیاح کا یہی شیوہ ہے ؟ تو تو جانتا تھا کہ تجھ کو یہاں لوٹ کر آنا ہے ، پھر مرنے کے نام سے تجھ کو موت[۳۱] کیوں آتی تھی ، اور چلنے کی خبر سن کر تو مچلتا کیوں تھا ؟

اول تو تجھ کو ہماری عبادت کا اتفاق ہی نہیں ہوا ،

---

۳۱ - موت آنا محاورۃً استعمال ہوا ہے یعنی موت کے ڈر سے تو کیوں مرا جاتا تھا ۔ چلنے اور مچلنے میں تجنیس لفظی ہے ۔

لیکن جب کبھی تو لوگوں کی شرم حضور[۳۲] یا دکھاوے یا اتباع رسم کی وجہ سے معروف عبادت ہوا بھی ہو ، تو کس طرح ، کہ دل کہیں تھا اور تو کہیں ۔ کوئی نماز بھی تیری سجدۂ سہو[۳۳] سے خالی تھی ؟ دنیا کی بھولی بسری باتیں تجھ کو نماز میں یاد آتی تھیں ، اور نماز تو کیا پڑھتا تھا ، گھاس کاٹتا تھا ۔ نہ تعدیل ارکان ٹھیک ، نہ قومہ درست ، نہ قعدہ صحیح ۔ برس بھر تو دوزخ شکم کو اناپ شناپ بھرتا رہتا تھا ۔ برسویں دن صرف ایک مہینے کے روزے رکھنے کا ہم نے تجھ کو حکم دیا تھا کہ تجھ کو ہماری نعمتوں کی قدر ہو ؛ تجھ کو اپنے ابنائے جنس پر ، جو مبتلائے مصیبت ہیں ، رحم آئے اور تیری صحت بدنی کو بھی نفع پہنچے ۔ تیرے مزاج میں فروتنی اور انکسار کی صفت محمود ، کہ یہ ادا ہم کو بہت بھاتی ہے ، پیدا ہو ۔ لیکن یوں دنیا کے کام دھندے میں تو تو دن بھر بے آب و دانہ مصروف رہا ؛ نہ شکوہ نہ گلہ ، تازہ دم ، ہشاش بشاش ، پھر کھانا تھورنے کو موجود ۔ مگر روزہ چوں کہ ہمارے حکم سے تھا ، دن میں سینکڑوں مرتبہ تو پیاس کی شکایت اور جو آیا اس سے ضعف و ناتوانی کی حکایت ۔ 'العطش' اور

---

۳۲ ۔ شرما حضوری بھی بولتے ہیں یعنی منہ دیکھے کا لحاظ کرنا ۔

۳۳ ۔ نماز میں کوئی بھول ہو جائے تو آخری قعدے میں تشہد کے بعد ایک سلام پھیر کر دو سجدے کرتے ہیں جو سجدۂ سہو کہلاتا ہے ۔ تعدیل ارکان : نماز کے ارکان کو ٹھیک ٹھیک ادا کرنا ۔ قومہ : نماز میں رکوع کے بعد کھڑا ہونا ۔ قعدہ : نماز میں بیٹھنا ۔ گھاس کاٹنا : بے دلی سے جلد جلد پڑھنا ۔

'الجوع' یہی تیرے دو وظیفے[۳۴] تھے - روزہ افطار کیا اور تو بدحواس ہو کر چارپائی پر ایسا گرا کہ گویا جان نہیں - باوجودیکہ تو دو دو دن کا کھانا ایک ہی رات میں کھا لیتا تھا، پھر بھی اس تصور سے کہ کل پھر روزہ رکھنا ہے، تیری جوع البقر کو کسی چیز سے سیری نہیں ہوتی تھی - تو عید کا اس طرح منتظر رہتا تھا جیسے کوئی قیدی تاریخ رہائی کا - تیرا بس چلتا تو ۲۹ کیا ۱۹ کی عید کرتا - کیا ایسے ہی روزوں کے ثواب کا تو امیدوار اور اجر کا متوقع ہے؟

ہم نے تجھ کو انسان بنا کر بھیجا تھا تاکہ مصیبت زدوں کی ہمدردی کرے - مگر تو نے ایسی تن آسانی اختیار کی کہ راحت پہنچانا تو درکنار، دوسروں کو تکلیف دے کر بھی اپنی آسائش حاصل کرنے میں تجھ کو باک نہ تھا - تیرے ہمسائے میں ہمارے بندے رات کو فاقے سے سوتے تھے اور تجھ کو سوء ہضم کے علاج سے ان کی پرداخت کی پروا نہ تھی - تیرے پڑوس میں ایسے لوگ بھی تھے کہ جاڑے کی لمبی راتیں آگ تاپ تاپ کر سحر کرتے اور تو دُہرے دُہرے لحاف اور بھاری توشکوں میں چین سے پاؤں پھیلا کر سوتا - نعمت مال و دولت جو ہم نے تجھ کو عطا کی تھی، تو نے تکلفاتِ لایعنی اور نمود و نمائش کی غیر ضروری چیزوں میں بہت کچھ تلف کی، اور جو لوگ

---

۳۴ - ہر وقت پیاس پیاس اور بھوک بھوک کی رٹ لگائے رہتا تھا - العطش : پیاس - الجوع : بھوک - جوع البقر : گائے بیل کی سی بھوک - ایک بیماری جس میں کھانے سے کبھی سیری نہیں ہوتی -

اس کے سخت حاجت مند تھے ، ترستے کے ترستے رہ گئے ۔ تیری سب خباثتیں ہم کو معلوم ہیں ۔ تو نے درماندگی کا نام خدا رکھ چھوڑا تھا ۔ جب تک سعی و تدبیر سے تجھ کو کاربرآری کی امید ہوتی تھی ، تجھ کو ہرگز پروا نہیں ہوتی تھی کہ خدا بھی کوئی چیز ہے اور انتظام دنیا میں اس کو بھی کچھ دخل ہے ۔ مگر جب تو عاجز اور درماندہ ہوتا تھا ، تب تو خدا کو یاد کرتا تھا ۔ اگر ہماری خدائی اور سلطنت تیری فرماں برداری کی محتاج ہوتی ، تو تو نے اس کے اٹھا دینے میں کچھ کوتاھی نہیں کی ۔ تو نے ہمارے فرمان واجب الاذعان کی بےحرمتی اور احکام لازم الاحترام کی بےتوقیری کی ، اور تو نے اپنا برا نمونہ دکھا کر میرے دوسرے بندوں یعنی اپنے فرزندوں کو بھی گم راہ کیا ۔ ہر روز تو لوگوں کو مرتے دیکھتا اور سنتا تھا ، کیا تجھ کو نہیں سمجھنا چاھئیے تھا کہ ایک دن تو بھی مرے گا ۔ خود تیری حالت میں کتنے کتنے انقلاب واقع ہوئے ۔ لڑکے سے جوان ہوا ، جوان سے بڈھا ناتوان ۔ بال تیرے سفید ہوئے ، دانت تیرے ٹوٹے ، کمر تیری جھکی ، قوتوں میں تیری فتور آیا ۔ غرض ہم نے تجھ کو سوتا دیکھ کر بہتیرا جھنجھوڑا ، بہتیرے ٹھنڈے پانی کے چھینٹے دیے ، کئی بار اٹھا اٹھا کر بٹھا بٹھا دیا ، مگر تیرے نصیب کچھ ایسے سوتے تھے کہ تو نے ھی کروٹ نہ لی ۔

تمامی عمر تو غفلت میں سویا
ہمارا کیا گیا اپنا ھی کھویا

سخت گیری خود ہماری عادت نہیں ۔ اور سخت گیری

ہم کریں بھی تو کس پر ؟ اپنے بندوں پر ، جن کا مارنا اور جلانا ہروقت ہمارے اختیار میں ہے - مگر جب بندہ بندہ ہو اور ہم کو اپنا مالک سمجھے ، نہ خر نا مشخص کہ ہم تو دیں نون اور وہ کہے کہ میری آنکھیں پھوٹیں - ہم سے زیادہ بھی کوئی درگزر کرنے والا ہوگا کہ ایک معذرت پر عمر بھر کے گناہوں کو ہم نے قاطبۃً بھلا بھلا دیا ہے - لیکن توبہ استغفار ، ندامت و حسرت کا اظہار بھی تو کوئی کرے - ہماری رحمت حیلہ جُو ، ہماری رأفت بہانہ طلب ، کتنی کتنی بار جوش میں آئی ، مگر ہم نے اس کو صرف کرنے کا موقع نہ پایا - اگر بندہ ہمارے ساتھ نسبت عبودیت صحیح رکھتا تو ہم اس کی لاکھ برائیوں پر خاک ڈالتے - ہم کو تو بڑی شکایت یہی ہے کہ اس نے ہم کو معبود ہی نہ گردانا - عالمِ اسباب میں رہ کر اسباب پرست ہو گیا -

پھر ہم جو دیکھتے ہیں تو ہمارے احکام بھی کچھ سخت نہ تھے - کھانے کو ہم نے نہیں روکا ، سونے کو ہم نے منع نہیں کیا ، تمتعات دنیوی سے باز نہیں رکھا - پھر جو تو نے ان کی بجا آوری نہ کی ، تو سوائے تیری بد نفسی کے اور تو کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی - اے شخص ، نجات جس کا تو نہایت آرزو مندی کے ساتھ خواہاں ہے ، اے کاش! زندگی میں تجھ کو اس کی اتنی بھی پروا ہوتی جیسے اُڑد پر سفیدی۳۵ دنیا کے چھوٹے چھوٹے نقصان اور ذرا ذرا سے زیان تجھ کو مضطر اور بے چین کر دیا کرتے تھے ؛ اگرچہ کیا دنیا اور

---

۳۵ - مراد بہت معمولی یا ذرا سی - اُڑد ہندی میں ماش کی دال کو کہتے ہیں - اس کے دانے پر سفیدی کا ہلکا سا نشان ہوتا ہے -

کیا دنیا کا خسارہ ، کیا پدی اور کیا پدی کا شوربا ؛ لیکن تباہیٔ دین کی تجھ کو خبر تک بھی تو نہیں ہوئی - اے کاش ! تجھ کو نماز کے قضا ہونے کا اتنا ہی رنج ہوتا جتنا ایک مٹی کے پرانے آب خورے کے ٹوٹ جانے کا ہوتا تھا - ہم جانتے ہیں کہ اب تجھ کو بہت ہی ندامت ہے ، لیکن اس ندامت کا کچھ ماحصل نہیں ، اس واسطے کہ یہ دارالجزا ہے ، دارالعمل نہیں - ہم دیکھتے ہیں کہ تو ایک بات کا جواب بھی نہیں دے سکتا ، لیکن حجت تمام کرنے کی نظر سے ہم تجھ کو مہلت دیتے ہیں - جا ، اپنے نامۂ اعمال کو دیکھ اور اچھی طرح سوچ سمجھ کر کوئی بات ہم سے بیان کر ، بشرطے کہ معقول اور قابل قبول ہو -

---

فصل دوم

خواب سے بیدار ہو کر نصوح کو اپنی اور اپنے
خاندان کی لایعنی زندگی پر سخت تأسف ہوا
اور اس نے تلافی مافات کا عہد کر کے فہمیدہ
اپنی بی بی سے ماجرائے خواب بیان کیا اور
اصلاح خاندان کے لیے اس کو اپنا مددگار بنایا ۔

باپ نے جو یہ اپنی رام کہانی سنائی ، بیٹے پر اس طرح کی ہیبت چھائی کہ چونک پڑا ۔ جاگا تو پھر وہی دالان تھا اور وہی تیار داریوں کا سامان ۔ بی بی[1] پاس بیٹھی ہوئی آہستہ آہستہ پنکھا جھل رہی تھی ۔ میاں کی آنکھ کھلی ہوئی دیکھ اس کی جان میں جان آئی ۔ ورنہ جس گھڑی سے میاں نے جی برا کیا تھا ، سہموں کے سارے کاٹو تو بدن میں لہو نہیں تھا ۔ نصوح آٹھ بجے ڈاکٹر کی دوا پی کر جو پڑا تھا تو اس وقت کا سویا سویا اب کہیں دو بجے جا کر ہوشیار ہوا ۔

۱ - بی بی (بمعنی خاتون ۔ عورتوں کے لیے کلمۂ احترام) اور بیوی (بمعنی زوجہ) ان دو لفظوں کے استعمال میں دہلی والے عموماً کوئی فرق نہیں کرتے ۔

چوں کہ ڈاکٹر کہہ گیا تھا کہ نیند اگر آ گئی تو جاننا کہ بیمار بچ گیا ، اس کے سو جانے سے سب کو تسلی سی ہو گئی تھی ۔ مگر جب زیادہ دیر ہوئی تو عورتیں پھر گھبرانے لگیں کہ نہیں معلوم کم بخت ڈاکٹر کیسی دوا پلا گیا ہے کہ دوپہر پڑے پڑے گزر گئے ، کروٹ تک نہیں بدلی ۔ خدا جانے اندر سے جی کیسا ہے اور دل پر ایسی کیا آن بنی ہے ۔ کیوں کر ہوش آئے گا ۔ دیکھیے کیا ہوتا ہے ۔ نصوح بیدار ہوا تو بی بی نے پوچھا ، ”کیسی طبیعت ہے ؟ اچھے سوئے کہ گھر میں رونا پیٹنا ہوا کیا[۲] اور تم کو خبر نہیں ۔ بولو ، بات کرو کہ اوپر والوں کو تسلی ہو ۔ کسی بچے کے منہ میں دانہ تک گیا ہو تو حرام ۔ چھوٹے بڑے کل کا کھائے ہوئے ہیں ۔ روتے روتے لڑکیوں کی آنکھیں سوج گئی ہیں ۔ لڑکے ہیں کہ مضطر اور پریشان پھرتے ہیں ۔“

بی بی نے ہر چند دل جوئی کی باتیں کیں ، مگر نصوح کو خواب کا سارا ماجرا پیش نظر تھا ، مطلق جواب نہ دیا ۔ بی بی سمجھی کہ بیماری کی وجہ سے بولنے کو جی نہ چاہتا ہو گا ، مگر وہ خدشہ سب کے دل سے دفع ہو گیا ۔ مبارک سلامت ہونے لگی اور گھر بھر نے بے رمضان کی عید منائی ۔ گو دیر ہو گئی تھی ، مگر لوگ بھوکے تھے ، بازار سے حلوہ پوری منگوا کر سب نے تھوڑا بہت کھایا پیا ۔ کھانے ہی میں کسی نے یہ بات بھی چھیڑ دی کہ مریض کا غسل صحت ہو تو ایک رت جگا بڑی دھوم سے کیا جائے اور اچھے ہونے

---

۲ ۔ ہوتا رہا ۔ ماضی استمراری کے معنی ہیں ۔ جیسے دیکھا کیا (دیکھتا رہا) ، سنا کیا (سنتا رہا) ۔

کی شادی[۳] کریں ۔

یہ لوگ تو شادی اور رت جگے کے ارادے کر رہے تھے اور نصوح اپنے خواب کے تصور میں غلطاں پیچاں تھا ۔ اس کا دل مان گیا تھا کہ یہ خواب میرے وہم و خیال کا بنایا ہوا تو ہرگز نہیں ہے ، ہو نہ ہو یہ ایک امر من جانب اللہ ہے ۔ خواب کیا ہے رویائے صادقہ اور الہام الٰہی ہے ۔ باپ کا اظہار اس نے ایسی توجہ سے سنا تھا کہ حرف بہ حرف نوک زبان یاد تھا ۔ جتنے الزام باپ پر لگائے گئے تھے ، غور کرتا تھا تو سب اپنے میں پاتا تھا ، بلکہ باپ کی حالت سے اپنی حالت کو مقابلہ کرتا تھا تو کچھ نسبت نہ تھی ۔ آں مرحوم کا یہ حال تھا کہ نماز روزے کے پابند ، ورد و وظائف کے مقید[۴] ، معاملے کے صاف ، بیوہار کے کھرے ، لوگوں کے دیکھنے میں محتاط ، پرہیزگار ، متقی ، دین دار اور یہاں نماز بھی تھی تو گنڈے دار ۔ عیدین تو ضرور ، اس واسطے کہ عید سے بڑھ کر مسلمانوں کا کوئی تیوہار نہیں ، اس سے بھاری کوئی میلہ نہیں ۔ برس روز میں یہی دو دن تو ساز و سامان کی نمائش کے ہوتے ہیں ۔ کوئی اپنے نئے شان دار کپڑوں میں اکڑ رہا ہے ۔ کوئی گھوڑے کو چھیڑ چھیڑ کر کداتا ہوا ، قصداً لوگوں کی بھیڑ کو چیرتا پھاڑتا چلا جا رہا ہے ۔ کوئی نوکروں کی ہٹو بڑھو سن کر پھولا ہوا ہے ۔ کوئی کرائے یا مانگے کے تانگے پر سوار ،

۳ ۔ خوشی منائیں ۔ فارسی محاورہ ، شادی کردن کا ترجمہ ۔ اب اس معنی میں نہیں بولا جاتا ۔

۴ ۔ پابندی سے وظیفہ پڑھنے والے ۔ بیوہار : لین دین ۔ معاملت

گاڑی بان سے کہتا ہے : ''چوھدری کیسا سڑیل تانگہ بنا رکھا ہے ۔ گدا ہے تو میلا ، پوشش ہے تو پھٹی ۔ نہ بیلوں کے گلے میں گھونگرو ، نہ پہیوں میں جھانجھ ۔ خیر اب عیدگاہ کا وقت قریب ہے ۔ اتنا تو کر کہ وہ آگے یکہ جا رہا ہے ، اس کے برابر لگائے چل ۔ مرد آدمی[5] تجھ کو انعام لینے کا بھی سلیقہ نہیں ۔''

رہا جمعہ ، اگر کپڑے خوب صاف ہوئے اور دھوپ بھی ایسی سخت نہ ہوئی ، دن ابر و باد سے پاک ہوا ، دوست آشناؤں سے ملنے کو جی چاہا تو جامع مسجد[6] چلے گئے ، ورنہ محلے ہی کی مسجد میں ٹرخالی ۔ یا دل میں تاویل کر لی کہ شرائط جمعہ[7] میں اختلاف ہے ۔ پنج[8] وقتی کو تو کبھی فرض و واجب کیا مستحب بھی نہیں سمجھا ۔ صبح اور ظہر اور عشا تو عمر بھر پڑھی ہی نہیں ، کیوں کہ عین سونے کے وقت تھے ۔ رہی عصر سو ہوا خوری اور سیر بازار ، خرید و فروخت ، دوست آشناؤں کی ملاقات ،

۵ ۔ یہ بے معنی ترکیب بے تکلف بول چال میں عموماً کلمۂ تحقیر کے طور پر استعمال ہوتی ہے ۔

۶ ۔ بستی کی جامع مسجد میں نماز جمعہ ادا کرنا افضل ہے ۔

۷ ۔ دارالحرب میں اور اُن چھوٹی بستیوں میں جہاں تمدنی ضروریات کی تمام چیزیں نہ ملتی ہوں ، نماز جمعہ فرض نہیں ہے ۔ اس زمانے میں ہندوستان کا دارالحرب ہونا ایک اختلافی مسئلہ تھا ۔

۸ ۔ پانچ وقت کی نماز ۔ فرض : جس بات کا حکم خدا نے دیا ہے ۔ واجب : جس بات کی شریعت میں تاکید ہے اور جس کے کرنے میں ثواب اور نہ کرنے میں گناہ ہوتا ہے ۔ مستحب : وہ امر پسندیدہ جس کے کرنے میں ثواب ہے اور نہ کرنے میں گناہ نہیں ۔

دنیا بھر کی ضرورتوں کو بالائے طاق رکھتے تو ایک نماز پڑھتے - مغرب کے واسطے تو عذر ظاہر تھا ، وقت کی تنگی - جب تک پھر پھرا کر آتے ، حمرت شفق[9] زائل ہو جاتی تھی -

یہ تو اس عبادت کا حال تھا جس کو ثواب بے زحمت اور اجر بے تکان کہنا چاہیے اور جس عبادت میں ذرا سی تکلیف بھی تھی ، جیسے روزہ یا زکوٰۃ ، حتی الوسع کوئی نہ کوئی حیلۂ شرعی[10] اس سے معاف رہنے کا سوچ لیا جاتا تھا - رجب کا مہینہ آیا اور روزوں کے ڈر کے مارے ایک عجیب طرح کا سہم چڑھا - سب سے آسان نسخہ یہ کہ کسی طبیب کے یہاں آنا جانا شروع کیا - انھوں نے چند روزہ زندگی کے واسطے وہ وہ بکھیڑے کھڑے کر رکھے ہیں کہ روئے زمین پر ان کے نزدیک کوئی تندرست ہی نہیں - یوں ملنے یا ملاقات کرنے جاؤ تو پان کے عوض نسخہ حوالے کر دیتے ہیں اور جہاں ایک دفعہ دوا پی اور روگ لگا - رمضان آتے آتے تو طبیعت خاصی محتاج مسہل ہوگئی اور حکیم صاحب کی بدولت روزوں سے بچ گئے - زکوٰۃ کا ٹال دینا تو کچھ بڑی بات نہ تھی - نصاب[11] پر حول کامل کیوں گزرنے دیں کہ زکوۃ دینی پڑے - جب دیکھا کہ برس پورا ہونے آیا بی بی کے نام زبانی ہبہ کر دیا - گھی کہاں گیا - کھچڑی

۹ - شفق کی سرخی مٹ جانے کے بعد نماز مغرب کا وقت ختم ہو جاتا ہے -

۱۰ - ایسا عذر جو شرعاً قابل قبول ہو -

۱۱ - مال کی وہ مقدار جس پر زکوۃ واجب ہو جاتی ہے - حول کامل : فقہی اصطلاح میں ایک سال کی پوری مدت جب نصاب پر زکواۃ ادا کرنی لازم ہو -

میں - جب بی بی پر وجوب زکوٰۃ کا وقت آیا تو پھر اپنے تمام ہبہ کرا لیا اور ٹھٹھیرا بدلائی[۱۲] کر کے حکم خدا کو بالا بتایا - مال کو ایسے پیرائے میں رکھا کہ زکوٰۃ سے بری رہے - خاصی طرح دکانیں مول لیں ، مکان بنوائے ، ان میں کرائے دار بسائے کہ مال نامی[۱۳] آپ نامی زکوٰۃ ندارد -

غرض جہاں تک نصوح احتساب کرتا تھا ، اپنے تئیں دین سے بے بہرہ ، ایمان سے بے نصیب ، نجات سے دور ، ہلاکت و تباہی سے قریب پاتا تھا - جس عمل نیک پر نظر کرتا ، یا تو سرے سے اُس کے اعمال نامے میں تھا ہی نہیں اور تھا بھی تو ایک عمل اور سینکڑوں رخنے ، ہزاروں فساد - دو چار نمازیں بھی تو کاہلی اور بے دلی و ریا سے خالی نہیں - کبھی جاڑے کے دنوں میں یا افطار و سحور میں شریک ہونے کی نظر سے جو روزے رکھنے کا اتفاق ہوا تھا تو ان میں دکھاوے اور ظاہر داری کا نقص تو تھا ہی تھا ، تکلیف کی شکایت سے نیکی برباد گناہ لازم - کبھی کسی بھوکے ننگے کو وہ چیز جو اپنے مصرف کی نہ تھی ، دی تو اس کو یوں اکارت کیا کہ ایک دفعہ دے کر سو سو بار

---

۱۲ - ٹھٹھیرے (ظروف ساز) پرانے برتنوں سے نئے برتن بدلا کرتے ہیں - ٹھٹھیرا بدلائی کرنے سے مراد ہے آپس میں ادلا بدلی کر لینا - اس محاورے کی طرح ایک کہاوت بھی ہے کہ ٹھٹھیر ٹھٹھیر بدلائی نہیں ہوتی -

۱۳ - نامی کے دو معنی ہیں اول متعارف یعنی نامیدہ و مشہور اور دوسرے اسم فاعل نمو سے یعنی بالندہ اور روز افزوں - مال نامی میں دوسرے معنی مراد ہیں اور آپ نامی میں پہلے *

احسان جتایا اور یہ سمجھے کہ بے چارے محتاج کو عمر بھر کے واسطے مول لے لیا ۔ خلاصہ یہ کہ کوئی عمل نیک نہ تھا جو خالصۃً للہ[۱۴] ہو اور انصافاً اس کے ثواب کی توقع، اس کے اجر کی امید کی جائے ۔

ان خیالات نے نصوح کے دل پر ایسا اثر کیا کہ وہ بے اختیار ہو کر رویا اور کہنے لگا کہ الٰہی مجھ سے زیادہ نالائق، نابکار، ناکس، ناھنجار بھی کوئی شخص ہوگا کہ میں نے اپنی ساری عمر تیری نافرمانی میں کاٹی ۔ کاش میں پیدا ہی نہ ہوا ہوتا، یا پیدا ہوا تھا تو معصیت پر قدرت نہ رکھتا ۔ کوئی ایسی سخت مصیبت مجھ پر پڑتی کہ سر کھجانے کی فرصت نہ دیتی ۔ مجھ پر بجلی نہ گری ۔ آسمان نہ ٹوٹ پڑا ۔ مجھ کو سانپ نہ سونگھ گیا ۔ ہیضہ کر کرا کے میں بے حیا پھر اُٹھ بیٹھا ۔ لعنت ہے مجھ پر اگر اب مدت‌العمر گناہ کے پاس پھٹکوں ۔ تُف ہے میری زندگی پر اگر پھر معصیت پر اقدام کروں ۔ یہ عہد اپنے جی میں استوار کرکے اس کو پھر اپنی عمر تلف شدہ کا خیال آگیا اور دل میں کہنے لگا کہ میں نے ساری عمر جو اس تباہ حالت میں غارت کی، اس کی تلافی کچھ بھی میرے اختیار میں نہیں اور بڑی بے انصافی ہے کہ میں جرم کروں اور سزا نہ پاؤں، گناہ کروں اور اس کا پاداش نہ بھگتوں ۔ نصوح کو اپنے گناہوں پر اس وقت اتنی ندامت تھی کہ مرنے کو وہ اپنی ایک ادنٰی سی سزا سمجھتا تھا ۔ گھر بھر اس کے جانبر ہونے کی خوشی منا رہا تھا اور اس کو افسوس تھا کہ میں مر

۱۴ ۔ صرف اللہ کے لیے، یعنی جو عمل ہوائے نفس سے پاک، محض اللہ کی رضا جوئی کے لیے ہو ۔

کیوں نہیں گیا ۔ علالت کی وجہ سے اٹھنے سے معذور تھا ، مگر تکیے پر اوندھا سر کیے ہوئے پڑا ہوا تھا اور کہہ رہا تھا کہ خدایا میں تو اس قابل ہوں کہ دوزخ میں جھونک دیا جاؤں مگر جو تو نے اپنے فضل سے پھر چند روز کے واسطے مجھ کو دنیا میں رکھ لیا ہے تو ایسی توفیق عطا کر کہ نیکوکاری اور تیری اطاعت و فرماں برداری میں رہوں اور میری زندگی دین دارانہ زندگی کا نمونہ ہو ۔

اپنے نفس کے احتساب سے فارغ ہوا تو نصوح کو خاندان کا خیال آیا ۔ دیکھا تو بی بی بچے سب ایک رنگ میں ہیں : دنیا میں منہمک ، دین سے بے خبر ۔ تب یہ دوسرا صدمہ نصوح کے دل پر ہوا کہ وا حسرتا! میں تو تباہ ہوا ہی تھا ، میں نے ان تمام بندگان خدا کی بھی باٹ ماری ۔ اپنی شامت اعمال کیا کم تھی کہ میں نے ان سب کا وبال سمیٹا ۔ مجھ کو خدا نے اس گھر کا مالک اور سردار بنایا تھا اور اتنی روحیں مجھ کو سپرد کی تھیں ۔ افسوس میں نے ودیعت ایزدی کو تلف کیا اور امانت الٰہی کی نگہداشت میں مجھ سے اس قدر سخت غفلت ہوئی ۔ یہ سب لوگ میرے حکم کے مطیع اور میری مرضی کے تابع تھے ۔ میں نے اپنا برا نمونہ دکھا کر ان سب کو گم راہ کیا ۔ اگر میں قدغن رکھتا تو یہ کیوں بگڑتے اور یہ بگڑے تو آخر ان سے جو نسل چلے گی وہ بھی بگڑے گی ۔ غرض میں دنیا میں بدی کا بیج بو چلا ۔ جو لوگ خدا کے اچھے بندے ہوتے ہیں ، باقیات الصالحات اور یادگار نیک دنیا میں چھوڑ جاتے ہیں ۔ میں ایسا بدبخت ہوا کہ مجھ سے یادگار بھی رہی تو

بدی ۔ جب تک میری نسل رہے گی بدی بڑھتی اور پھیلتی جائے گی ۔ جب یہ لوگ خدا کے روبرو جواب دھی کے واسطے حاضر ھوں گے تو آخر کہیں گے کہ ھم کو کسی نے راہ نیک بتائی ھی نہیں ۔ تو میں کیا جواب دوں گا ؟ یہ خیال کر کے نصوح پھر ایک مرتبہ پکار کر رویا اور دوسرا عہد اُس نے یہ کیا کہ جتنے لوگ میرے خاندان میں ھیں سب کی اصلاح وضع کروں گا ۔ اور پھر اس نے خدا سے دعا کی کہ اے الہ العالمین ! تو اس ارادے میں میری مدد کر ۔ جو مشکل پیش آئے آسان ھو جائے ۔ میری بات میں اثر دے اور میرے عزم میں استحکام ۔

نصوح کو ایسی ٹھوکر نہیں لگی تھی کہ وہ اُس کو

بھول جاتا تنبّہ ھوئے پیچھے اس کو اپنی اصلاح دشوار نہ تھی ، مگر اصلاح خاندان ایک بڑا مشکل کام تھا ۔ وہ بہ خوبی واقف تھا کہ دین داری اور خدا پرستی میرے خاندان کے لیے بالکل نئے الفاظ ھیں جن سے چھوٹے بڑے کسی کے کان آشنا نہیں ۔ وہ اچھی طرح سمجھتا تھا کہ گھر بھر ایک طرف ھوگا اور میں اکیلا ایک طرف ۔ نقار خانے میں طوطی کی آواز کون سنے گا اور میں ایک[۱۵] سورما چنا بن کر کیوں کر معصیت کے بھاڑ کو توڑ ڈالوں گا ۔ پس وہ غور کرنے لگا کہ کس کو اپنا مددگار بنائے ، کس کو صلاح کار قرار دے ۔ آخر یہی دل میں آیا کہ صلاح کے لیے بی بی سے بہتر کوئی ذریعہ نہیں اور خدا کو کچھ اس خاندان کی فلاح ھی

۱۵ ۔ صحیح مثل یوں ہے : اکیلا چنا (یا اکیلا سورما چنا) بھاڑ نہیں پھوڑتا ۔ یعنی جو کام مل جل کر کرنے کا ھو اُسے تنہا آدمی سر انجام نہیں دے سکتا ۔

منظور تھی کہ نصوح نے بی بی کو پڑھا لکھا بھی لیا تھا۔ جب نصوح کا نیا نیا بیاہ ہوا انھی دنوں تعلیم نسواں کا چرچا شروع ہوا تھا۔ نئی نئی کتابیں جو عورتوں کے واسطے جاری ہوئی تھیں، نصوح نے سب کو بہت شوق سے دیکھا تھا اور اس کا دل اس بات کو مان گیا تھا کہ عورتوں کو لکھانے پڑھانے میں چند در چند فوائد دینی و دنیوی مضمر ہیں۔ چناں چہ اس نے بعض کتابوں میں سے بعض مقامات دل چسپ بی بی کو پڑھ کر سنائے۔ بھلائی کی بات سبھی کو بھلی معلوم ہوتی ہے۔ بی بی نے بھی اس کو تسلیم کیا کہ عورتوں کے لیے پڑھنا بہت مفید ہے۔ بال بچوں کا کچھ بکھیڑا نہ تھا۔ میاں سے پڑھنا شروع کیا تو چار پانچ مہینے میں اردو لکھنے پڑھنے لگی۔ تب سے اب تک تھوڑا بہت مشغلہ چلا ہی جاتا تھا۔

نصوح کو اس وقت بی بی کا پڑھا ہونا بہت ہی غنیمت معلوم ہوا اور سمجھا کہ بی بی یوں ہی خدا کے فضل سے اسم بامسمیٰ، فہمیدہ ہے، اس کا سمجھا لینا تو چنداں دشوار نہیں۔ رہے بچے جن کی عمر چھوٹی ہے وہ بھی اصلاح پذیر ہیں۔ بڑی دقت تو بڑی عمر والوں کی ہے۔ ایک بیٹا ایک بیٹی بیاہے جا چکے تھے۔ سمجھا کہ دونوں اپنے اپنے گھر کے ہیں، کسی پر میرا اختیار باقی نہیں۔ اور ہو بھی تو جوان بیٹا جوان بیٹی۔ مار میں نہیں سکتا، گھڑک میں نہیں سکتا، نرا سمجھانا اور وہ بھی اس عمر میں بڈھے طوطوں کو پڑھانا ہے۔ آخر وہ کہیں گے نہیں کہ برے ہیں اور بے دین ہیں تو تمھی نے ہم کو ایسا اٹھایا۔ اور جب کہ

ہماری عادتیں راسخ اور خصلتیں طبیعت ہو گئیں تو اب ہم کو ان کا ترک کرنا تعلیم کرتے ہو اور ہم کو ناحق ملزم بناتے ہو ۔ یہ سوچتا تھا کہ نصوح کی آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے اور سمجھا کہ ان دو کی اصلاح محال ہے ۔ اس کو زیادہ تر افسوس اس بات کا تھا کہ خدا کے فضل سے دونوں کے آگے اولاد ہے جس طرح میری بدی نے میری اولاد میں اثر کیا ، کیا ان کی بدی ان کی اولاد میں سرایت نہ کرے گی ؟ مگر پھر بھی نصوح نے مصمم ارادہ کر لیا کہ ان شاء اللہ اپنے مقدور بھر تو کوشش کروں گا ۔ یا تو راہ راست ہی پر آئیں گے یا جیتے جی چھوڑ دوں گا ۔ جو خدا کا نہیں وہ میرا پہلے نہیں ۔ منجھلے بیٹے اور منجھلی بیٹی کی طرف سے بھی نصوح کو خوب اطمینان نہ تھا اور جانتا تھا کہ ان کے ساتھ بھی دقت پڑے گی ۔ لیکن اس کا ارادہ ایسا مستحکم تھا کہ کوئی مشکل اس کو روک نہیں سکتی اور وہ مضطرب اور مستعجل اس قدر تھا کہ چاہتا تھا کہ ہتھیلی پر سرسوں جمالوں ۔ ابھی اچھی طرح بدن میں اٹھنے بیٹھنے کی طاقت بھی نہیں آئی تھی کہ اس نے بی بی سے کہا : ”تھوڑا سا پانی گرم کرا دو تو میں نہالوں ۔“

بیوی : ”کیا غضب کرتے ہو ، ہاتھ پاؤں میں ذرا دم تو آنے دو ۔ نہانے کی ایسی کون سی ساعت ماری جاتی ہے ۔ جب اصل خیر سے چلنے پھرنے لگوگے ، خاصی طرح حمام میں جا کر غسل کرنا ۔“

میاں : ”میں نماز پڑھنی چاہتا ہوں ۔ علالت میں طرح طرح کی بے احتیاطی ہوئی ہے ، جی قبول نہیں کرتا کہ اسی

حالت سے نیت باندھ لوں۔"

بیوی : "کیا اچھے ہونے کے نفل مانے تھے[16] ؟"

بی بی نے جو نماز کی سن کر ایسا تعجب ظاہر کیا تو نصوح پر گھڑوں پانی پڑ گیا اور جی میں کہنے لگا کہ اللہ اللہ مجھ میں اور نماز میں اتنی دوری ہے کہ گھر والی بی بی سن کر تعجب کرتی ہے۔

وائے بر من وائے بر انجام من
عار دارد کفر بر اسلام من[17]

اور ایک آہ سرد کھینچ کر بی بی سے کہا کہ میں نفلیں پڑھنے والا ہوتا تو بھلے ہی دن نہ ہوتے۔

بیوی : "منت نہیں، نیاز نہیں تو پھر کیا جلدی ہے۔ نماز کہیں بھاگی نہیں جاتی۔ اچھی طرح تندرست ہو جاؤ گے تو بہتیری نمازیں پڑھ لینا۔"

اب نصوح وہ نصوح نہیں رہا تھا کہ بی بی کو ایسی بے وقعتی کے ساتھ نماز کا تذکرہ کرتے ہوئے سنتا اور اس کو ناگوار نہ ہوتا۔ غصہ تو آیا مگر پھر اپنے جی میں سمجھا کہ بی بی کا کچھ قصور نہیں۔ جس کا شوہر بے دین

---

۱۶ - پرانے نسخوں میں یہ جملہ اسی طرح چھپا ہے ! بعد کے ایڈیشنوں میں اسے یوں بدل دیا گیا : "کیا اچھے ہونے کی نفل مانی تھی۔" لیکن یہ مصنف کی اصلاح نہیں بلکہ مرتبین کی ہے۔

۱۷ - حیف ہے مجھ پر اور میرے انجام پر۔ (میری دینی حالت ایسی گئی گزری ہے کہ) میرے اسلام سے کفر کو بھی شرم آتی ہے۔

ہو اس کے ایسے ہی خیالات ہونے چاہئیں - تمام تر میری ہی خطا ہے اور ایک میری بے دینی نے سارے گھر کو تباہ کر رکھا ہے - بی بی سے اس وقت رد و کد کرنا مناسب نہ سمجھ کر اتنا ہی کہا کہ افسوس میری ناکارہ صحبت نے تم کو کس قدر گم راہ کر دیا ہے کہ فرض خدا کو تم نے ایک سرسری سا کام سمجھا -

غرض بی بی کے منع کرتے کرتے نصوح نے غسل کر ، کپڑے بدل ، نماز پڑھی - آج نصوح کی یہ پہلی نماز تھی کہ اس کو داخلِ عبادت کہہ سکتے ہیں - وہ اس طرح ہاتھ باندھے ہوئے مؤدب کھڑا تھا جیسے کسی بادشاہ عالی جاہ کے روبرو کوئی خونی کھڑا ہوتا ہے - آنکھیں زمین میں سی ہوئی تھیں - ہیبت سلطانی اس پر ایسی چھا رہی تھی کہ نہ ہلتا تھا نہ جلتا تھا ، بس ایک بت کی طرح بے حس و حرکت کھڑا ہوا تھا - عاجزی اور فروتنی اس کے چہرے سے ظاہر تھی - حکم کے مطابق کھڑا تھا لیکن جھک جھک جاتا تھا اور گر گر پڑتا تھا - غرض ایسی ایسی حرکتیں اس سے سرزد ہوتی تھیں کہ خواہ مخواہ دیکھنے والے کو رحم آئے -

ہفتے عشرے تک علالت کا کسل رہا - پھر تو خدا کے فضل سے نصوح بہ دستور توانا و تندرست ہو گیا - مگر بیماری کے بعد اس کی عادتیں اکثر بدل گئی تھیں - ہر وقت تو وہ کچھ سوچ میں رہتا تھا - بے ضرورت بکنا ، بے تمیزی کے ساتھ ہنسنا ، لا یعنی باتوں میں شریک ہونا ، اس نے مطلقاً چھوڑ دیا تھا - لیکن اس کے ساتھ لینت ، تواضع ،

وسعتِ اخلاق ، انکسار ، یہ صفتیں بھی اس میں آگئی تھیں۔ بیماری سے پہلے اس کی بد مزاجی اس درجے کی تھی کہ گھر والے اس کو ھوّا سمجھتے تھے۔ دروازے کے اندر اس نے قدم رکھا اور کیا چھوٹے بڑے سب پر ایک سہم چڑھا۔ اگر بھولے سے کوئی چیز بے موقع پڑی رہ گئی اور اس نے دیکھ پائی ، سب پر ایک آنت توڑ ماری۔ کھانے میں ، اٹکل ہی تو ہے ، ذرا نمک زیادہ ہو گیا یا مٹھلونا رہ گیا ، بس اسی روز جانو کہ گھر میں فاقہ ہوا۔ کتنے تو پیالے شہید ہوئے ، کتنی رکابیوں کا خون ہوا۔ سارے محلے میں خبر ہوئی کہ آج کھانا بگڑا۔ بچوں کو بات بات میں جھڑکی ، بات بات میں گھُرکی۔ یا اب نصوح کے سر پر ڈھول بجاؤ کچھ خبر نہیں۔ بلکہ فہمیدہ بچوں کو شوخی کرتے دیکھ خفا ہوتی اور کہتی : ''کیسے نا ہموار بچے ہیں۔ باپ کا تو یہ حال ہے اور یہ انھی کے کان میں جا کر شور مچاتے ہیں۔ ذرا ڈر نہیں۔ دیکھو اکٹھی ہی کسر نکلے گی۔''

شروع میں نصوح کے یہ انداز دیکھ کر گھر والوں کو بڑا کھٹکا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ بیماری سے اٹھے ہیں ، ضرور ہے کہ پہلے سے زیادہ نازک مزاج ہو گئے ہوں گے۔ اس بلا کا غصہ چڑھا ہے کہ کسی سے بولتے ہی نہیں۔ دیکھیے یہ قہر کس پر ٹوٹتا ہے ، کس کی شامت آتی ہے۔ مگر نصوح نے ایسا جلاب نہیں لیا تھا کہ اس نے خون میں ذرا سی گرمی بھی لگی رہنے دی ہو۔ لوگ بیماری سے اٹھ کر چڑ چڑے اور بد مزاج ہو جاتے ہیں اور نصوح حلیم اور بردبار ، نرم دل اور خاکسار ہو کر اٹھا تھا۔ معاملات

روزمرہ میں اس کی یہ کیفیت ہوگئی تھی کہ جو رکھ دیا ، سو چاؤ سے کھا لیا ، جو دے دیا سو خوشی سے پہن لیا ۔ نہ حجت نہ تکرار ، نہ غل نہ غپاڑا ۔ نصوح کی عادت بدلی تو لوگوں کی مدارات بھی اس کے ساتھ بدل چلی ۔ جو پہلے ڈرتے تھے ، وہ اب اس کا ادب ملحوظ رکھتے ۔ جن کو وحشت و نفرت تھی ، وہ اب اس کے ساتھ اُنس و محبت کرتے ۔ تھوڑے ہی دنوں میں گھر شور و شغب سے پاک اور لڑائی جھگڑے سے صاف ہوگیا ۔

ابتداءً نصوح کو نماز وغیرہ کا اہتمام کرتے دیکھ کر گھر والوں نے اچنبھا کیا تھا ۔ لیکن پھر تو بے کہے دوسروں پر خود بخود ایک اثر سا ہونے لگا اور نصوح اسی کا منتظر تھا کہ لوگ اس طرز اجنبی سے کسی قدر مانوس اور خوگر ہو لیں تو اپنا انتظام شروع کروں ۔ نصوح کی جہاں اور عادتیں بدلی تھیں ، وہاں ایک یہ بھی تھی کہ وہ خلوت پسند ہوگیا تھا ۔ تمام تمام دن اکیلا بالے خانے پر بیٹھا رہتا ۔ بے بلائے اگر کوئی جاتا تو یہ بھی نہ تھا کہ اس سے بات چیت نہ کرے ، مگر حتےالوسع مجمع سے الگ تھلگ رہتا تھا ۔ بعض کو یہ خیال ہوتا تھا کہ شاید نیند بڑھ گئی ہے ۔ کوئی یہ سمجھتا تھا کہ اُترنے چڑھنے کی توانائی نہیں آئی ۔ مگر فہمیدہ کو اکثر جانے کا اتفاق ہوتا تھا ؛ کبھی نماز پڑھتے دیکھا ، کبھی چپ بیٹھے ہوئے ۔ آخر ایک روز پوچھا کہ ”اکیلے چپ چاپ بیٹھے ہوئے تمہارا جی نہیں گھبراتا ۔ تھوڑی دیر کو نیچے ہی اتر آیا کرو کہ بال بچوں کی باتوں میں دل بہلے ۔ مجھ کو گھر کے کام دھندے سے

فرصت نہیں ملتی۔''

نصوح : ''میں تم سے اس بات کی شکایت کرنے والا تھا کہ جب سے میں بیمار ہو کر اٹھا ہوں، تم نے اتنا بھی نہ پوچھا کیا ہوا، کیوں کر ہوا۔ کیا تم کو میری عادات میں فرق معلوم نہیں ہوتا؟''

فہمیدہ : ''رات دن کا تفاوت، زمین و آسمان کا فرق۔ اور پوچھنے کو تمھارے سر کی قسم کئی بار منہ تک بات آئی، مگر تمھارا ڈھنگ دیکھ کر جرأت نہ ہوئی کہ پوچھوں۔''

نصوح : ''ڈھنگ کیسا؟''

فہمیدہ : ''برا ماننے کی بات نہیں، مزاج تمھارا سدا کا تیز ہے۔ یوں ہی سب لوگ تم سے ڈرتے رہتے ہیں۔ جب سے بیمار ہو کر اٹھے ہو سب کو خوف تھا کہ ایک تو کریلا، دوسرے نیم چڑھا۔ پہلے ہی سے بلا کا غصہ ہے، اب بیماری کے بعد کیا ٹھکانہ ہے۔ ادھر تم کو دیکھا تو کسی کی طرف ملتفت نہ پایا۔ سمجھے کہ ضرور طبیعت برہم اور مزاج نا درست ہے۔ پھر کس کی جرأت، کس کو اتنی ہمت جو پوچھے، دریافت کرے؟''

نصوح : ''کیوں صاحب، کبھی تم نے مجھ کو میرے مزاج کی خرابی پر متنبہ نہ کیا؟''

فہمیدہ : ''تنبیہ کرنا درکنار، بات کرنے کا تو یارا ہی نہ تھا۔''

نصوح : ''لیکن ان دنوں تو میں کسی پر نا خوش

نہیں ہوا۔"

فہمیدہ: "گھر بھر کو اس کا تعجب ہے۔"

نصوح: "آخر لوگ اس کا کیا سبب قرار دیتے ہیں؟"

فہمیدہ: "لوگ یہ کہتے ہیں کہ وبا میں کثرت سے لوگوں کو مرتے دیکھا۔ اپنے گھر تین موتیں ہو گئیں۔ خود بیمار پڑے اور خدا کے گھر سے پھر کر آئے۔ دل میں ڈر بیٹھ گیا ہے۔ تمہارے بڑے صاحبزادے یہ تجویز کرتے ہیں کہ ڈاکٹر نے جو اسہال بند کرنے کی دوا دی، دماغ میں گرمی چڑھ گئی ہے۔ بہر کیف سب کی یہی رائے ہے کہ علاج کرنا چاہیے۔"

نصوح: "نہ گرمی ہے، نہ خلل دماغ، خوف البتہ ہے۔"

فہمیدہ: مرد ہو کر تم اتنے ڈر گئے۔ آخر ہم سب بھی تو اس آفت میں تھے۔"

نصوح: "تم ہرگز اس آفت میں نہ تھیں۔"

فہمیدہ: "یعنی یہ کہ میں نے ہیضہ نہیں کیا۔ لیکن تمہارا ہیضہ کرنا مجھ کو اپنے مرنے سے زیادہ شاق تھا۔"

نصوح: "نہیں ہیضہ کرنے کی بات نہیں۔ بیماری اگرچہ ظاہر بیں سخت تھی مگر میں تم سے کہتا ہوں کہ شروع سے آخر تک میرے ہوش و حواس سب درست تھے۔ تمہاری ساری باتیں میں سنتا اور سمجھتا تھا۔ ابتدائے علالت

میں جو تم لوگوں نے ہیضۂ امتلائی تجویز کیا ، پھر صبح کو حکیم صاحب تشریف لائے اور میری کیفیت تم نے آن سے بیان کی ، پھر ڈاکٹر آئے اور انھوں نے دوا پلائی ؛ مجھ کو سب خبر ہے ۔ جب تم لوگوں نے ڈاکٹر کے کہنے سے مجھ کو علیحدہ دالان میں لٹایا تو مجھ کو غنودگی سی آ گئی اور میں نے اپنے تئیں دوسرے جہان میں دیکھا ۔''

اس کے بعد نصوح نے خواب کا سارا ماجرا حرف بہ حرف بی بی سے بیان کیا ۔ مردوں کی نسبت عورتوں کے دلوں میں نرمی اور رقت زیادہ ہوتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ مذہبی تعلیم عورتوں میں جلد اثر کرتی ہے ۔ فہمیدہ نے جو میاں کا خواب سنا ، اس قدر خوف اس پر طاری ہوا کہ قریب تھا کہ غش آ جائے ۔ نصوح اگرچہ تنہائی میں اپنے گناہوں پر تأسف کر کے ہر روز دو چار مرتبہ رو لیا کرتا تھا اور ظاہر میں نہیں بھی روتا تھا ، تو اندر سے اس کا دل ہر وقت روتا رہتا تھا ، اب بی بی کی ہم دردی اور ہم دمی کا سہارا پا کر تو اتنا رویا کہ گھگھی بندھ گئی ۔ فہمیدہ پہلے ہی خوف زدہ ہو رہی تھی ، میاں کا رونا اس کے حق میں اونگھتے کو ٹھیلتے کا بہانہ ہوا ۔ اس نے بھی بلبلا کر رونا شروع کیا ۔ پھر تو میاں بی بی ایسا روئے کہ ساون بھادوں کا ساں بندھ گیا ۔ وہ بھی ایک عجیب وقت تھا کہ دو میاں بی بی اپنے اپنے گناہوں کو یاد کر کے رو رہے تھے ۔

آخر نصوح نے اپنے تئیں سنبھالا اور بی بی سے کہا کہ دنیا میں اگر کوئی چیز رونے کے قابل ہے تو میرے نزدیک گناہ اور خدا کی نافرمانی ہے اور بس ، کیوں کہ کوئی

معصیت ، کوئی آفت ، گناہ سے بڑھ کر نہیں ۔ دنیا کے نقصانوں پر رونا بے فائدہ دیدے کھونا ہے ، مگر گناہ پر رونا گویا داغ الزام کو دھونا ہے ۔ رونا کفارۂ معصیت ہے ۔ رونا گنہ گار کے لیے بہترین معذرت ہے ۔ رونا رحمت کی دلیل اور مغفرت کا کفیل ہے ۔ لیکن ہم کو اپنی آئندہ زندگی کا انتظام بھی کرنا ضرور ہے ۔ ندامت وہی سند ہے کہ افعال مابعد میں اس کا اثر ظاہر ہو ۔ توبہ وہی پکی ہے کہ آدمی جو دل سے سوچے یا منہ سے کہے ویسا ہی کر دکھائے ۔''

فہمیدہ : ''لیکن اتنی عمر اس خرابی میں بسر کی ، اب نجات اور مغفرت کی کیا امید ہے ۔ میں تو جانتی ہوں کہ ہمارا مرض علاج سے درگزرا ۔''

نصوح : ''خدا کی رحمت سے مایوس ہونا بھی کفر ہے ۔ وہ بڑا بے نیاز ، بڑا غفورالرحیم ہے ۔ کچھ اس کو ہماری عبادت کی پرواہ نہیں ۔ اگر روئے زمین کے تمام آدمی اس کی نافرمانی کریں ، تو اس کی ابدی اور دائمی سلطنت میں ایک سر مو برابر بھی فرق نہیں آئے گا اور اس طرح اگر تمام زمانہ فرشتہ سیرت ہو جائے اور سارے آدمی شبانہ روز مصروف عبادت رہیں تو اس کی عظمت اور کبریائی میں ایک رائی کے دانے کے قدر بھی زیادتی اور افزونی نہ ہو گی ۔ اگر خدا کو اپنی پرستش اور عبادت ہی کرانی منظور ہوتی تو وہ نافرمان ، گنہ گار ، سرکش ، متمرّد انسان کی جگہ فرشتے پیدا کر سکتا تھا ۔ پھر یہ باتیں جو ہم پر فرض و واجب کی گئی ہیں ، ہماری ہی اصلاح ہماری ہی بہبود کے لیے۔ اور اس میں بھی شک نہیں کہ اس میں پرلے سرے کا رحم اور

غایت درجے کا حلم ہے ۔ لاکھ گناہ کرو ، جہاں عجز و الحاح کیا ، منت و ساجت سے پیش آئے ، بس پھر کچھ نہیں ۔

اگر خشم گیرد بہ کردار زشت
چو باز آمدی ماجرا در نوشت[۱۸]!

وہ معبود جابر نہیں ، سخت گیر نہیں ، کینہ ور نہیں ۔ مگر ہے کیا کہ غیور بڑا ہے ۔ اس کی مطلق برداشت نہیں کہ کسی کو اس کا شریک خدائی گردانا جائے ۔''

فہمیدہ : ''کتنا ہی عفوو درگزر کیوں نہ ہو ، مگر اپنے گناہوں کی بھی کچھ انتہا ہے ۔ ماں باپ کو جیسی اولاد کی ماتا ہوتی ہے ، ظاہر ۔ مگر دیکھو کاہم کی حرکتوں سے میرا تمہارا دونوں کا جی آخر کھٹا ہو ہی گیا ۔ کتنی برداشت ، کہاں تک چشم پوشی ؟''

نصوح : ''خدا کی پاکیزہ اور کامل صفتوں کو آدمی کی ناقص و ناتمام عادتوں پر قیاس کرنا بڑی غلطی ہے ۔ تمام دنیا کے ماں باپوں کو جو اولاد کی محبت ہے ، وہ ایک شمہ ہے ، اس عنایت بےغایت اور لطف و شفقت بے منت کا ، جو خداوند کریم ہر حال میں اپنے بندوں پر فرماتا ہے ۔ گناہ اور نافرمانی انسان کے خمیر میں ہے ۔ اگر بندوں کے گناہ پر اس کی نظر ہوتی تو ہر متنفس کشتنی اور گردن زدنی تھا ۔ دنیا کاہے کو بستی ۔ لیکن اللہ رے درگزر! گناہ بھی ہو رہے ہیں اور رزق کا راتب جو سرکار سے بندھا ہے

---

۱۸ ۔ اگر وہ برے عمل پر ناراض بھی ہوتا ہے تو جب تو باز آ جائے تو وہ درگزر کر دیتا ہے ۔

موقوف ہونا کیسا ، کبھی ناغہ بھی تو نہیں ہوتا ۔ سانس لینے کو ہوا تیار ، پینے کو پانی موجود ، آرام کرنے کو رات ، کام کرنے کو دن ، رہنے کو مکان ۔ وہی چاند ، وہی سورج ، وہی آسمان ، وہی زمین ، وہی برسات ، وہی فواکہ و نباتات ۔ جملہ اعضا ہاتھ پاؤں ، آنکھ کان اپنی اپنی خدمت پر مستعد ، نہ ماندگی ، نہ کسل ، نہ تکان ۔ پس جب کہ خدا ایسے گناہ اور ایسی ایسی نافرمانیوں پر نیکی سے نہیں چوکتا ، تو یہ بات اس کی ذات ستودہ صفات سے بہت ہی مستبعد معلوم ہوتی ہے کہ اس کی درگاہ میں معذرت کی جائے اور نہ بخشے ، توبہ کی جائے اور قبول نہ کرے ۔''

اسی وقت میاں بی بی دونوں نے دعا کے واسطے ہاتھ پھیلا دیے اور گڑگڑا گڑگڑا کر اپنے اور ایک دوسرے کے گناہوں کی مغفرت چاہی ۔ اس کے بعد فہمیدہ مسرت و اطمینان کی سی باتیں کرنے لگی ۔ مگر نصوح کی افسردہ دلی بدستور باقی تھی ۔ تب فہمیدہ نے پوچھا کہ جب توبہ کرنے سے گناہوں کا معاف ہو جانا یقینی ہے اور آئندہ کے واسطے ہم عہد کرتے ہیں کہ پھر ایسا نہ کریں گے ، تو کیا وجہ ہے کہ تم اداس ہو ؟

نصوح : ''ایمان خوف ورجا کا نام ہے ۔ توبہ کا قبول کیا جانا کچھ ہمارا استحقاق نہیں ۔ خدائے تعالیٰ قبول کرے تو اس کی عنایت ہے ، اور قبول نہ کرے تو ہم کو نہ مقام گلہ ہے ، نہ محل شکایت ۔ آئندہ کے عہد پر کیا بھروسہ ہو سکتا ہے ۔ انسان مخلوق ضعیف البنیان ہے ۔ غفلت اس کی طینت ہے اور نافرمانی اس کی طبیعت ۔ خدا ہی توفیق

خیر دے تو عہد کا نباہ اور وعدے کا ایفا ممکن ہے ، ورنہ آدمی سے کیا ہو سکتا ہے ۔

کیا فائدہ فکر بیش و کم سے ہوگا
هم کیا ہیں کہ کوئی کام ہم سے ہوگا
جو کچھ کہ ہوا ہوا کرم سے تیرے
جو کچھ ہوگا ترے کرم سے ہوگا

اور میری افسردگی کی ایک وجہ اور ہے کہ کسی طرح اس سے میرا قلب مطمئن نہیں ہوتا ۔"

فہمیدہ : "وہ کیا۔؟"

نصوح : "وہ یہ ہے کہ میں تو بگڑا ہی تھا ، میں نے ان بچوں کو کیسا غارت کیا ۔ میری دیکھا دیکھی یہ بھی گئے گزرے ہوئے ۔ تم دیکھتی ہو کہ چھوٹے بڑے سب ایک رنگ میں ہیں ۔ کسی کو بھی دین داری سے مس ہے ؟ کوئی بھی خدا پرستی کی طرف رغبت رکھتا ہے ؟ اور رغبت ہو تو کہاں سے ہو ۔ نہ تو گھر میں دین و مذہب کا چرچا کہ خیر دوسروں کو دیکھ کر آدمی نصیحت پکڑے ، نہ کوئی کہنے اور سمجھانے والا کہ نیک و بد کا امتیاز سکھائے ۔ بلکہ حق تو یہ ہے کہ میں ان کی تباہی اور خرابی میں ہرطرح کی مدد کرتا رہا ۔ افسوس ہے کہ میں نے ان کے حق میں کانٹے بوئے ، ان کے ساتھ دشمنی کرتا رہا اور جانا کہ میں ان کی بہتری چاہتا ہوں ۔ میں جو غور کرتا ہوں تو کھیل کود کی جتنی عادتیں خراب ہیں ، حقیقت میں ان کا بانی اور معلم میں ہوں ۔ میں نے ان کا

جی بہلانے کو کھلونے اور کنکوے لے دیے ہیں ۔ میں ان کو خوش کرنے کی نظر سے بازار ساتھ لے لے گیا ۔ میں نے ان کو دام دے دے کر بازاری سودوں کی چاٹ لگائی ۔ جانور پالنے میں نے ان کو سکھائے ۔ میلے تماشے ان کو میں نے دکھائے ۔ خوش وضعی ، خوش لباسی کی لت آن کو میں نے ڈلوائی ۔ میں خود عیب مجسم کا ایک بڑا نمونہ ان کے پیش نظر تھا ۔ جو جو کچھ یہ کرتے ہیں ، ماں کے پیٹ سے لے کر نہیں آئے ؛ مجھ سے سیکھا ، میری تقلید کی ۔ میں ہرگز اس نعمت کے لائق نہ تھا کہ مجھ کو بچوں کا باپ بنایا جائے ۔ میں کسی طرح اس عنایت کے شایان نہ تھا کہ مجھ کو ایک بھرے کنبے کی سرداری ملے ۔ یہ بھی میرے نصیبوں کی شامت اور ان کی بدقسمتی تھی کہ ان کی پرداخت مجھ کو سپرد ہوئی ۔ افسوس ، سن تمیز کو پہنچنے سے پہلے یہ یتیم کیوں نہیں ہو گئے ۔ شیر خوارگی ہی میں میرا سایۂ زبوں ان کے سر پر سے کیوں نہیں اٹھا لیا گیا کہ دوسرا ان کی تربیت کا متکفّل ہوتا جو اپنی خدمت کو مجھ سے بدرجہا بہتر انجام دیتا ۔ غضب ہے کہ یہ اشراف کے بچے کہلائیں اور پاجیوں کی عادتیں رکھیں ۔ مجھ کو اب ان کی شکل زہر معلوم ہوتی ہے ۔ صورت ، سیرت ، ظاہر ، باطن ایک سے ایک خراب ، ایک سے ایک بدتر ۔

ایک نابکار کو دیکھو کہ وہ ماش کے آٹے کی طرح ہر وقت اینٹھا ہی رہتا ہے ۔ کبھی سینے پر نظر ہے ، کبھی بازوؤں پر نگاہ ہے ۔ آدم زاد ہو کر لقّا کبوتر کا پٹھا بنا پھرتا ہے ۔ اتنا اکڑتا ہے ، اتنا اکڑتا ہے کہ گردن گدی

میں جا لگی ہے ۔ کپڑے ایسے چست کہ گویا بدن پر سیے گئے ہیں ۔ چھاتی پر انگرکھے کے بند ہیں ۔ گھٹنوں تک پائجامے کی چوڑیاں پڑی ہیں ۔ ایک دیولی برابر ٹوپی ہے کہ خود بہ خود گری پڑتی ہے ۔ دوسرا ناھنجار ، صبح اٹھا اور کبوتر کھول باپ دادے کا نام اچھالنے کوٹھے پر چڑھا ۔ پھر سوا پہر دن چڑھے تک کوٹھے پر دھا چوکڑی مچائی ۔ مارے باندھے مدرسے گیا ۔ عصر کے بعد سے پھر کوٹھا ہے اور کنکوا ہے ۔ شام ہوئی اور شطرنج بچھا ۔ اتوار کو مدرسے سے چھٹی ملی تو بٹیریں لڑائیں ۔ تیسرے نالائق ، بڑے میاں سو بڑے میاں چھوٹے میاں سبحان اللہ ، محلہ نالاں ، ھمسائے عاجز ۔ اس کو مار ، اس کو چھیڑ ، چاروں طرف ایک تراہ تراہ مچ رھی ہے ۔ غرض کچھ اس طرح کے بے سرے بچے ہیں ، ناھموار ، آوارہ ، بے ادب ، بے تمیز ، بے حیا ، بے غیرت ، بے ھنر ، بد مزاج ، بد زبان ، بد وضع کہ چند روز سے دیکھ دیکھ کر میری آنکھوں میں خون اترتا ہے ۔ ان کی حرکات و سکنات ، نشست و برخاست کوئی بھی تو بھلے مانسوں کی سی نہیں ۔ گالی دینے میں ان کو باک نہیں ، فحش بکنے میں ان کو تامل نہیں ، قسم ان کا تکیہ کلام ہے ۔ نہ زبان کو روک ہے نہ منہ کو لگام ہے ۔ ان کی چال ھی کچھ عجیب طرح کی اکھڑی اکھڑی ہے کہ بے تہذیبی ان کی رفتار سے ظاھر ہے ۔

رھیں لڑکیاں ، میں تسلیم کرتا ہوں کہ ان میں اس طرح کے عیوب نہ ہوں گے جو لڑکوں میں ہیں ۔ لیکن ساتھ ھی مجھ کو اس کا یقین ہے کہ دین دارانہ زندگی تو کسی

کی بھی نہیں ۔ ان کو بھی اکثر گڑیوں میں مصروف پاتا ہوں ، یا کنبے میں کوئی تقریب ہونے والی ہوتی ہے تو کپڑوں کا اہتمام کرتے ہوئے دیکھتا ہوں ۔ لڑکے گالیاں بہت بکتے ہیں تو لڑکیاں کوسنے کثرت سے دیا کرتی ہیں ۔ قسم کھانے میں جیسے وہ بے باک ہیں ، یہ بھی بے دھڑک ہیں ۔ بہر کیف کیا لڑکے کیا لڑکیاں ، میرے نزدیک تو دونوں ایک ہی طرح کے ہیں ۔ ان سب کی یہ تباہ حالت دیکھ کر میں زہر کے سے گھونٹ پی کر رہ جاتا ہوں ۔ مگر پھر دیکھتا ہوں تو ان کا کچھ بھی قصور نہیں ۔ خطا اگر ہے تو میری اور تمہاری ۔ ان کے عیوب پر جھڑکنا اور ملامت کرنا کیسا ، ہم نے کبھی ان کو روکا تک بھی تو نہیں ۔''

فہمیدہ : ''تم تو باہر کے اٹھنے بیٹھنے والے ٹھہرے ، اس میں تو میرا ہی سراسر قصور ہے ۔ بچے ابتداء میں ماؤں ہی سے زیادہ مانوس ہوتے اور ماؤں ہی کی خو بو پکڑتے ہیں ۔ بلکہ تم جب کبھی ان کو نصیحت کرتے اور کسی بات پر گھرکتے تو میں الٹی ان کی حمایت لیتی تھی ۔ ان سب کو میں نے خراب کیا اور اس کا الزام بالکل میری گردن پر ہے ۔''

نصوح : ''بے شک تم نے بھی ان کی اصلاح میں کوشش نہیں کی ۔ لیکن پھر بھی میں باپ تھا ۔ تم سے ان کی پرورش متعلق تھی اور مجھ سے ان کی اصلاح و تہذیب ۔''

فہمیدہ : ''ہاں میں نے ان کے بدنوں کو پالا اور ان کی روحوں کو تباہ اور ہلاک کیا ۔ میری ہی بیہودہ

محبت نے ان کی عادتیں بگاڑیں ۔ میرے ہی نامعقول لاڈ پیار نے ان کے مزاجوں کو گندہ ، ان کی طبیعتوں کو بے قابو بنایا ۔''

نصوح : ''لیکن اگر میں اپنے کام پر آمادہ و سرگرم ہوتا تو ممکن نہ تھا کہ میں کہوں اور نہ سنیں ، میں چاہوں اور نہ کریں ۔ آخر میں ان پر ضابط تھا ۔ میں ان پر ہر طرح کی قدرت رکھتا تھا ۔ اور نہ صرف ان پر بلکہ تم پر اور سارے گھر پر ۔''

فہمیدہ : ''پھر بھی جس قدر برائیاں مجھ پر ظاہر ہوتی رہتی تھیں ، ان کا شاید دسواں حصہ بھی تم پر منکشف نہ ہوتا ہوگا ۔ جان بوجھ کر میری عقل پر پردہ پڑ گیا ۔ دیکھتے بھالتے میں اندھی بنی رہی ۔ اب بھی جو جو خرابیاں ان کی میں جانتی ہوں تم کو معلوم نہیں ۔ دیکھو لڑکیاں ہی ہیں کہ تم گڑیاں کھیلنے اور کپڑوں کا اہتمام کرنے کے سوائے ان کے حالات سے محض بے خبر ہو ۔ میں جانتی ہوں کہ ان کے مزاجوں میں کیا کیا خرابیاں ہیں ، ان کی عادتوں میں کیسے کیسے بگاڑ ہیں ۔''

نصوح : ''پھر آخر کیا کرنا ہوگا ؟''

فہمیدہ : ''میرے گمان میں ان بچوں کی اصلاح تو اب ہمارے امکان سے خارج ہے ۔''

نصوح : ''البتہ ناممکن نہیں تو نہایت دشوار ہونے میں بھی کچھ شک نہیں ۔''

فہمیدہ : ''دشوار تم ہی کہو ۔ آسمان میں تھگی کا

لگانا ممکن ہے اور ان کی اصلاح ممکن نہیں ۔ ادھر کی دنیا ادھر ہو جائے ، مگر یہ درست ہونے والے نہیں ۔ کیا تم نہیں دیکھتے کہ کلیم ایک بات کے سو سو جواب دینے کو موجود ہے اور ایک کلیم پر کیا الزام ہے ، جتنے بڑے وتنے کڑے ، جتنے چھوٹے وتنے کھوٹے ۔"

نصوح : "تو کیا ان کو اسی گم راہی میں رہنے دیں کہ اور بد تر ہوں ۔ ان کو بہ اختیار خود چھوڑ دیں کہ پیٹ بھر کر خراب ہوں ؟"

فہمیدہ : "بڈھے طوطوں کا پڑھانا ، پکی لکڑی کا لچکانا ، تم سے ہو سکے تو بسم اللہ ۔ کیا خدا نخواستہ میں مانع و مزاحم ہوں ۔ مگر میں ایسی ان ہونی کا بیڑا نہیں اٹھاتی ۔ ایاز قدر خود بشناس ۔ میں خوب جانتی ہوں کہ بیٹوں کی نظروں میں میرا کتنا وقر ہے ، بیٹیاں کتنا میرا ادب لحاظ کرتی ہیں ۔ رشتے میں ماں ضرور ہوں مگر افتاد سے مجبور ہوں ، کوئی میرے بس کا نہیں ۔"

نصوح : "لیکن تم خود کہتی تھیں کہ بچوں کی اصلاح تم پر فرض تھی اور جب تک مادری و فرزندی تعلق باقی ہے ، وہ فرض تمھاری گردن پر لدا ہے ۔ میں نے ایک دن بڑے سویرے نہیں معلوم کس بچے کو چاہا کہ باہر حکیم کو لے جا کر دکھا دوں ۔ تم اس وقت اس کا منہ دھلانے کو اٹھیں ۔ میں جلدی کرتا تھا اور تم کہتی تھیں کہ ذرا صبر کرو منہ دھلا دوں ، کرتا بدل دوں ۔ اس حالت سے لے جاؤ گے ، تو حکیم صاحب کیا کہیں گے کہ گھر والی کیسی پھوہڑ ہے کہ بچوں کو ایسا ناصاف رکھتی

ہے ۔ بے شک وہ بات تمہاری بہت معقول تھی ۔ لیکن جب یہ تمہارے بچے گندی روح اور ناپاک دل لے کر خدا کے حضور میں جائیں گے تو کیا تم پھوہڑ نہیں بنو گی ۔ وہاں یہ معذوری ، یہ مجبوری کچھ نہیں سنی جائے گی ۔ علاوہ اس کے ، کیوں کر تمہاری محبت اقتضا کرتی ہے کہ تم اپنے فرزندوں کو مبتلائے مصیبت دیکھو اور ان کو اس مصیبت سے نکالنے کی کچھ تدبیر نہ کرو ، اس واسطے کہ وہ مصیبت ان پر بہت دنوں سے ہے اور میرے اور تمہارے سبب سے ہے ۔ کیا مدت کے بیمار کو دوا نہیں دیتے ، پرانے ناسور کا علاج نہیں کرتے ؟ اولاد کی اصلاح ماں باپ پر فرض ہے ۔ اگر اس فرض کو ہم نے غفلت اور بے وقوفی سے اب تک ادا نہیں کیا تو کیا ضرور ہے کہ آئندہ بھی معصیت ترک فرض میں گرفتار رہیں ۔

فہمیدہ : ''کچھ مجھ کو انکار نہیں ، گریز نہیں ۔ نہ میں یہ کہتی ہوں کہ بچوں کی اصلاح ہم پر فرض نہ تھی یا اب نہیں ہے ۔ بلکہ مجھ کو ان کی اصلاح سے یاس کلی ہے اور میں جانتی ہوں کہ ان کی اصلاح و تہذیب اور تادیب و تعلیم میں کوشش فضول ہے ، سعی عبث ، تدبیر بے سود ، محنت رائگاں ۔ بھلا کہیں ٹھنڈے لوہے بھی پیٹنے سے درست ہوئے ہیں ۔''

نصوح : ''آہا ۔ لیکن ہم پر اسی قدر لازم ہے کہ کوشش کریں اور نتیجے کا مرتب ہونا ، اثر کا پیدا کر دینا ہمارا کام نہیں ۔ یہ خدا کے اختیار میں ہے اور کون جانے کہ خدا ہمارے ارادے میں برکت ، ہماری تدبیر میں

تاثیر دے اور یہ درست ہو جائیں ، تو کیا تم کو مسرت نہ ہو گی - کوشش میں ناکام رہنا اور مطلقاً کوشش نہ کرنا ، ان دو باتوں میں زمین آسمان کا فرق ہے - انجام دونوں کا ایک ہو ، مگر کوشش کرنا ہمارے لیے ایک وجہ برأت ہے۔''

فہمیدہ : ''اس بات کا فیصلہ میرے اور تمھارے درمیان میں ہونا ممکن نہیں ، اس واسطے کہ میری حالت اور ہے ، تمھاری حالت اور - اول تو بچوں پر تمھارا رعب داب ہے - تم سے پھر بھی ڈرتے ہیں اور میرے ساتھ تو سب کے سب اس قدر گستاخ ہیں کہ بیٹیاں تو خیر مجھ کو برابر کی سہیلی سمجھتی ہیں ، بیٹے تو اتنا بھی نہیں جانتے کہ یہ کون بلا ہے اور کیا بکتی ہے - دوسرے ، تم کو اپنے بچوں کی یہ کیفیت بہ خوبی معلوم نہیں اور میں ان کے رگ و ریشے سے واقف ہوں -''

نصوح : ''یہ سب سچ ہے ، لیکن تمھاری باتوں کا خلاصہ یہ ہے کہ اب ان کی اصلاح بڑا مشکل کام ہے -''

فہمیدہ : ''پھر تم نے بات کو بدلا - میں نے اپنے منہ سے مشکل ہرگز نہیں کہا - میں تو شروع سے ناممکن اور محال ہی کہے جاتی ہوں -''

نصوح : ''بڑے افسوس کی بات ہے کہ اتنی دیر سے میں تمھارے ساتھ بک رہا ہوں اور تم نہیں سمجھتیں - کیوں صاحب ، ناممکن اور محال کیوں ہے ؟''

فہمیدہ : ''اگر تم کہو تو میں تمھاری خاطر سے مان لوں - لیکن چوں کہ تم میری رائے پوچھتے ہو تو میں

۔ شک ناممکن اور محال ہی سمجھتی ہوں اور وجہ یہ ہے کہ ان کی عادتیں راسخ ہوتے ہوتے طبیعت ہوگئی ہیں ۔ برابر کے بیٹے ، برابر کی بیٹیاں ۔ مار ہم نہیں سکتے ، گھرک ہم نہیں سکتے، جبر ہم نہیں کر سکتے ۔ بھلا پھر ان عادتوں کو جن کے وہ مدتوں سے خوگر ہو رہے ہیں ، کیوں کر چھڑا دیں گے؟''

نصوح : ''تو تمھارا مطلب یہ ہے کہ کوئی تدبیر کارگر سمجھ میں نہیں آتی اور جو سمجھ میں آتی ہے وہ کارگر نہیں معلوم ہوتی ۔''

فہمیدہ : ''وہ ایک ہی بات ہے ۔''

نصوح : ''اس سے مجھ کو بھی انکار نہیں کہ معمولی تدبیریں اب محض بے سود ہیں ۔ مادہ سخت ہے ، تو جلاب بھی کوئی بڑا ہی کڑا دینا ہو گا ۔ جو کام پہلے ایک بات سے نکلتا اب جوتی لات سے بھی نکلنے کی امید نہیں ۔''

فہمیدہ : ''لیکن اگر بچوں کے ساتھ تم اس طرح کی سختی برتو گے تو تمام دنیا تھڑی تھڑی کرے گی اور سختی سے بچوں کے دلوں میں دونی ضد اور نفرت پیدا ہو گی ۔''

نصوح : ''اگر میں یہ سمجھوں کہ میں اپنے ذمے کا ایک فرض ادا کرتا ہوں تو دنیا کے کہنے کی ان شاءاللہ مجھ کو مطلق پروا نہ ہو گی ۔ لوگوں کو اختیار ہے جو چاہیں سمجھیں اور جو چاہیں سو کہیں ۔ لیکن سختی میرے نزدیک ایک تدبیر نا مناسب ہے اور میں خوب سمجھتا ہوں کہ بڑے لڑکے کسی طرح سختی کی برداشت نہیں کر سکتے اور اگر

ان کے ساتھ خشونت اور درشتی سے پیش اؤں گا تو بالکل اُلٹا اثر ہوگا اور جب کہ میں خود ان کی خرابی کا باعث ہوا ہوں تو سختی کا میں سزاوار ہوں نہ کہ وہ ۔''

فہمیدہ : ''بھلا پھر سختی کرو گے نہیں اور نرمی سے کام نکلتا نہیں ۔ اسی نرمی نے تو ان کو اس ہدڑے تک پہنچایا ۔ تو آخر وہی بات ہوئی کہ ہونا ہوانا کچھ نہیں ، ناحق کا درد سر ہے ۔''

نصوح : ''میں تو اس شعر پر عمل کروں گا : ۔

درشتی و نرمی بہم در بہ ست
چو رگ زن کہ جراح و مرہم نہ ست[۱۹]

نرمی کی جگہ پر نرمی اور سختی کے محل پر سختی ۔ اور میرا دل گواہی دیتا ہے کہ ان شاء اللہ میں اپنے ارادے میں کام یاب ہوں گا ۔ آخر آدمی کے بچے ہیں ، بات کو سمجھتے ہیں ، عقل رکھتے ہیں ۔ جب اُن ہی کے فائدے کی بات میں ان سے کہوں گا تو کب تک نہ سمجھیں گے اور سختی تو بس اسی قدر میں عمل میں لاؤں گا کہ یہ بات بہ خوبی ان کے ذہن نشین کر دوں گا کہ جو میرے کہنے کا نہیں ، میں اس کا اور وہ میرا شریک رنج و راحت نہیں ۔ یہی کہوں گا اور ان شاء اللہ یہی کر دکھاؤں گا ۔ مگر بے تمھاری مدد کے یہ ارادہ پورا نہیں ہو سکتا ۔''

---

۱۹ ۔ سختی اور نرمی دونوں کا ساتھ ساتھ ہونا (یعنی دونوں سے کام لینا) بہتر ہے ۔ جیسے رگ کھولنے والا (فصّاد) جو زخم بھی لگاتا ہے اور مرہم بھی رکھتا ہے ۔

فہمیدہ : ''میں دل و جان سے مدد کرنے کو موجود ہوں ۔ میں جانتی ہوں کہ تم ان ہی کی بہتری کے واسطے کہتے اور کرتے ہو ۔ اپنی اولاد کا فائدہ ہوتے ساتے اگر میں کوتاہی کروں تو ماں کاہے کو ہوئی ، کوئی ڈائن ہوئی ۔''

نصوح : ''تم میرے شریک حال رہو تو مجھ کو ہر طرح کی تقویت ہے ۔ میں جانتا ہوں کہ بچے بات بات میں تمہارا آسرا ، تمہارا سہارا پکڑتے ہیں ۔ ہو میری بیوی مگر معاملات خانہ داری میں میرے کل فیصلوں کی اپیل تمہارے یہاں ہوتی ہے ۔ میں تم کو الزام نہیں دیتا ، اس واسطے کہ تم سے زیادہ میں خود ملزم ہوں ۔ لیکن بچوں میں سے جس کو تم نے زیادہ پیار کیا ، وہی زیادہ خوار ہوا ۔ ہر چند میں نے کوشش کی ، کسی امر دینی کے واسطے نہیں بلکہ معمولی پڑھنے لکھنے کے واسطے ، مگر جب تک تمہاری تائید نہیں ہوئی ایک نہیں چلی ۔''

فہمیدہ : ''لیکن اب وہ کیفیت نہیں ہے ۔ جب تک چھوٹے تھے مجھ کو ماں سمجھتے تھے اور میں ان کی فریاد سنتی تھی ، حمایت کرتی تھی ۔ اب ہر ایک اپنے دل کا بادشاہ ہے ۔ لڑکوں سے تو کچھ تعلق ہی نہیں رہا ۔ ہفتوں بات چیت کرنے کا اتفاق بھی نہیں ہوتا ۔ پکارتی پکارتی رہ جاتی ہوں ، منہ پھیر کر بھی نہیں دیکھتے ۔ لڑکیاں البتہ کہاں جائیں اور کس کے پاس جائیں ، گھر ہی میں بیٹھی کھیلا کرتی ہیں ۔ میں گھر کے کام دھندے میں لگی رہتی ہوں ۔ لیکن پھر بھی جہاں تک تمہارے نیک ارادے میں

کہ خدا ان کو پورا کرے ، مجھ سے مدد مل سکتی ہے تو تم دیکھ لینا ، ان شاء اللہ اپنے مقدور بھر اٹھا نہ رکھوں گی ۔"

نصوح : "بھلا چھوٹے چھوٹے بچوں کو سنبھال لو گی ؟"

فہمیدہ : "ان کا درست کر لینا کیا مشکل ہے ۔ یہ تو موم کی ناک ہیں ، جدھر کو پھیر دو پھر گئے ۔ بلکہ شاید ان کو منہ سے کہنے کی بھی ضرورت نہ ہو ۔ بچوں کا قاعدہ ہے کہ جیسا بڑوں کو کرتے دیکھتے ہیں ، خواہ مخواہ اس کی نقل کرنے لگتے ہیں ۔ ابھی تھوڑی دیر ہوئی حمیدہ نے مجھ کو رلا رلا دیا ہے ۔ کیا تو اس کی چھ برس کی بساط ہے ، مگر ماشاء اللہ میرے منہ میں خاک ، مغز سے اتار کر بڑے بوڑھوں کی سی باتیں کرتی ہے ۔"

نصوح : "کیا ہوا تھا ؟"

فصل سوم

فہمیدہ اور منجھلی بیٹی حمیدہ کی گفتگو

فہمیدہ : ''تم کو جو اب چند روز سے نماز پڑھتے دیکھتی ہے تو پرسوں مجھ سے پوچھنے لگی کہ اماں جان دن میں کئی مرتبہ ابا جان ہاتھ منہ دھو کر یہ کیا کیا کرتے ہیں ؟ پہلے دیر تک بڑے ادب سے ہاتھ باندھے کھڑے رہتے ہیں ، چپکے چپکے کچھ باتیں کرتے جاتے ہیں - پھر جھکتے ہیں ، پھر منہ کے بل گر پڑتے ہیں -''

مَیں : ''بیٹی نماز پڑھتے ہیں -''

حمیدہ : ''اماں جان نماز کیا ؟''

اس استعجاب کے ساتھ پوچھنا ، یہ پہلی چٹکی[1] تھی کہ اس نے میرے دل میں لی -

مَیں : ''بیٹی ، خدا کی عبادت کو نماز کہتے ہیں -''

حمیدہ : ''امّاں جان خدا کیا چیز ہے اور عبادت اس

---

۱ - یعنی پہلے پہل دل میں اپنی اس کوتاہی کا احساس پیدا ہوا کہ اولاد کی صحیح تربیت سے ہم نے غفلت برتی ہے -

کی کون ہے ؟"

اس کا بھولے پن سے یہ پوچھنا تھا کہ خدا کیا چیز ہے اور عبادت اس کی کون ہے کہ میرے بدن کے رونگٹے کھڑے ہوگئے[۲] ۔

مَیں : "کیوں ، کیا تم خدا کو نہیں جانتیں ؟"

حمیدہ : "میں سب لوگوں کو خدا کی قسم کھاتے تو سنتی ہوں اور جب کبھی اماں جان ، تم خفا ہوتی ہو تو کہا کرتی ہو خدا کی مار ، اور تجھ سے خدا سمجھے ۔ شاید خدا بیچا[۳] کو کہتے ہیں مگر بیچا ہوتی تو اس کی قسم نہ کھاتے ۔"

مَیں : "حمیدہ توبہ کرو توبہ ، خدا بیچا نہیں ہے ۔ خدا وہ ہے جس نے ہم سب کو پیدا کیا ہے ۔ وہی روزی دیتا ہے ، وہی مارتا ہے ، وہی جلاتا ہے ، وہی پالتا ہے ۔"

حمیدہ : "کیا اماں جان تم کو بھی خدا نے پیدا کیا ہے ؟"

مَیں : "ہاں مجھ کو بھی ۔"

حمیدہ : "اور ابا جان کو بھی ؟"

مَیں : "ہاں تمہارے ابا جان کو بھی ۔"

---

۲ - اپنی غفلت پر ندامت کے احساس اور خوف خدا سے ۔

۳ - ہوا ۔ بچوں کو ڈرانے کے لیے ایک فرضی جانور ۔ کہیں اسے "بھچگا" اور کہیں "بگوا" بھی کہتے ہیں ۔

حمیدہ : ''اور ننھی بوا[۴] کو بھی ؟''

مَیں : ''ہاں ننھی بوا کو بھی ۔''

حمیدہ : ''اماں جان ، کیا ہر روز ہمارے گھر میں کھانا نہیں پکتا ؟''

مَیں : ''کیوں نہیں پکتا ۔''

حمیدہ : ''پھر تم تو کہتی ہو کہ خدا سب کو کھانے کو دیتا ہے ۔''

مَیں : ''اللہ میاں پانی برساتے ہیں ۔ اللہ میاں غلے اور میوے اور ترکاریاں ہم لوگوں کے واسطے زمین میں اگاتے ہیں ۔ وہی ہم سب لوگ کھاتے ہیں ۔''

حمیدہ : ''ننھی بوا کو تو اماں جان تم دودھ پلاتی ہو ۔''

مَیں : ''دودھ بھی اللہ میاں ہی اتارتے ہیں ۔ تمہاری ہی دفعہ اسی دودھ کے پیچھے برسوں مصیبت اٹھائی ۔ چھٹی تک الغاروں[۵] دودھ تھا ۔ چھٹی نہا کر اٹھی کہ یکایک جاڑا چڑھا ۔ بخار آیا تو کس شدت کا کہ الاماں ۔ تمام بدن سے

---

۴ ۔ چھوٹی بہن ۔ بوا عورتوں کی زبان میں ایسا لفظ ہے جو کہیں احتراماً رشتے میں بڑی عورتوں کے لیے اور کہیں پیار سے چھوٹوں کے لیے بولا جاتا ہے ۔

۵ ۔ الغار ، ترکی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی جھنڈ کے ہیں ۔ اردو میں کثرت یا بہتات کے لیے جمع کے صیغے میں بولا جاتا ہے ۔

آنچ نکلتی تھی ۔ وہ پھر بھر کا بخار آنا اور دودھ کا تاؤ[۶] کھا جانا ۔ پھر بہتیری ستاول[۷] پھانکی ، زیرہ پیا ، حکیم کا علاج کیا ۔ تمہارے دادا جان ، خدا جنت نصیب کرے ، ہر روز صبح کو طشتری[۸] لکھ دیا کرتے تھے ۔ مگر دودھ کچھ ایسی گھڑی کا سوکھا تھا کہ پھر نہ آترا پر نہ آترا۔ جب دیکھا کہ بچی بھوک کے مارے پھڑکی[۹] چلی جاتی ہے ، چارو ناچار انا رکھی اور وہ عذاب اٹھائے کہ خدا دشمن کو بھی نہ دکھائے ۔ خدا نے زندگی بخشی تھی کہ تم پل گئیں ۔''

حمیدہ : ''تو اللہ میاں بڑے اچھے ہیں ۔ ہم سب کو کھانے کو دیتے ہیں ۔ ہماری ننھی بوا کے واسطے دودھ آتارتے ہیں ۔ لیکن اماں جان ، اللہ میاں سے ہمارا کچھ رشتہ ناتا ہے کہ اتنے سلوک کرتے ہیں ؟''

میں : ''رشتہ ناتا یہ کہ ہم ان کے بندے ہیں ۔ مرد ان کے غلام ہیں ، عورتیں ان کی لونڈیاں ہیں ۔''

حمیدہ : ''لونڈی غلاموں کے ساتھ اتنا سلوک کہ کوئی اپنے بچوں کے ساتھ بھی نہیں کرتا ۔ لیکن لونڈی غلام

---

۶ ۔ دودھ کے ساتھ 'تاؤ کھا جانا' ، محاورے میں خشک ہو جانے کا مفہوم رکھتا ہے ۔

۷ ۔ یہ چیزیں دودھ بڑھانے کے لیے استعمال کی جاتی ہیں ۔

۸ ۔ چینی کی طشتری پر زعفران سے آیات لکھتے ہیں اور پانی میں گھول کر مریض کو پلاتے ہیں ۔ دعا ، تعویذ ، جھاڑ پھونک کی طرح یہ عمل بھی ہر طرح کے امراض میں کیا جاتا ہے ۔

۹ ۔ تڑپتی یا مچلتی رہتی ہے ۔ دھلی اور نواح دھلی کا محاورہ ہے ۔

تو اپنے مالک کی خدمت کرتے ہیں ، ٹہل کرتے ہیں ۔ ہم
اللہ میاں کا کون سا کام کرتے ہیں ؟"

میں : "یہی نماز جو تم نے اپنے باپ کو پڑھتے دیکھی
اور جس کو عبادت کہتے ہیں ۔"

حمیدہ: "ہاں ! نماز اللہ میاں کا کام ہے تو سب ہی
کو نہ پڑھنی چاہیے ، کیوں کہ لونڈی غلام سب ہیں ،
اللہ میاں کی دی ہوئی روٹی سب کھاتے ہیں ۔"

میں : "بے شک خدا کی عبادت سب پر فرض ہے ۔"

حمیدہ : "اماں جان تم تو نماز نہیں پڑھتیں ۔ کیا تم
اللہ میاں کی لونڈی نہیں ہو ، اور کیا تم اس کی دی ہوئی
روٹی نہیں کھاتیں ؟" حمیدہ نے جو سادہ دلی اور بھولے پن
سے یہ الزام دیا ، مجھ کو اس قدر شرم آئی کہ زمین پھٹ
گئی ہوتی تو میں سما جاتی ۔

میں : "میں لونڈی بے شک ہوں اور خدا ہی کی
دی ہوئی روٹی کھاتی ہوں لیکن کیا بعضی لونڈیاں نکمی ،
کام چور ، نمک حرام اور بے غیرت نہیں ہوتیں ۔ ویسی ہی
اللہ میاں کی ایک لونڈی میں ہوں ۔"

حمیدہ : "ابا جان بھی تو اب بیماری سے اٹھ کر نماز
پڑھنے لگے ہیں ۔ کیا اس سے پہلے وہ خدا کی دی ہوئی روٹی
نہیں کھاتے تھے ۔"

یہ سن کر نصوح کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو
ٹپک پڑے ۔

مَیں : ''وہ بھی برا کرتے تھے ۔''

حمیدہ : ''اچھی اماں جان ! اللہ میاں خفا ہوئے ہوں گے ۔''

مَیں : ''خفا ہونے کی تو بات ہی ہے ۔''

حمیدہ : ''ایسا نہ ہو کہ روٹی بند کر دیں تو پھر ہم کہاں سے کھائیں گے اور اگر ننھی بوا کا دودھ سوکھ گیا تو ہماری ننھی روئے گی ۔'' یہ کہہ کر حمیدہ رونے لگی ۔ میں نے اٹھا کر گلے سے لگا لیا اور پیار کیا ۔ لیکن جس قدر میں اس کو تسلی دیتی تھی وہ اور دگنا روتی تھی ۔ مجھ سے بھی ضبط نہ ہو سکا اور مجھ کو روتے دیکھ کر اور بھی بے تاب ہو گئی ۔ آخر بڑی مشکلوں سے میں نے اس کو سنبھالا اور کہا کہ حمیدہ تم ڈرو مت ۔ اللہ میاں کا یہ دستور نہیں ہے کہ جو لونڈی غلام کام نہ کریں ان کا کھانا بند کر دیں ۔

حمیدہ : ''سچ ؟''

مَیں : ''ہاں ہاں ۔ تم گھبراؤ مت ۔''

حمیدہ : ''اچھی اماں جان ! ننھی کو پلا کر دیکھو دودھ ہے یا نہیں ۔''

مَیں : ''بیٹی ، ننھی کو سونے دو اور دودھ سے اطمینان رکھو ۔ دودھ بخدا کا دیا ہوا بہت ہے ۔''

حمیدہ : ''ہمارے گھر میں تو لونڈی غلام نہیں ،

نوکر چاکر ہیں مگر کام نہیں کرتے تو تنخواہ کاٹ لی جاتی ہے ۔ ابا جان جرمانہ کر دیتے ہیں ۔ گھر سے نکال دیتے ہیں ۔ اللہ میاں اپنے لونڈی غلاموں پر بھی خفا نہیں ہوتے تو ایسے مالک کا کام تو اور بھی جی لگا کر کرنا چاہیے ۔ کیا کام نہ کرنا اور کھانا بے غیرتی نہیں ہے ۔"

مَیں : "بڑی بے غیرتی کی بات ہے ؟"

حمیدہ : "اماں جان ، میں نے تو آج تک نماز نہیں پڑھی اور نہ مجھ کو نماز پڑھنی آتی ہے اور تم تو دن رات میں دو ہی مرتبہ کھانا کھاتی ہو ، میں نہیں معلوم کتنی دفعہ کھاتی ہوں ۔ مجھ پر اللہ میاں ضرور خفا ہوں گے ۔" یہ کہہ کر پھر حمیدہ روئی اور ڈر کے مارے دوڑ کر مجھ سے لپٹ گئی اور پھر میں نے سمجھایا کہ حمیدہ ڈرو مت ۔ اللہ میاں تم سے ناخوش نہیں ہیں ۔ ابھی تم بچی ہو ، تم کو نماز معاف ہے ۔

حمیدہ : "کھانا تو مجھ کو بھی سب کے برابر بلکہ سب سے اچھا اور زیادہ ملتا ہے ۔"

مَیں : "ہاں ملتا ہے اور یہ بھی خدا کی مہربانی ہے کہ تم کو کام معاف کر رکھا ہے ۔"

حمیدہ : "پھر اللہ میاں مجھ کو کیوں کھانا دیتے ہیں؟"

مَیں : "اس واسطے کہ جب بڑی ہو جاؤ تو اس کے بدلے کا بہت سا کام کرو ۔"

حمیدہ : "لیکن کیا اب میں کام نہیں کر سکتی ؟

دیکھو ، میں تم کو پان بنا دیتی ہوں ، ابا جان کو پانی پلا دیتی ہوں ، ننھی بوا کو بہلا لیتی ہوں ۔ کیوں اماں جان کرتی ہوں ؟"

میں : "ہاں بوا ہاں ، تم تو میرے بہت کام کرتی ہو ۔ پنکھا جھل دیتی ہو ، دھاگا بٹ[۱۰] دیتی ہو ، سوئی میں دھاگا پرو دیتی ہو ، جو چیز مجھ کو درکار ہوتی ہے ، لے آتی ہو ۔"

حمیدہ : "تو کیا میں اللہ میاں کا کوئی چھوٹا سا کام بھی نہیں کر سکتی ؟ کیا نماز پڑھنا مشکل کام ہے ؟ میں تو دیکھتی ہوں ، ابا جان ہاتھ منہ دھو کر ہاتھ باندھے کھڑے رہتے ہیں ۔ کیا اتنا مجھ سے نہیں ہو سکتا ؟"

مَیں : "اس کے سوا کچھ پڑھنا بھی ہوتا ہے ، جس کو تم کہتی تھیں کہ چپکے چپکے باتیں کرتے جاتے ہیں ۔"

حمیدہ : "وہ کیا باتیں ہیں ؟"

مَیں : "خدا کی تعریف اور اس کے احسانوں کا شکریہ ، اپنے گناہوں کا اقرار اور اُن کی معافی کی درخواست ، اس کے رحم کی تمنا ، اس کے فضل کی آرزو ؛ بس یہی نماز ہے ۔"

حمیدہ : "یہ سب باتیں اسی طرح نہ کرتے ہوں گے ، جیسے ہم لوگ آپس میں گفتگو کرتے ہیں ۔"

---

۱۰ - پہلے جب گھروں میں چرخہ کاتنے کا رواج عام تھا تو عورتیں کچے سوت کے دو دو دھاگے ملا کر بٹ لیتی تھیں اور انسے سینے پرونے میں استعمال کرتی تھیں ۔

مَیں : ''اور کیا ۔''

حمیدہ : ''مگر ابا جان تو کچھ اور ہی طرح کی بولی بولنے لگتے ہیں ۔''

مَیں : ''وہ عربی زبان ہے ۔''

حمیدہ : ''وہ تو میری سمجھ میں نہیں آتی ۔ اماں جان تم جانتی ہو ؟''

مَیں : ''نہیں میں بھی نہیں جانتی ۔''

حمیدہ : ''تو کیا خدا سے عربی ہی زبان میں باتیں کرنی ہوتی ہیں ؟''

مَیں : ''نہیں وہ سب کی بولی سمجھتا ہے ۔ بلکہ وہ دلوں کے ارادوں اور طبیعتوں کے منصوبوں سے واقف ہے ۔''

حمیدہ : ''یہ کیوں کر ؟''

مَیں : ''اس واسطے کہ وہ ہر وقت ہر جگہ موجود ہے ۔ کوئی چیز ، کوئی بات اس سے مخفی نہیں ۔ سب کو دیکھتا ہے ، سب کی سنتا ہے ، اگلے پچھلے کل حالات اس کو معلوم ہیں ۔''

حمیدہ : ''(گبھرا کر) کیا اللہ میاں یہاں ہمارے گھر میں بھی بیٹھے ہیں ؟''

مَیں : ''گھر میں کیا ہمارے پاس بیٹھے ہیں مگر ہم ان کو دیکھ نہیں سکتے ۔''

یہ سن کر حمیدہ نے جلدی سے اوڑھنی اوڑھ لی اور

سنبھل کر مؤدب ہو بیٹھی اور مجھ سے بھی آہستہ سے کہا ، ''اماں جان سر ڈھک لو ۔'' اس کے بعد حمیدہ پر کچھ ایسی ہیبت غالب آئی کہ میری گود میں تھوڑی دیر تک چپ پڑی رہی ۔ آخر آنکھ لگی [۱۱]، سو گئی ۔ میری ٹانگیں سن ہونے لگیں ، تو میں نے آہستہ سے چارپائی پر لٹا کر پیدارا کو پاس بٹھا دیا کہ دیکھ ہاتھ رکھے رہیو ، ایسا نہ ہو لڑکی سوتے سوتے ڈر کر چونک پڑے اور میں یہاں چلی آئی ۔ مجھ کو حمیدہ کی باتوں سے ایسا ڈر لگا کہ اندر سے کلیجہ تھرتھر کانپا جاتا تھا ۔''

نصوح : ''کیوں ، ڈر کی اس میں کیا بات تھی ؟''

فہمیدہ : ''میں کہتی تھی کہ ایسی چھوٹی سی لڑکی اور ایسی باتیں ۔ کچھ اس کو ہو تو'' نہیں گیا ۔

نصوح : ''مذہب میں بڑی خوبی اور عمدگی تو یہی ہے کہ وہ ایسی باتوں کی تعلیم کرتا ہے جن کو ہر شخص سمجھ سکتا ہے ۔ مسائل دینی آدمیوں کے بنائے ہوئے معمے اور لوگوں کی گھڑی ہوئی پہیلیاں نہیں ہیں کہ ان کے حل کرنے اور بوجھنے کو بڑا غور و خوض درکار ہو ، بلکہ اس حکیم برحق کے باندھے ہوئے اصول اور ٹھہرائے ہوئے ضابطے ہیں ۔ اور اصول بھی کیسے سلیس اور آسان ، ضابطے سہل اور بدیہی ۔ نہیں معلوم انسان کی عقل پر کیا پتھر پڑے ہیں کہ اتنی موٹی بات اس کی سمجھ میں نہیں آتی کہ زمین ، آسمان ، چاند ، سورج ، ستارے ، انواع و اقسام کے حیوانات ، رنگ برنگ کے نباتات ، ساری دنیا ، تمام زمانہ ،

---

۱۱ - کوئی آسیبی خلل - جن بھوت کا سایہ ۔

اتنا بڑا کارخانہ جس میں ایک پتا اٹھا کر دیکھو تو ہزار ہا صنعتوں سے بھرا ہوا ہے ، آخر خود بہ خود تو نہیں ہو گیا ۔ ضرور کوئی اس کا بنانے والا ہے اور پھر اس نے جو انسان کو ایک خاص صفت عقل عطا کی ہے ، کچھ تو اس تخصیص کا مطلب ہے ۔ مگر ہے کیا کہ انسان اس تصور کو اپنے ذہن میں آنے ہی نہیں دیتا ، ورنہ ساری خدائی خدا کی گواہی دے رہی ہے :

برگ درختان سبز در نظر ہوشیار
ہر ورقے دفتریست معرفت کردگار[۱۲]

حمیدہ نے کوئی بات اچنبھے کی نہیں کہی ۔ اچنبھے کی بات تو یہ ہے کہ ہم میں نادان بچوں کے برابر بھی عقل نہیں ۔ ڈوب مرنے کی جگہ ، زمین میں گڑ جانے کا مقام ہے ۔ بلکہ حمیدہ کی باتوں کو میں ایک نیک فال اپنی کام یابی کی سمجھتا ہوں ۔ افسوس ہے ، تم اس کو میرے پاس نہ لے آئیں ۔ اس کی ہر ہر بات لوح دل پر کندہ کرنے کے لائق ہے اور یہ باتیں اس نے کیا کہیں ، خدا نے اس کے منہ سے کہلوائیں ۔ بیٹی کیا ہے ، سچ پوچھو تو ہمارے لیے ہدایت کا فرشتہ ہے ۔ اور بچے جو معصوم کہلاتے ہیں ، اسی سبب سے کہ ان کے دل لوث دنیا سے پاک اور تیرگیٔ گناہ سے صاف ہوتے ہیں ۔ الحمدللہ کہ ایک سے تو اطمینان ہوا ۔ اب یہ بتاؤ کہ اوروں کے واسطے کیا انتظام کرنا ہوگا ؟"

فہمیدہ : "تم ہی کوئی تجویز سوچو ۔"

---

۱۲ - ہوش مند آدمی کی نگاہ میں ہرے بھرے درختوں کا ہر پتا معرفت الٰہی کی کتاب کا ایک ورق ہے ۔

نصوح : ''میں نے تو یہ سوچا تھے کہ لڑکیوں کو تو تم سنبھالو اور لڑکوں کو میں سمجھ لوں گا۔''

فہمیدہ : ''بھلا میں بھی تو سمجھوں کیوں کر سمجھ لو گے، کہ وہی تدبیر میں بھی کروں۔''

نصوح : ''میں پہلے چھوٹوں سے شروع کروں گا۔ امید ہے کہ جلد راہ پر آ جائیں۔ بڑوں کا مجھ کو بڑا کھٹکا تھے۔ یہ تو میں خوب جانتا ہوں کہ یہ نیا ڈھنگ دیکھ کر ان کے کان کھڑے ہوں گے مگر نہیں معلوم کس سے کیا معاملہ پیش آئے۔ تم اتنا کرو کہ ایک تو میرا تمھارا دونوں کا کام ایک ساتھ شروع ہو۔ جب اندر باہر دونوں جگہ ایک ہی بات کا چرچا ہوگا تو کوئی یہ نہ کہہ سکے گا کہ دیکھو، خاص کر ہمارے پیچھے پڑے ہیں۔ اولاد اولاد سب برابر، ان سے کچھ تعرض نہیں کرتے۔ دوسرے یہ کہ تمھاری ہر ادا[۱۳] سے یہ بات پیدا ہو کہ اس معاملے میں ہم دونوں کو ایک اہتمام خاص ہے۔ کیوں کہ ذرا سا ضعف بھی ظاہر ہوگا، تو تمام تر انتظام درہم برہم ہوجائے گا۔''

فہمیدہ : ''انشاء اللہ اس کے خلاف نہ ہوگا۔''

---

۱۳ - ہر عمل یا ہر ایک حرکت سے یہ بات ظاہر ہو۔ پیدا یہاں اپنے اصل مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔

فصل چہارم

نصوح اور چھوٹے بیٹے سلیم کی گفتگو

آج تو میاں بیوی میں یہ قول و اقرار ہوا۔ اگلے دن چھوٹا بیٹا سلیم ابھی سو کر نہیں اٹھا تھا کہ بیدارا نے آ جگایا کہ صاحب زادے اٹھیے، بالاخانے پر میاں بلاتے ہیں۔ سلیم کی عمر اس وقت کچھ کم دس برس کی تھی۔ سلیم نے جو طلب کی خبر سنی، گبھرا کر اٹھ کھڑا ہوا اور جلدی سے ہاتھ منہ دھو، ماں سے آ کر پوچھنے لگا: "اماں جان، تم کو معلوم ہے ابا جان نے کیوں بلایا ہے؟"

ماں: "بھائی، مجھ کو تو کچھ خبر نہیں۔"

سلیم: "کچھ خفا تو نہیں ہیں؟"

ماں: "ابھی تو کوٹھے پر سے بھی نہیں اترے۔"

سلیم: "بیدارا، تجھ کو کچھ معلوم ہے؟"

بیدارا: "میاں، میں اوپر لوٹا لینے گئی تھی۔ میاں اکیلے بیٹھے ہوئے کتاب پڑھ رہے تھے۔ میں آنے لگی تو میاں نے آپ کا نام لیا اور کہا کہ ان کو بھیج دیجیو۔"

سلیم : ''صورت سے کچھ غصہ تو نہیں معلوم ہوتا تھا ؟''

بیدارا : ''نہیں تو ۔''

سلیم : ''تو اماں جان ، ذرا تم بھی میرے ساتھ چلو ۔''

ماں : ''میری گود میں لڑکی سوتی ہے ۔ تم اتنا ڈرتے کیوں ہو ، جاتے کیوں نہیں ؟''

سلیم : ''کچھ پوچھیں گے ''

ماں : ''جو کچھ پوچھیں گے تم اس کا معقول طور پر جواب دینا ۔''

غرض سلیم ڈرتا ڈرتا اوپر گیا اور سلام کر کے الگ جا کھڑا ہوا ۔ باپ نے پیار سے بلا کر پاس بٹھا لیا اور پوچھا : ''کیوں صاحب ، ابھی مدرسے نہیں گئے ؟''

بیٹا : ''جی ، بس جاتا ہوں ۔ ابھی کوئی گھنٹے بھر کی دیر اور ہے ۔''

باپ : ''تم اپنے بھائی جان کے ساتھ مدرسے جاتے ہو یا الگ ؟''

بیٹا : ''کبھی کبھار بھائی جان کے ساتھ چلا جاتا ہوں ، ورنہ اکثر اکیلا جاتا ہوں ۔''

باپ : ''کیوں ؟''

بیٹا : ''اگلے مہینے امتحان ہونے والا ہے ۔ چھوٹے

بھائی جان اسی کے واسطے تیاری کر رہے ھیں ۔ صبح سویرے اٹھ کر کسی ھم جماعت کے یہاں چلے جاتے ھیں ۔ وھاں ان کو دیر ھو جاتی ھے ، تو پھر گھر بھی نہیں آتے ۔ میں جاتا ھوں تو اُن کو مدرسے میں پاتا ھوں ۔''

باپ : ''کیا اپنے گھر میں جگہ نہیں ھے کہ دوسروں کے یہاں جاتے ھیں ؟''

بیٹا : ''جگہ تو ھے ، مگر وہ کہتے تھے کہ یہاں بڑے بھائی جان کے پاس ھر وقت گنجفہ اور شطرنج ھوا کرتا ھے ؛ اطمینان کے ساتھ پڑھنا نہیں ھو سکتا ۔''

باپ : ''تم بھی شطرنج کھیلنی جانتے ھو ؟''

بیٹا : ''مُہرے پہچانتا ھوں ، چالیں جانتا ھوں ، مگر کبھی خود کھیلنے کا اتفاق نہیں ھوا ۔''

باپ : ''مگر زیادہ دنوں تک دیکھتے دیکھتے یقین ھے کہ تم بھی کھیلنے لگو گے ۔''

بیٹا : ''شاید مجھ کو عمر بھر بھی شطرنج کھیلنی نہ آئے گی ۔''

باپ : ''کیوں کیا ایسی مشکل ھے ؟''

بیٹا : ''مشکل ھو یا نہ ھو میرا جی ھی نہیں لگتا ۔''

باپ : ''سبب ؟''

بیٹا : ''میں پسند نہیں کرتا ۔''

باپ : ''چوں کہ مشکل ہے اکثر مبتدی گبھرایا کرتے ہیں ۔ مجھ کو یقین ہے کہ گنجفہ میں تمھاری طبیعت خوب لگتی ہوگی ۔ وہ بہ نسبت شطرنج کے بہت آسان ہے ۔''

بیٹا : ''میں شطرنج کی نسبت کر[1] گنجفہ کو زیادہ تر نا پسند کرتا ہوں ۔''

باپ : '' ہاں شطرنج میں طبیعت پر زور پڑتا ہے اور گنجفہ میں حافظے پر ۔''

بیٹا : ''میری نا پسندیدگی کا کچھ خاص کر یہی سبب نہیں ہے ، بلکہ مجھ کو سارے کھیل برے معلوم ہوتے ہیں ۔''

باپ : ''تمھاری اس بات سے مجھ کو تعجب ہوتا ہے اور میں تم سے تمھاری نا پسندیدگی کا اصلی سبب سننا چاہتا ہوں ، کیوں کہ شاید اب سے پانچ یا چھ مہینے پہلے ، جن دنوں میں باہر کے مکان میں بیٹھا کرتا تھا ، میں نے خود تم کو ہر طرح کے کھیلوں میں نہایت شوق کے ساتھ شریک ہوتے دیکھا تھا ۔''

بیٹا : ''آپ درست فرماتے ہیں ۔ میں ہمیشہ کھیل کے پیچھے دیوانہ بنا رہتا تھا ، مگر اب تو مجھ کو ایک دلی نفرت ہوگئی ہے ۔''

باپ : ''آخر اس کا کوئی سبب خاص ہوگا ۔''

---

۱ ۔ آگرہ اور کان پور کے دونوں ابتدائی ایڈیشنوں میں 'نسبت کر' لکھا ہوا ہے ۔ بہ نسبت کی جگہ یہ متروک ترکیب نذیر احمد کے یہاں بھی کم دیکھی گئی ہے ۔ اس کتاب میں صرف دو جگہ آئی ہے ۔

بیٹا : ''آپ نے اکثر چار لڑکوں کو کتابیں بغل میں دابے گلی میں آتے جاتے دیکھا ہوگا ۔''

باپ : ''وہی جو گورے گورے چار لڑکے ایک ساتھ رہتے ہیں ۔ پھڈّی جوتیاں پہنے ، منڈے ہوئے سر ، اونچے پاجامے ، نیچی چولیاں ۔''

بیٹا : ''ہاں جناب وہی چار لڑکے ۔''

باپ : ''پھر ؟''

بیٹا : ''بھلا آپ نے کبھی ان کو کسی قسم کی شرارت کرتے بھی دیکھا ہے ؟''

باپ : ''کبھی نہیں ۔''

بیٹا : ''جناب کچھ عجب عادت ان لڑکوں کی ہے۔ راہ چلتے ہیں تو گردن نیچی کیے ہوئے ۔ اپنے سے بڑا مل جائے ، جان پہچان ہو یا نہ ہو ، ان کو سلام کر لینا ضرور ۔ کئی برس سے اس محلے میں رہتے ہیں ، مگر کانوں کان خبر نہیں ۔ محلے میں کوڑیوں لڑکے بھرے پڑے ہیں ، لیکن ان کو کسی سے کچھ واسطہ نہیں ۔ آپس میں اوپر تلے کے چاروں بھائی ہیں ۔ نہ کبھی لڑتے ، نہ کبھی جھگڑتے ، نہ گالی بکتے ، نہ قسم کھاتے ، نہ جھوٹ بولتے ، نہ کسی کو چھیڑتے ، نہ کسی پر آوازہ کستے ۔ ہمارے ہی مدرسے میں پڑھتے ہیں ، وہاں بھی ان کا یہی حال ہے ۔ کبھی کسی نے ان کی چھوٹی شکایت بھی تو نہیں کی ۔ ڈیڑھ بجے ایک گھنٹے کی چھٹی ہوا کرتی ہے ۔ لڑکے کھیل کود میں

لگ جاتے ہیں ۔ یہ چاروں بھائی ایک پاس کی مسجد میں نماز پڑھنے چلے جاتے ہیں ۔''

باپ : ''بھلا پھر ؟''

بیٹا : ''منجھلا لڑکا میرا ہم جماعت ہے ۔ ایک دن میرا آموختہ یاد نہ تھا ۔ مولوی صاحب نہایت ناخوش ہوئے اور اس کی طرف اشارہ کر کے مجھ سے فرمایا کہ بہ کم بخت گھر سے گھر ملا ہے ۔ اسی کے پاس جا کر یاد کر لیا کر ۔ میں نے جو پوچھا : ''کیوں صاحب یاد کرا دیا کرو گے ؟'' تو کہا : ''بہ سر و چشم ۔'' غرض میں اگلے دن ان کے گھر گیا ، آواز دی ۔ انھوں نے مجھ کو اندر بلا لیا ۔ دیکھا کہ ایک بہت بوڑھی سی عورت تخت پر جائے نماز بچھائے قبلہ رو بیٹھی ہوئی کچھ پڑھ رہی ہیں ۔ وہ ان لڑکوں کی نانی ہیں ۔ لوگ ان کو حضرت بی کہتے ہیں ۔ میں سیدھا سامنے دالان میں اپنے ہم جماعت کے پاس جا بیٹھا ۔ جب حضرت بی اپنے پڑھنے سے فارغ ہوئیں تو انھوں نے مجھ سے کہا کہ بیٹا ، گو تم نے مجھ کو سلام نہیں کیا لیکن ضرور ہے کہ میں تم کو دعا دوں ۔ جیتے رہو ، عمر دراز ، خدا نیک ہدایت دے ۔ ان کا یہ کہنا تھا کہ میں غیرت کے مارے زمین میں گڑ گیا اور فوراً میں نے اٹھ کر نہایت ادب کے ساتھ سلام کیا ۔ تب حضرت بی نے فرمایا کہ بیٹا ، برا مت ماننا ، یہ بھلے مانسوں کا دستور ہے کہ اپنے سے جو بڑا ہوتا ہے اس کو سلام کر لیا کرتے ہیں اور میں تم کو نہ ٹوکتی لیکن چوں کہ تم میرے بچوں کے ساتھ اٹھتے بیٹھتے ہو ، اس سبب سے مجھ کو جتا دینا ضرور تھا ۔ اس کے بعد حضرت بی

نے مجھ کو مٹھائی دی اور بڑا اصرار کر کے کھلائی ۔ مدتوں میں ان کے گھر جاتا رہا ۔ حضرت بی بھی مجھ کو اپنے نواسوں کی طرح چاہنے اور پیار کرنے لگیں اور مجھ کو ہمیشہ نصیحت کیا کرتی تھیں ۔ تبھی سے میرا دل تمام کھیل کی باتوں سے کھٹا ہو گیا ۔''

باپ : ''یہ تو تم نے اچھا اختصار کیا ۔ اجی ، سب باتیں مجھ کو سناؤ ۔ کیا کیا تم سے حضرت بی نے کہا ۔''

بیٹا : ''ہر روز آنے جانے سے میں ان لوگوں کے ساتھ خوب بے تکلف ہو گیا ۔ مگر حضرت بی نے بس پہلے دن سلام نہ کرنے پر ٹوکا تھا پھر کوئی گرفت نہیں کی ۔ با وجودے کہ میں شوخی بھی کرتا تھا لیکن وہ خبر[۲] نہیں ہوتی تھیں ۔ ایک دن مجھ سے اور ایک ہمسائے کے لڑکے سے ، باہر گلی میں کھیلتے کھیلتے ، عین انھی کے دروازے پر لڑائی ہو پڑی ۔ سخت کلامی کے بعد ذلی گلوچ کی نوبت پہنچی ۔ پھر مار کٹائی ہونے لگی ۔ لڑکا مجھ سے تھا کمزور ۔ ذرا اڑنگے[۳] پر چڑھا جو ایک پٹخنی دیتا ہوں ، چاروں شانے چت ۔ پھر تو میں اس کی چھاتی پر چڑھ بیٹھا اور بچہا[۴] کو ایسے

---

۲ - پروا نہیں کرتی تھی ۔ یہ محاورہ متروک ہے ۔

۳ - اڑنگے پر چڑھانا (یا ڈالنا) : پہلوانوں کی اصطلاح میں ایک داؤ جس میں حریف کی ٹانگ میں اپنی ٹانگ ڈال کر گراتے ہیں ۔

۴ - بچہا (بروزن چچا) : کلمۂ تحقیر ، جو عموماً چھوٹوں کے لیے بے تکلف بول چال میں آتا ہے ۔

گھسے دئیے [۵] کہ یاد ہی کیے ہوں گے اور لوگ چھڑا نہ دیتے تو میں اس کو ادھ موا کر ہی چکا تھا ۔ بارے دو چار آدمیوں نے مجھ کو اس پر سے اُتارا اور دو ایک نے میری پیٹھ بھی ٹھوکی کہ شاباش پٹھے شاباش ۔ لیکن وہ لڑکا ایسا چیمند باز تھا کہ پھر خم ٹھوک کر سامنے آ کھڑا ہوا ۔ میں چاہتا تھا کہ پھر گتھ جاؤں ، اتنے میں اندر سے اسی میرے ہم جماعت نے آواز دی ۔ ادھر لوگوں نے کہا کہ میاں جانے دو یہ تمھارے جوڑ کا نہیں ہے ۔ غرض میں اندر چلا گیا ۔ میرے ہم جماعت نے پوچھا : ''کیوں جی ، کس سے لڑ رہے تھے ؟'' میں نے کہا : ''میاں یہی کنجڑے والا رمضانی ، کمزور ، مار کھانے کی نشانی ۔ لیکن خدا کی قسم میں نے بھی آج اس کو ایسا رگڑا ہے کہ یاد ہی تو کرے گا ۔'' اس وقت تک غصہ اور طیش تو فرو ہوا ہی نہ تھا ، نہیں معلوم کیا کیا میں نے بکا کہ سب گھر والوں نے سن کر آنکھیں نیچی کر لیں اور بڑی دیر تک سرنگوں بیٹھے رہے ۔ آخر حضرت بی بولیں کہ سلیم ، بڑے افسوس کی بات ہے کہ تو ایسا پیارا لڑکا اور گن تیرے ایسے خراب ۔ اس منہ سے ایسی باتیں ! آج کئی دن سے میں تجھ کو سمجھانے والی تھی ۔ مگر اس وقت جو میں نے تیری گفتگو سنی ، مجھ کو یقین ہو گیا کہ تجھ کو سمجھانا بے سود ہے ۔ بڑا رنج تو مجھ

---

۵ - گھسے دینا : یعنی رگیدنا یا زمین پر رگڑے دینا ۔ نذیر احمد اپنی محاورہ بازی کی دھن میں یہ بھول گئے کہ باپ کے سامنے سلیم جیسے مہذب بیٹے کی گفتگو کا یہ شوخ و بے تکلف انداز کس قدر نازیبا ہے ۔ اس گرمیٔ گفتار کی ایک توجیہ یہ ہوسکتی ہے کہ سلیم اس واقعے کو یاد کر کے جوش میں آ گیا تھا ۔

کو اسی بات کا ہے کہ تو ہاتھ سے گیا گزرا ہوا ۔ دوسرا کھٹکا یہ ہے کہ تو میرے لڑکوں کے پاس آتا جاتا ہے ۔ اگر خدا نہ خواستہ تیری خو بو کا ایک شمہ[6] انہوں نے اختیار کیا تو میری طرف سے یہ جیتے جی مر لیے ۔ ملنا جلنا تو بڑی بڑی بات ہے ، اب یہ محلہ مجھ کو چھوڑنا پڑا ۔ اتنی بے حیائی ، ایسی بد زبانی ! اول تو لڑنا ، اور پھر گلی کوچے میں اور اس پر ایسی موٹی موٹی گالیاں !"

مَیں : "جناب خدا کی قسم ، ہرگز میں نے پہل نہیں کی ۔ وہ سر پر چڑھ کر مجھ سے لڑا ۔"

حضرت بی : "بس اپنی قسموں کو بند کرو ۔ میں قسم اور گالی دونوں کو برا سمجھتی ہوں ۔ جس کو بے موقع بے محل خدا کا نام لینے میں باک نہیں ، اس کو کسی بات کے بک دینے میں تامل نہیں ۔

مَیں : "گالی بھی پہلے اس نے مجھ کو دی ۔"

حضرت بی : "تم نے کیوں گالی کھانے کی بات کی؟"

مَیں : "یہی تو میں عرض کرتا ہوں کہ میرا مطلق قصور نہ تھا ۔"

حضرت بی : "کیا ایسے بے ہودہ لڑکوں سے ملاقات رکھنا تمہارا قصور نہیں ہے ؟"

مَیں : "جناب آپ کو معلوم نہیں ، وہ لڑکا راہ چلتوں کے سر ہوتا ہے ۔"

---

۶ ۔ ذرا سا اثر ۔ شمہ عربی میں خوشبو کو کہتے ہیں ۔ یہاں بو کی رعایت ملحوظ ہے ۔

حضرت بی : ''یک نہ شد دو شد ۔ دروغ گویم بر روئے تو ؎ ۔ میرے لڑکوں کے تو کوئی بھی سر نہیں ہوتا ؟''

مَیں : ''ان سے تو سرے سے جان پہچان ھی نہیں ۔''

حضرت بی : ''اور تم سے ھے ۔''

مَیں : ''کیوں کر کہوں کہ نہیں ھے ۔''

حضرت بی : ''ھے تو وھی تمھارا قصور ھے اور اسی کی یہ سزا ھے کہ تم نے بازار میں گالیاں کھائیں ۔''

مَیں : ''لیکن میں نے بھی خوب ھی بدلا لیا ۔''

حضرت بی : ''بس یہی تو تمھاری خرابی کے لچھن ھیں کہ اس کو تم بدلا سمجھتے ھو ۔ اگر ایک شخص تمھارے ساتھ برائی کرے تو اس کو لوگ برا کہیں گے؟''

مَیں : ''ضرور کہیں گے ۔''

حضرت بی : ''اور جب تم اس کے ساتھ زیادہ برائی کرو تو کیا زیادہ برے نہ کہلاؤ گے ؟ گالی بکنا ایک زبون بات ھے ۔ اس نے بکیں تو جھک مارا اور تم نے زیادہ بکیں تو زیادہ جھک مارا ۔ سلیم، تم اپنے میں اور اس کنجڑے کے چھوکرے میں کچھ فرق سمجھتے ھو ؟''

یہ سن کر مجھ کو ندامت شروع ھوئی اور میں نے

؎ ۔ ایک (قصور) تو تھا ھی اس پر ایک اور ۔ جھوٹ بولوں وہ بھی تمھارے منہ پر ۔ فارسی کی دو مثلیں ایک ساتھ لائی گئی ھیں ۔

کہا کہ واقع میں اس وقت تو مجھ میں اور اس میں کچھ فرق نہ تھا ۔

حضرت بی : ”لیکن وہ ایک بازاری آدمی کا بیٹا ہے اور تم ایک بڑے عزت دار کے لڑکے ہو ۔ تمھارے دادا کا شہر میں وہ شہرہ ہے کہ ان کے نام کی لوگ تعظیم کرتے ہیں ۔ انھی کے پوتے تم ہو ؛ جھوٹ بولنے پر دلیر ، قسم کھانے میں بے باک ، فحش بکنے میں بے دھڑک ۔ سلیم ، کوئی شخص دین اور دنیا دونوں میں اس وجہ سے عزت نہیں پا سکتا کہ اس کے باپ دادا عزت دار تھے ۔ آدمی کی عزت اس کی عادت اور مزاج سے ہے ۔ کیا تم کہہ سکتے ہو کہ یہ عادتیں جو تم نے سیکھی ہیں ، عزت حاصل کرنے کی ہیں ؟ ہرگز نہیں ۔“

یہ سن کر مجھ کو اس قدر شرمندگی ہوئی کہ میں رونے لگا ۔ حضرت بی بھی آب دیدہ ہوئیں اور مجھ کو پاس بٹھا کر پیار کیا اور کہا کہ بیٹا ، میں تمھارے ہی فائدے کے لیے کہتی ہوں ۔ اب بھی کچھ نہیں گیا ۔ لیکن چند روز بعد تم کو ان عادتوں کا چھوڑنا بہت مشکل ہو جائے گا ۔ میں نے اسی وقت توبہ کی اور کہا کہ اگر اب سے آپ مجھ کو قسم کھاتے یا فحش بکتے یا جھوٹ بولتے یا بازاری لڑکوں میں کھیلتے سنیں تو مجھ کو اپنے گھر میں نہ آنے دیجیے گا ۔

باپ : ”کیا بس اسی دن سے تم کو کھیلنے سے نفرت ہو گئی ؟“

بیٹا : ”جناب نہیں ۔ مہینوں میں حضرت بی کے یہاں

جاتا رہا اور ہر روز نصیحت کی دو چار باتیں وہ مجھ کو بتایا کرتی تھیں ۔ ایک روز انھوں نے مجھ ہی سے میرے وقت کا حساب پوچھا ۔ میں نے سونا اور کھانا اور کھیلنا اور تھوڑی دیر لکھنا پڑھنا بہتیرے کام گنوائے ۔ مگر انھوں نے سن کر ایک ایسی آہ کھینچی کہ آج تک اس کی چوٹ میں اپنے دل میں پاتا ہوں اور کہا : ''سلیم، آٹھ پہر میں خدا کا ایک کام بھی نہیں ۔ خدا نے تم کو آدمی بنایا ، کیا ممکن نہیں تھا کہ وہ تم کو بلی یا کتا بنا دیتا ؟ پھر آدمی بھی بنایا تو ایسے خاندان کا جو عزت دار اور خوش حال ہے ۔ ہو سکتا تھا کہ تم مزدور یا لکڑھارے کے گھر پیدا ہوتے اور ایسی ہی چھوٹی سی عمر میں تم کو پیٹ پورا کرنے کے واسطے محنت کرنی پڑتی اور پھر بھی سوائے چبینے کے اور کچھ نہ پاتے اور وہ بھی پیٹ بھر کر نہیں ۔ ایک لنگوٹی تم باندھے پھرتے ۔ نہ پاؤں میں جوتی ، نہ سر پر ٹوپی ، نہ گلے میں انگرکھا ۔ جہاں جاتے دُر دُر ۔ جس کے پاس کھڑے ہوتے ، پھٹ پھٹ ۔ پھر صورت تم کو ایسی پاکیزہ دی کہ جو دیکھے پیار کرے ۔ کیا تم کو کالا بھٹ[۸] ، کانڑا ، لنگڑا ، کوڑھی بنا دینا اس کو مشکل تھا ۔ جس خدا کے تم پر اتنے سلوک اور اتنے احسان ہیں ، ستم ہے کہ دن رات میں ایک دفعہ بھی اس کے آگے سر نہ جھکاؤ ، غضب ہے کہ ایک لمحہ بھی اس کو یاد نہ کرو ۔'' تب حضرت بی نے مجھ کو نماز سکھائی ، اس کے معنی سمجھائے اور اسی طرح

---

۸ - چولھے کی طرح سیاہ و بد ہیئت ۔ بھٹ یعنی آتش دان یا چولھا ۔ اردو میں ''کانا'' کی جگہ ''کانڑا'' لکھنا یا بولنا غیر فصیح ہے ۔

آنھوں نے مجھ کو ہزارہا نصیحتیں کیں کہ بر زبان یاد نہیں رہیں ۔ مگر افسوس ہے کہ کئی مہینے سے ان کے گھر میرا جانا چھوٹ گیا ۔ یہ کہہ کر سلیم کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے ۔

باپ : ”کیوں ، تم نے کس لیے ان کے یہاں جانا ترک کیا ؟ کیا ان کے نواسوں سے لڑائی ہو گئی ؟“

بیٹا : ”جناب اُن کے نواسے مجھ کو بھائیوں سے کہیں زیادہ عزیز ہیں ۔ اگر میں ان سے لڑتا تو دنیا میں مجھ سے زیادہ نالائق کوئی نہ تھا ۔“

باپ : ”پھر کیا حضرت بی تم سے ناخوش ہو گئیں ؟“

بیٹا : ”استغفراللہ ۔ وہ تو خود اس درجے کی نیک ہیں کہ غصہ اُن کو چھو ہی نہیں گیا ۔“

باپ : تو کیا تم آپ سے بیٹھ رہے ؟“

بیٹا : ”میں تو ہر روز وہاں جانے کے واسطے تڑپتا ہوں ۔“

باپ : ”تو کیا یہاں تم کو کسی نے منع کر دیا ہے ؟“

بیٹا : ”نہیں کسی نے منع بھی نہیں کیا ۔“

باپ : ”پھر کیا سبب ہوا ؟“

بیٹا : ”اگر آپ مجھ کو اس کا سبب بیان کرنے سے معاف رکھتے تو بہتر تھا ۔“

باپ : ”نہیں ضرور ہے کہ میں تمھارے نہ جانے کا

سبب معلوم کروں۔''

بیٹا : ''اس میں ایک شخص کی شکایت ہو گی اور حضرت بی نے مجھ کو غیبت اور چغلی کی ممانعت کی ہے۔''

باپ : ''لیکن کیا وہاں نہ جانے سے تمہارا نقصان نہیں ہے ؟''

بیٹا : ''اے جناب ، نقصان سا نقصان ہے ! مگر میرے اختیار کی بات نہیں ۔''

باپ : ''تو میں تم کو اپنے منصب پدری کی رو سے حکم دیتا ہوں کہ تم سارا حال پوست کندہ بیان کرو ۔''

بیٹا : ''حضرت بی نے ایک مرتبہ مجھ کو بہ تاکید کہا تھا کہ تم اپنے سر کے بال منڈوا ڈالو ۔ اگرچہ مجھ کو بال بہت عزیز تھے اور میں ان کی خدمت بھی بہت کرتا تھا لیکن چوں کہ مجھ کو یقین تھا کہ حضرت بی جو بات کہتی ہیں ضرور میری منفعت کے واسطے کہتی ہیں ، میں نے کہا بہت خوب ۔ حضرت بی نے اور تو کچھ سبب نہیں بیان کیا مگر اتنا کہا کہ بالوں کی بزرگ داشت میں تمہارا بہت سا وقت صرف ہوتا ہے اور وقت ایسی چیز نہیں ہے کہ اس کو ایسی فضول باتوں میں صرف کیا جائے ، اور تم کو بڑے بال رکھنے کی کچھ ضرورت بھی نہیں ہے ۔ اگلے دن جو حجام بڑے بھائی جان کا خط بنانے آیا ، میں نے اس سے کہا کہ خلیفہ میرے بال بھی مونڈ دینا ۔ بالوں کا مونڈنا سن کر بڑے بھائی جان اس قدر خفا ہوئے کہ میں عرض نہیں کر سکتا ۔ مجھ کو جو چاہتے کہہ لیتے ۔ حضرت بی اور ان کے نواسوں

کے بھی بہت برا بھلا کہا ۔ یہ کہہ کر سلیم کی آنکھوں میں پھر آنسو بھر آئے۔''

باپ : ''تمھارے بڑے بھائی سے اور حضرت بی سے کیا واسطہ اور ان کو تمھارے افعال میں میرے ہوتے کیا دخل؟''

بیٹا : ''جناب ، نہیں معلوم ان کو کس طرح معلوم ہو گیا تھا کہ میں ان کے گھر آتا جاتا ہوں ۔ دو ایک مرتبہ مجھ سے پہلے بھی کہا تھا کہ تو ان مردہ شوقلاوذیوں[۹] کے ساتھ اکثر رہتا ہے ، کیا تو بھی ملانا اور مسجد کا ٹکڑ گدا بنے گا ؟ اس دن بالوں پر کہنے لگے : ''دیکھا ، آخر ان نابکاروں کی صحبت کا یہ اثر ہوا کہ آپ اچھے خاصے سر کو چھلا ہوا کسیرو بنانے چلے ہیں کہ دیکھتے ہی ہتھیلی کھجلائے ، چانٹا مارنے کو جی چاہے ۔ ایسے اکیلے سر منڈانے سے کیا ہوتا ہے ۔ گھٹنوں تک کا کرتہ پہن ، ٹخنوں تک کا پائجامہ بنا ، پنج آیت کے واسطے دو چار سورتیں یاد کر اور جو چاہے کہ فقط انگلی کو خون لگا کر شہیدوں میں داخل اور ذرا سر منڈا کر بزیانی کی دعوتوں میں شامل ہو جاؤں ، تو بچا ہاتھ دھو رکھو ، گھسنا تو ملنے ہی کا نہیں ۔''

۹ ۔ تقریب فاتحہ میں جو لوگ ختم قرآن کے بعد اور دعاء سے پہلے پنج آیت (سورہ فاتحہ اور چاروں قل) پڑھتے ہیں ، چوں کہ عموماً پیشہ ور ہوتے ہیں لہذا انھیں طنز و استہزا کے طور پر 'قل آعوذیے' کہا جاتا ہے (اس رعایت سے کہ پنج آیت کی آخری دو سورتیں 'قل آعوذ' سے شروع ہوتی ہیں) ۔ مردہ شو یعنی میت کو غسل دینے والے ۔ 'ملانا' اور 'مسجد کا ٹکڑ گدا' سے مراد وہی پیشہ ور مولویوں کا طبقہ ہے جس کی وضع قطع کو یہاں نشانۂ تضحیک بنایا گیا ہے ۔

باپ : ''تم نے کچھ جواب نہیں دیا ؟''

بیٹا : ''جناب ، اول تو بڑے بھائی کو جواب دینا خلاف شیوۂ ادب تھا اور اگر دیتا تو مجھ کو جیتا بھی نہ چھوڑتے ۔ جب تک میں سامنے سے ٹل نہیں گیا ، انھوں نے زبان بند نہیں کی ، اور ناحق حضرت بی کے نواسوں کی شان میں بری بری باتیں کہیں ۔ غرض ڈر کے مارے پھر میں نے بال منڈوانے کا نام نہیں لیا اور تب ھی سے مجھ کو ایک حجاب سا پیدا ھوا کہ کئی بار مجھ سے کہہ چکی ھیں ، اپنے دل میں کیا کہتی ھوں گی کہ کیسا خود سر لڑکا ھے ۔ لیکن پھر انھوں نے کچھ تذکرہ نہیں کیا ۔ معلوم نہیں بھول گئیں یا کہنے سے کچھ فائدہ نہ دیکھ کر چپ ھو رھیں ۔ ابھی تک میں نے جانا نہیں چھوڑا ، اگرچہ میرا جانا داخل بے غیرتی تھا ۔ جب انھوں نے مجھ کو نماز سکھائی اور نماز کی تاکید کی تو میں نے ایک دن گھر میں نماز پڑھنی چاھی ۔ بڑے بھائی جان اور ان کے یار دوست برابر ھنسائے جاتے تھے اور میں نہیں ھنستا تھا ، تو جا نماز آلٹ آلٹ دیتے ۔ سجدے میں جاتا تو اوپر بیٹھ بیٹھ جاتے تھے ۔ ایسی حالت میں ممکن نہ تھا کہ میں نماز پڑھ سکوں اور حضرت بی سچ بولنے کا مجھ سے عہد لے ھی چکی تھیں ۔ میں نے سوچا کہ جاؤں گا تو نماز کو پوچھیں گی ، تو کیا کہوں گا ۔ بالوں کی شرمندگی اور نماز کی ندامت ، غرض اعمال کی شامت کہ میں نے جانا چھوڑ دیا ۔ اب وھاں گئے مجھ کو تین ساڑھے تین مہینے ھوگئے ۔ میری اس نا اھلی کو دیکھیے کہ تب ھی سے وہ میرے ھم جماعت بیمار پڑے ھیں ، میں ان کی عیادت کو بھی نہیں جا سکا ۔''

باپ : ''لیکن تم نے اپنی مجبوری کا حال مجھ پر کیوں نہیں ظاہر کیا ؟''

بیٹا : ''اس خوف سے کہ غیبت ہو گی ۔''

باپ : ''تم نے اپنے بڑے بھائی کے رو در رو کہا ہوتا ۔''

بیٹا : ''اتنی مجال نہ مجھ میں کبھی تھی ، نہ اب ہے ۔ کیوں کہ میں جانتا ہوں کہ میں ہر وقت آپ کے پاس رہنے سے رہا ۔ جب اکیلا پائیں گے ، مجھ کو ٹھیک بنائیں گے ۔''

باپ : ''تم کو خوف ہی خوف تھا یا تم کو بڑے بھائی نے کبھی مارا بھی تھا ؟''

بیٹا : ''اس کی گنتی نہ میں بتا سکتا ہوں اور نہ بڑے بھائی جان بتا سکتے ہیں ۔''

باپ : ''کس بات پر ؟''

بیٹا : ''میں تو ہمیشہ ان کے مارنے کو ناحق ، بے سبب ، بے قصور ، بے خطا ہی سمجھا ۔''

باپ : ''تم نے اپنی ماں سے بھی کبھی تذکرہ نہ کیا ۔''

بیٹا : ''جو وجہ آپ کی خدمت میں عرض کرنے کی مانع تھی ، وہ ہی والدہ سے بھی کہنے کو روکتی تھی ۔ دوسرے میں دیکھتا تھا کہ گھر میں نماز روزے کا مطلق چرچا نہیں ۔ یہ بھی خیال ہوتا تھا کہ ایسا نہ ہو ، کہوں اور جس طرح بڑے بھائی جان ناخوش ہوتے ہیں اور لوگ بھی نارضامند ہوں ۔''

باپ : ''تو یہ چند مہینے تمھارے نہایت ہی بری طرح گزرے ۔''

بیٹا : ''کچھ عرض نہیں کر سکتا ۔ ایک حضرت جی کی خدمت سے محروم رہنے کا صدمہ ، دوسرے اپنی مجبوری کا رنج ۔ میں نے لوگوں سے سنا تھا کہ 'سگ باش برادر خورد مباش[10]' سو مجھ کو ہر روز اس کی تصدیق ہوتی ہے ۔ اور سب سے بڑھ کر تو اس بات کا قلق تھا کہ میں اپنے گھر میں سب چھوٹے بڑوں کی عادتوں کو نا پسند کرتا ہوں اور اپنے جی میں سوچا کرتا ہوں کہ جس گھر میں رہتا ہوں اس سے مجھ کو وحشت ہوتی ہے تو میں کہاں جاؤں گا اور کیا کروں گا ۔''

باپ : ''لیکن اگر اب تم کو حضرت جی کے گھر جانا ملے ؟''

بیٹا : ''سبحان اللہ ۔ اس سے بڑھ کر کوئی خوشی کی بات نہیں ۔ لیکن جب تک کہ میں سر کے بال نہ منڈا لوں اور نماز نہ پڑھوں میں ان کو منہ نہیں دکھا سکتا ۔''

باپ : ''اور اگر یہ بھی ہو ؟''

بیٹا : ''تو پھر یہ بھی ہو کہ ہمارے گھر بھر کی عادتیں وہیں کی سی ہو جائیں ۔''

باپ : ''بھلا اگر یہ دونوں ہوں ؟''

---

۱۰ ۔ کتا بن مگر چھوٹا بھائی نہ بن ۔ (یعنی چھوٹا بھائی کتے سے زیادہ بے عزت ہوتا ہے) ۔

بیٹا : ''تو پھر مجھ کو اور کچھ درکار نہیں ۔''

باپ : ''اس میں کچھ شک نہیں کہ ہمارے اس تمام گھر پر ایک بربادی اور تباھی چھا رھی ہے اور سارا خاندان گناہ اور بے دینی کی آفت میں مبتلا ہے ۔ آوے کا آوا خراب، کنبے کا کنبہ گم راہ ۔ تعجب ہے کہ اب تک کوئی عذاب الٰہی ہم پر نازل نہیں ہوا ۔ حیرت ہے کہ قہر خدا ہم پر کیوں نہیں ٹوٹ پڑا ۔ اور خدا کا الزام اور تم سب کا اولاھنا تمام تر مجھ پر ہے ۔ میں تم لوگوں کے جسموں کی پرداخت و پرورش کرتا رہا لیکن تمھاری روحوں کو میں نے ھلاک اور تمھاری جانوں کو میں نے تلف کیا ۔ کتنے خون میری گردن پر ھیں اور کتنے وبال میرے سر پر ۔ ع :

بحیرتم کہ سرانجام من چہ خواھد بود[۱۱]

سلیم ! آج تم خوش ہو جاؤ کہ تمھاری آرزو بر آئی اور تمھارا مطلب خدا نے پورا کیا ۔ شوق سے اپنا سر منڈاؤ اور نماز پڑھو اور حضرت بی کی خدمت میں جاؤ ۔ آج سے حضرت بی میری دینی ماں اور ان کے نواسے میرے دینی فرزند ھیں اور میں خود تمھارے ساتھ چلوں گا اور حضرت بی کا شکریہ ادا کروں گا کہ انھوں نے حسبۃً للہ تمھارے اور میرے دونوں کے ساتھ سلوک کیا ۔ تمھارے ساتھ یہ کہ تم کو نیک صلاح دی اور میرے ساتھ یہ کہ جو کام میرے کرنے کا تھا وہ انھوں نے کیا ۔ آج کے بعد سے ان شاءاللہ تم اس گھر کو حضرت بی کے گھر کی طرح دیکھو گے ۔ کوئی تفرقہ

---

۱۱ ۔ میں حیران ہوں کہ (ان اعمال کی پاداش میں) میرا انجام کیا ہوگا ۔

تم میں اور ان کے نواسوں میں باقی نہ رہے گا۔ سلیم! تمھاری
آج کی گفتگو سن کر میرا جی بہت ہی خوش ہوا اور تم
مجھ کو ساری اولاد میں سب سے زیادہ عزیز رہو گے۔ تم
کو میں دوسروں کے لیے نمونہ اور مثال بناؤں گا اور اُن کو
جو تم سے بڑے ہیں، تمھاری تقلید پر مجبور کروں گا۔''

فصل پنجم

فہمیدہ اور بڑی بیٹی نعیمہ کی لڑائی

ادھر تو نصوح اور سلیم دونوں باپ بیٹوں میں یہ گفتگو ہو رہی تھی ، ادھر اتنی ہی دیر میں فہمیدہ اور بڑی بیٹی نعیمہ میں خاصی ایک جھوڑ ہوگئی - نعیمہ اس وقت دو برس کی بیاہی ہوئی تھی - پانچ مہینے کا پہلونٹی کا لڑکا گود میں تھا - ناز و نعمت میں پلی ، نانی کی چہیتی ، ماں کی لاڈو - مزاج کچھ تو قدرتی تیز ، ماں باپ کے لاڈ پیار سے وہی کہاوت ہوئی ، 'کریلا اور نیم چڑھا' اور بھی چڑچڑا ہو گیا تھا - ساس نندوں میں بھلا اس مزاج کی عورت کا کیوں گزر ہونے لگا تھا - گھونگھٹ کے ساتھ منہ کھلا[1] اور منہ کا کھلنا تھا کہ سسرال کا آنا جانا بند ہوگیا - اب چھ مہینے سے ماں کے گھر بیٹھی ہوئی تھی - مگر رسی جلی پر بل نہ گیا - باوجودیکہ اجڑی[2] ہوئی میکے میں پڑی تھی ، مزاج میں وہی طنطنہ تھا - کنوار پنے ہی میں سواگز کی زبان تھی - کچھ یوں ہی سا لحاظ بڑی بوڑھیوں کا تھا ، سو بیاہے

---

۱ - گھونگھٹ کھلنے سے منہ تو کھل ہی جاتا ہے ، یہاں منہ کھلنے سے مراد بے باکی اور سخت کلامی ہے -

۲ - برے حال میں - بیوہ کی طرح جس کا سہاگ اجڑ گیا ہو -

سے ان کو بھی دھتکار بتائی ۔ بیٹا جنے پیچھے تو اور بھی کھل کھیلی ۔ مردوں تک کا لحاظ آٹھا دیا ۔

فہمیدہ نے میاں کے رو برو بیٹیوں کا بیڑا آٹھانے کو آٹھا لیا تھا ، لیکن نعیمہ کے تصور سے رونگٹے بدن پر کھڑے ہو ہو جاتے تھے اور جی ہی جی، میں کہتی کہ ذرا بھی میں اس بھڑوں کے چھتے کو چھیڑوں گی تو میرا سر مونڈ کر بھی بس نہیں کرے گی ۔ سو سو منصوبے ذہن میں باندھتی تھی ، مگر نعیمہ کی شکل نظر پڑی اور سب غلط ہو گئے ۔ ماں تو موقع اور محل ہی سوچتی رہی ، نعیمہ نے خود ہی ابتدا کی ۔ بڑے سویرے بچہ حمیدہ کو دے کر خود ہاتھ منہ دھونے میں مصروف ہوئی ۔ جب حمیدہ نے دیکھا کہ نماز کا وقت ہاتھ سے نکلا جاتا ہے ، بچے کو بٹھا نماز پڑھنے لگی ۔ بچہ کس اکل کھری ماں کا تھا ، بٹھانا تھا کہ بلبلا آٹھا ۔ آواز سن کر ماں دوڑی آئی ۔ دیکھا کہ بچہ اکیلا پڑا رو رہا ہے ، اور حمیدہ کھڑی نماز پڑھ رہی ہے ۔ دور سے دوڑ ، پیچھے سے حمیدہ کے ایسی دوھتھڑ ماری کہ حمیدہ رکوع سے پہلے سجدے میں جا گری ۔

اس وقت فہمیدہ کسی ضرورت سے دوسرے قطعے میں گئی تھی ۔ پھر کر آئی تو دیکھا کہ حمیدہ چبوترے پر پانی کا لوٹا لیے ہوئے سر جھکائے بیٹھی ہے اور ناک سے خون کی تللی جاری ہے ۔ گبھرا کر پوچھا کہ ابھی تو میں تم کو نماز پڑھتی چھوڑ گئی تھی ۔ اتنی ہی دیر میں یہ ہوا کیا ؟ دیکھوں کہیں نکسیر تو نہیں پھوٹی ۔

حمیدہ بے چاری نے ابھی کچھ جواب بھی نہیں دیا تھا

کہ نعیمہ خود بول اٹھی : ''اے بی ہوا کیا - ذرا کی ذرا لڑکے کو دے کر میں منہ دھونے چلی گئی - اس نکمی سے اتنا نہ ہو سکا کہ ذرا لڑکے کو لیے رہے - آخر میں کہیں کنویں میں گرنے تو نہیں چلی گئی تھی - لڑکے کو بلکتا ہوا لٹا ، نیت باندھ ، نماز پڑھنے کھڑی ہو گئی - میں جو آئی تو ذرا ہولے سے کندھے پر ہاتھ رکھا تھا کہ آپ دھڑام سے گر پڑی - کہیں تخت کی کیل لگ لگا گئی ہوگی -''

ماں : ''اچھا تم نے ہولے سے ہاتھ رکھا تھا کہ نگوڑی لڑکی کے فصد کے برابر خون نکلا؟ کیسے دنیا میں لہو سفید ہوگئے ہیں -''

نعیمہ : ''لہو سفید نہ ہوگئے ہوتے تو کیا یوں بھانجھے کو روتا ہوا چھوڑ دیتی ؟''

ماں : ''لیکن اس نے بے سبب نہیں چھوڑا - اس کی نماز چلی جا رہی تھی -''

نعیمہ : ''بلا سے صدقے سے نماز کو جانے دیا ہوتا - نماز پیاری تھی یا بھانجا ؟''

ماں : ''لڑکی ، ڈر خدا کے غضب سے - کیا کفر بک رہی ہے - اس حالت کو تو پہنچ چکی اور پھر بھی درست نہ ہوئی -''

نعیمہ : ''خدا نہ کرے میری کون سی حالت تم نے بری دیکھی ؟''

ماں : ''اس سے بدتر حالت اور کیا ہوگی کہ تین برس

بیاہ کو ہوئے اور ڈھنگ سے ایک دن اپنے گھر میں رہنا
نصیب نہیں ہوا ۔''

نعیمہ : ''وہ جنم جلا گھر ہی ایسا دیکھ کر دیا ہو
تو کوئی کیا کرے ۔''

ماں : ''ہاں بیٹی سچ ہے ۔ میں تو تیری ایسی ہی
دشمن تھی ۔ مائیں بیٹیوں کو اسی واسطے بیاہا کرتی ہوں گی
کہ بیٹیاں اجڑی ہوئی ان کے گھٹنے لگی بیٹھی رہیں ۔''

نعیمہ : ''کیا جانیں ۔ ہم کو تو آنکھیں میچ کر
کنویں میں دھکیل دیا تھا ، سو پڑے ڈبکیاں کھا رہے ہیں۔''

ماں : ''خیر بیٹی ، اللہ رکھے تمہارے آگے بھی اولاد ہے ۔
اب تم سمجھ بوجھ کر ان کی شادی بیاہ کرنا ۔''

نعیمہ : ''کریں ہی گے ۔ نہ کریں گے تو کیا تمہارے
بھروسے بیٹھے رہیں گے ۔''

ماں : ''میں کیا کہتی ہوں کہ میرے بھروسے بیٹھی
رہنا ۔ بڑا بھروسا خدا کا ۔''

نعیمہ : ''کیسا خدا ۔ بھروسا اپنے دم قدم کا ۔''

ماں : ''یہ دوسری دفعہ ہے کہ تو خدا کی شان میں
بے ادبی کر چکی ہے ۔ اب کی تو نے اس طرح کی بات منہ
سے نکالی اور بے تامل تڑ سے طمانچہ تیرے منہ پر کھینچ
ماروں گی ۔''

نعیمہ : ''سچ کہنا ۔ بڑی بے چاری مارنے والی ۔

ماروا پنی چہیتی کو ، مارو اپنی لاڈو کو ۔"

ماں : "کیسی چہیتی ، کیسی لاڈو ۔ قربان کی تھی وہ اولاد جو خدا کو نہ مانے ۔"

نعیمہ : "یہ کب سے ؟"

ماں : "جب سے خدا نے ہدایت دی ۔"

نعیمہ : "چلو خیر جب ہم بھی تمہاری عمر کو پہنچیں گے تو بہتیرا خدا کا ادب کرلیں گے ۔"

ماں : "آپ کو خیر سے غیب دانی میں دخل ہے کہ بارے میری عمر تک پہنچنے کا یقین ہے ۔"

نعیمہ : "اب تم میرے مرنے کی فال نکالو ۔"

ماں : "نہ کوئی کسی کی فال سے مرتا اور نہ کوئی کسی کی فال سے جیتا ۔ جس کی جتنی[۳] خدا نے لکھ دی ۔"

نعیمہ : "ورنہ تم مجھ کو کاہے [illegible] دیتیں ۔"

ماں : "اتنا ہی اختیار رکھتی ہوتی تو تجھ کو آدمی ہی نہ بنا لیتی ۔"

نعیمہ "نوج تو کیا میں حیوان ہوں ۔"

ماں : "جو خدا کو نہیں جانتا وہ حیوان سے بھی بدتر ہے ۔"

نعیمہ : "اب تو ایک حمیدہ تمہارے نزدیک انسان

---

۳ ۔ اس محاورے میں عمر کا لفظ محذوف ہے ۔

ہے ۔ باقی سب گدھے ہیں ۔"

ماں : "حمیدہ کا تجھ کو کیا جلاپا پڑ گیا ۔ تو اس کی جوتی کی برابری تو کر لے ۔"

نعیمہ : "خدا کی شان ، یہ اٹھک بیٹھک کر لینے سے حمیدہ کو ایسے بھاگ لگ گئے !"

فہمیدہ دو مرتبہ بیٹی کو منع کر ہی چکی تھی اور سمجھا دیا تھا کہ اگر پھر دین کی باتوں میں بے ادبانہ کلام کرے گی تو میں بے تامل منہ پر طمانچہ کھینچ ماروں گی ۔ اس مرتبہ جو نعیمہ نے نماز کو اٹھک بیٹھک کہا تو حرارتِ دین داری نے فہمیدہ کو بے اختیار کیا اور اس نے واقع میں جیسا کہا تھا ، نعیمہ کے منہ پر ایک طمانچہ ایسے زور سے مارا کہ منہ ہی تو پھر گیا ۔ طمانچے کا لگنا تھا کہ نعیمہ نے ایک آفت توڑ ماری ۔ سب سے پہلے تو اس نے ، دے دھواں دھوں ، دے دھواں دھوں ، اپنے بے زبان معصوم بچے کو پیٹ ڈالا ۔ اگر لوگ اس کی گود سے بچے کو نہ چھین لیں تو وہ لڑکے کا خون ہی کر چکی تھی ۔ اس کے بعد تو اس نے عجب عجب فیل مچائے ۔ گھنٹوں تک تو پٹخنیاں کھایاکی ۔ کپڑوں کا ایک تار باقی نہ رکھا ۔ نہیں معلوم اس کا سر تھا یا لوہے کا گولا تھا کہ ہزاروں دو ہتھڑیں اس پر پڑیں ، آدھے سے زیادہ بال کھسوٹ ڈالے ، سینکڑوں ٹکریں دیواروں میں ماریں ۔ حیرت ہے کہ وہ سر بچا تو کیونکر بچا ۔ اس کے پاکھنڈ دیکھ کر سارا گھر تھرا اٹھا اور لوگ ڈرنے لگے کہ ایسا نہ ہو تھانے والے غل سن کر اندر گھس آئیں ۔ بارے بہ مشکل پکڑ دھکڑ کر کوٹھری کے اندر دھکیل

اوپر سے کنڈی لگا دی ۔

نیچے گھر میں اتنا غل ہوا مگر بالا خانہ کچھ ایسا الگ سا تھا کہ نصوح کو مطلق خبر نہیں ہوئی ۔ جب سلیم باپ سے باتیں کر کے نیچے اترا تو فہمیدہ اوپر گئی ۔ اس وقت تک غیظ و غضب اور رنج و تعب کے آثار اس کے چہرے سے نمودار تھے ۔ دور ہی سے نصوح نے پوچھا : ''خیریت تو ہے ؟''

فہمیدہ : ''اللہ تعالیٰ خیریت ہی رکھے ۔ کیوں تم نے کیا سمجھ کر پوچھا ؟''

نصوح : ''تمہارے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی ہیں ۔ ہونٹھ خشک ہو رہے ہیں ۔ سر سے پاؤں تک کھڑی کانپ رہی ہو ۔ آخر یہ سب باتیں بے سبب تو نہیں ہیں ۔''

فہمیدہ نے نعیمہ کی اور اپنی تمام سرگزشت بیان کی ۔ نصوح یہ ماجرا سن کر دم بہ خود ہو گیا ۔ آدھے گھنٹے کے قریب دونوں میاں بیوی چپ سناٹے میں بیٹھے رہ گئے ۔ آخر فہمیدہ نے کہا : ''پھر اب کیا صلاح ؟''

نصوح : ''صلاح یہی ہے کہ جو ہونی ہو سو ہو ، اب نرمی اور لینت نہیں کرنی چاہیے ۔ معاذ اللہ ایسا برا عقیدہ! بھلا کوئی کہہ سکتا ہے کہ یہ کسی اہل اسلام کے خاندان کی لڑکی ہے ۔ معلوم ہوتا ہے کہ خدا اس کے نزدیک کوئی چیز ہی نہیں ۔ مجھ کو تو اس کے ساتھ کھانا حرام ہے ۔ بڑی خیریت گزری کہ میں وہاں موجود نہ تھا ورنہ میرے روبرو ایسا کلمہ اس کے منہ سے نکلا ہوتا تو شاید میں تلوار

کھینچ مارتا ۔ ایسی اولاد کے ہونے سے نہ ہونا اچھا ۔ بہتر ہوگا کہ ابھی پالکی منگا اُس کو اُس کی سسرال پہنچا دو ۔''

فہمیدہ : ''بھلا کیسی باتیں کہتے ہو ۔ بے طلب بے تقریب بھیج دیں تو ایک تو پہلے ہی سے اس نے اپنی عزت کو خاک میں ملا رکھا ہے ، رہی سہی اور بھی غارت ہو ۔ مجھ کو کیا خبر تھی ، ورنہ تمھاری عیادت کی تقریب سے عورت مرد سارا سمدھیانا آیا تھا اور اس کے لے جانے کے لیے منتیں کرتے تھے ۔''

نصوح : ''جو کم بخت عورت خدا کی عزت و حرمت نہ رکھے، وہ دنیا میں ہر طرح کی بے عزتی اور بے حرمتی کی سزاوار ہے ۔ جب اس کو خدا کا پاس ادب نہیں ، مجھ کو ہرگز اُس کا پاس محبت نہیں ۔''

فہمیدہ : ''میں کہتی ہوں شاید اب بھی یہ درست ہو جائے ۔''

نصوح : ''توبہ توبہ ! اس کے دل میں مطلق نور ایمان نہیں ۔ وہ تو سرے سے خدا ہی کی قائل نہیں ، پھر کیا درستی کی امید ۔''

فہمیدہ : ''سسرال بھیج دینا تو ٹھیک نہیں ۔''

نصوح : ''پھر مجھ سے کیا صلاح پوچھتی ہو ، جو تمھارے جی میں آئے سو کرو ۔ لیکن یہ ممکن نہیں کہ اس کے ایسے خیالات ہوں اور میں اس کو اپنے گھر میں رہنے دوں ۔ اور وہ رزق جو ہم کو خدائے تعالیٰ اپنی مہربانی اور عنایت

سے دیتا ہے ، وہ شخص اس میں کیوں شریک ہو جو خدا ہی کو نہیں مانتا ۔

فہمیدہ : ''لیکن خدائے تعالیٰ اپنا رزق کسی سے دریغ نہیں رکھتا ۔ بُرے بھلے سب اس کے یہاں سے روزی پاتے ہیں ۔''

نصوح : ''میں اس کے رزق کا انسداد نہیں کرتا لیکن میں اپنے رزق میں منکر خدا کو شریک نہیں کرنا چاہتا ۔''

فہمیدہ : ''ایسی سختی سے گھر میں کوئی کاہے کو رہنے لگا ۔''

نصوح : ''میں اس گھر کی فکر میں ہوں جہاں مجھ کو ہمیشہ رہنا ہے ۔ دنیا کا گھر چند روزہ گھر ہے ۔ آج اُجڑا تو اور کل اُجڑا تو ، ایک نہ ایک دن اُجڑے گا ضرور ۔ میرے آباد کرنے سے آباد رہ سکتا ہے ؟''

فہمیدہ : ''ہاں لیکن ایک مرے پیچھے اُجڑنا اور ایک جیتے جی اُجڑنا ، ان دونوں میں بڑا فرق ہے ۔''

نصوح : ''لیکن تم دل کی ایسی کچی تھیں تو تم نے ہامی کیوں بھری اور تمہارا یہ حال ہے تو واقع میں خاندان کی اصلاح ہو نہیں سکتی ۔''

فہمیدہ : ''کیا اولاد کے واسطے جی نہیں کڑھتا ۔ میں نے ان کو اسی دن کے واسطے پالا تھا کہ یہ بڑے ہو کر مجھ سے چھوٹ جائیں ۔ بے شک مجھ سے تو اتنا صبر نہیں ہو سکتا ۔''

اتنا کہہ کر فہمیدہ کا جی بھر آیا اور وہ رونے لگی۔

نصوح: ”میں نہیں کہتا کہ تمھارا جی نہیں کڑھتا اور نہ میں یہ کہتا ہوں کہ مجھ کو تمھارے برابر ان کی محبت ہے۔ لیکن میں نے یہ بھی تو نہیں کہا کہ تم ان کو چھوڑ دو۔“

فہمیدہ: ”کیوں، ابھی تم نے نعیمہ کو سسرال بھیج دینے کے لیے نہیں کہا؟“

نصوح: ”کیا نعیمہ کبھی سسرال نہیں گئی، اور سسرال بھیج دینا اور چھوڑ دینا ایک ہی بات ہے؟“

فہمیدہ: ”لیکن ایک ہنسی خوشی جانا، جس طرح دنیا جہان کی بیٹیاں میکے سے جایا کرتی ہیں اور ایک لڑ کر جانا۔ اور لڑائی بھی ایسی لڑائی کہ عمر بھر ایسی نہیں ہوئی۔ مجھ کو یاد نہیں کہ میں نے نعیمہ کو کبھی ہاتھ بھی لگایا ہو۔ جواب اس سے زیادہ سخت سخت اس نے دیے۔ مگر جب وہ جواب دیتی تھی، میں ہنس دیا کرتی۔ اس مرتبہ نہیں معلوم میں کچھ ایسی آپے سے باہر ہو گئی کہ تھپڑ کھینچ مارا۔ اتنا بھی مجھ کو خیال نہ رہا کہ یہ بیاہی ہوئی ہے، صاحبِ اولاد ہے۔“

نصوح: ”اگر تم نے اس کو تھپڑ نہ مارا ہوتا تو میں تم سے پوچھتا کہ تم کیسی دین دار تھیں کہ ایک شخص نے، جس کے دفع کرنے پر تم کو قدرت حاصل تھی، تمھارے منہ پر خدا کی شان میں بے ادبی کی اور استخفاف و استہزاء کے ساتھ اس کا نام پاک لیا اور مطلق تم کو برا

نہ لگا ۔''

فہمیدہ : ''برا نہ لگتا تو میں مارتی ہی کیوں ؟''

نصوح : ''بے شک تم نے مارا تو بہت بجا کیا ۔ لیکن اب اس پر افسوس کرنا ، اپنے تئیں ملزم بنانا ہے ۔''

فہمیدہ : ''لیکن لڑکی جو ہاتھ سے جاتی ہے ۔''

نصوح : ''یہ حالت تمہارے لیے ایک امتحان کی حالت ہے ۔ ایمان اور اولاد دو چیزیں ہیں اور سخت افسوس کی بات ہے کہ دونوں کا اکٹھا ہونا ممکن نہیں معلوم ہوتا ، اس واسطے کہ ہماری اولاد دین کی عدو اور ایمان کی دشمن ہے ۔ اگر اولاد کا منہ کریں تو دین و ایمان ہاتھ سے جاتا ہے اور اگر ایمان کا حفظ کریں تو اولاد چھوٹتی ہے ۔ پس تم کو اختیار ہے دونوں میں سے جس کو چاہو لو ۔

فہمیدہ : ''میں ایمان لوں گی ، میں ایمان لوں گی جو عاقبت میں میرے کام آئے گا ۔''

نصوح : ''جزاک اللہ ۔ صد آفرین ہے تمہاری فہم پر ۔ بے شک ایمان بڑی چیز ہے ۔''

فہمیدہ : ''رہی اولاد ، کیا کروں چھاتی پر پتھر رکھوں گی ۔ مجھ کو کیا خبر تھی کہ اس پیٹ کم بخت کو یوں آگ لگے گی اور اس ناشاد کوکھ میں ایسے کیڑے پڑیں گے ۔''

فہمیدہ یہ کہہ کر بڑے درد و حسرت کے ساتھ روئی کہ اس کو دیکھ کر نصوح بھی بے قرار ہو گیا ۔ تھوڑی

دیر کے بعد نصوح بولا : ''دل کو مضبوط رکھو اور اللہ کو یاد کرو ۔ جب تمھاری نیت بخیر ہے تو سب ان شاء اللہ بہتر ہی ہوگا ۔ وہ بڑا قادر ہے ؛ چاہے تو دم کے دم میں ہماری ساری اولاد کو ولی کر دے ۔ دعا کرو کہ اللہ ان کو نیک راہ دکھائے ۔''

فہمیدہ : ''رُواں رُواں دعا کر رہا ہے ۔ اللہ ہی قبول کرے اور اسی سے لَو لگی ہے ۔''

نصوح : ''بھلا نعیمہ کوٹھری کے اندر کیا کر رہی تھی ۔''

فہمیدہ : ''رو رہی تھی اور کیا کر رہی تھی ۔ میں چلتے ہوئے کہتی آئی تھی کہ کواڑ کھول کر اس کو پانی وانی پلا دینا ۔''

نصوح : ''اور کھانا ؟''

فہمیدہ : ''کیا خوب ۔ نہ ابھی دو دن ، نہ چار دن ، ابھی سے کھانا ۔''

نصوح : ''یہ تو بڑی خرابی کی بات ہے ۔''

فہمیدہ : ''اور کیا ، بڑا رونا تو کھانے ہی کا ہے ۔ وہ مجھ سے چاہے سہینوں نہ بولتی ، مگر کھانا کھا لیتی تو کچھ اندیشے کی بات نہ تھی ۔ ادھر اس کو تکلیف ہو گی ، آدھر بچہ دودھ کو پھڑکے گا ۔''

نصوح : ''تم اپنا دودھ پلا دینا ۔''

فہمیدہ : ''میں تو اس کو سو دفعہ پلاؤں مگر اللہ رکھے سیانا بچہ ہے ، ماں کی گود پہچانتا ہے ۔ کہتے ہیں کہ چالیس دن کا بچہ ماں کی پرچھائیں دیکھنے لگتا ہے ۔ اب تو سوتے کو ایک دفعہ میں پلا آئی ہوں ، جاگتے میں پئے تو جانوں کہ پیا ۔''

نصوح : ''کھانا کھانے کی تدبیر ضرور کرنی چاہیے ۔ میں جا کر کہوں ؟''

فہمیدہ : ''نہ ، خدا کے لیے تم اترنا ہی مت ۔''

نصوح : ''میں آہستگی سے سمجھا دوں گا ۔''

فہمیدہ : ''مردوں کی آہستگی کا کچھ اعتبار نہیں ، اور تمھاری آہستگی کہ ابھی باتوں ہی باتوں میں تم تلوار کھینچنے لگے تھے ۔''

نصوح : ''میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ ان شاء اللہ کسی طرح کی سختی نہیں کروں گا ۔''

فہمیدہ : ''پھر بھی کیا ہوا ۔ تمھارا دخل دینا مناسب نہیں ۔ آخر ایک آدمی گھر میں ایسا بھی ہونا چاہیے کہ چھوٹے بڑے سب اس کا لحاظ کریں ۔ اور فرض کرو کہ تم گئے اور رنج اس کا تازہ ہے ، اس نے نہ مانا تو پھر بڑی دشواری پڑے گی ۔ اور اس کو یہ شرم دامن گیر ہوگی کہ دیکھو ، باپ تک مجھ کو سمجھا کر ہار گئے اور میں نے کسی کا کہنا نہ مانا ؛ اب جو من جاؤں گی ، تو باپ جی میں کیا کہیں گے ۔''

نصوح : ”اچھا تو ایک تدبیر کرو ۔ اس کی سہیلیوں میں سے کوئی سمجھ دار ہے ، تو اس کو بلا بھیجو ۔ وہ سمجھا بجھا کر راضی کر لے گی ۔“

فہمیدہ : ”ہاں یہ ایک معقول تدبیر ہے ۔ میں اپنی بھانجی صالحہ کو بلاتی ہوں ۔ دونوں ہم عمر ہیں اور دونوں کی ملی بھگت بھی بہت ہے ۔“

نصوح : بس تمھارے انتخاب پر میرا صاد[۴] ہے ۔ تمھاری بہن کے گھر نماز روزے کا بھی خوب چرچا رہا کرتا ہے ۔ جمعے کے جمعے وعظ ہوتا ہے ۔ صالحہ کے خیالات ضرور دین دارانہ خیالات ہوں گے ۔“

فہمیدہ : ”اللہ اکبر! ان کے گھر کی دین داری ضرب المثل ہے ۔ ہماری بہن، اللہ رکھے، اتنی بڑی نمازن ہیں کہ انھوں نے اپنے ہوش میں تو کسی وقت کی نماز قضا نہیں کی ۔ اتنا تو بال بچوں کا بکھیڑا ان کے ساتھ ہے اور خدا کی مرضی گھر میں سدا تنگی رہتی ہے ؛ سب کام کاج بے چاری کو اپنے ہی ہاتھوں سے کرنا پڑتا ہے ، لیکن پنج وقتی نماز اور فمی بشوق[۵] کی منزل

---

۴ ۔ میں بھی تائید کرتا ہوں یا درست قرار دیتا ہوں ۔ صحیح ہونے کی تصدیق کے لیے حرف ”ص“ بطور علامت استعمال ہوتا ہے ۔

۵ ۔ قرآن مجید کی تلاوت کا مستحسن طریقہ یہ ہے کہ کم از کم سات دن میں ختم کیا جائے ۔ اس غرض سے پورے قرآن میں سات منزلیں مقرر کی گئی ہیں ۔ پہلی منزل سورۂ فاتحہ (دراصل سورۂ بقرہ) سے شروع ہوتی ہے، دوسری منزل سورۂ مائدہ سے، تیسری سورۂ یونس سے ، چوتھی بنی اسرائیل سے ، پانچویں الشعراء سے ، چھٹی وصافات سے اور ساتویں منزل سورۂ قاف سے شروع ہوتی ہے ۔ ان ساتوں سورتوں کے ابتدائی حروف ملا کر ”فمی بشوق“ کی اصطلاح وضع کی گئی ہے ۔

کیا امکان کہ قضا ہو ۔''

نصوح : ''سبحان اللہ ۔ وہی لوگ بڑے خوش قسمت ہیں ۔ دنیا کے فقیر دین کے امیر ۔''

فہمیدہ : ''اور لطف یہ کہ ہر وقت ہشاش بشاش ۔ کبھی عسرت کی شکایت یا تنگ دستی کا گلہ کرتے ہم نے تو ان کو سنا نہیں اور چھوٹے بڑے سب مستغنی اور سیر چشم ۔ ہم کو اتنا تو خدا نے دے رکھا ہے لیکن میں سچ کہتی ہوں ، کہیں شادی بیاہ میں کسی بیوی کو اپنے سے بہتر زیور یا کپڑا پہنے دیکھتی ہوں تو ضرور میرا جی کڑھتا ہے ۔ اور بچوں کا بھی یہی حال ہے ۔ کوئی چیز کسی کے پاس ذرا دیکھ پائیں ، جب تک ویسی ہی موجود نہ ہو جائے میری جان کھا جائیں ۔ لیکن ہماری بہن کے دل میں کبھی ایسا خیال ہی نہیں آیا ۔ اگر ان کو مجھ پر حسد ہوتا تو موقع تھا ۔ لیکن میرے اور میرے بچوں کے زیور اور کپڑے دیکھ کر باغ باغ ہو جاتی ہیں اور ہر چیز پر کہے جاتی ہیں : ماشاء اللہ ، چشم بد دور ، اللہ زیادہ دے ، اللہ نصیب کرے ۔ بچے ہیں ، کہ دنیا کی نعمت ان کے سامنے رکھ دو ، آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے ۔

نصوح : ''سچ ہے ، 'الغنی غنی النفس[6] ۔' 'تونگری بہ دل است نہ بہ مال ۔' دنیا کے مال و حشمت کی ان کی نظروں میں وقعت ہی نہیں تو پھر حسد کیوں کریں ۔''

---

۶ ۔ غنی وہ ہے جو دل کا غنی ہو ۔ اسی مفہوم میں آگے سعدی کا قول نقل کیا ہے ۔ ترجمہ : امیری دل سے ہوتی ہے نہ کہ مال سے ۔

فہمیدہ : ''اور مجھ سے اور میرے بچوں سے اس قدر محبت کرتی ہیں کہ ڈولی سے آترتی ہیں تو اوپر تلے بلائیں لیے چلی جاتی ہیں ۔ بلکہ مجھ کو ان کے بچوں سے ذرا بھی آنس نہیں ۔''

نصوح : ''آن کی یہ محبت و ہم دردی خدا پرستی کی وجہ سے ہے اور کچھ تمھاری تخصیص نہیں ، سب کے ساتھ آن کی یہی کیفیت ہوگی ۔''

فہمیدہ : ''بچوں کو ایسا سدھا رکھا ہے کہ کبھی آپس میں لڑتے ہی نہیں ۔ ایک ہمارے بچے ہیں کہ ایک دم کو ایک کی ایک سے نہیں بنتی ۔''

نصوح : ''یہ ان کی تعلیم و تلقین کا نتیجہ اور ان کے اپنے عمدہ نمونے کا اثر ہے ۔ مگر تم ان کو اکثر مہمان بلا کر اپنے یہاں رکھا کرو کہ ہمارے گھر پر بھی ان کا پرتو پڑے ۔''

فہمیدہ : ''ہماری بہن غیرت مند بڑی ہیں ۔ میں نے کئی بار ان سے کہا تو یہی جواب دیا کہ میرے ساتھ بکھیڑا بہت ہے ۔ تمھاری سسرال والے نہیں معلوم دل میں کیا سمجھیں ، کیا کہیں ، اس سے میرا آنا نہیں ہو سکتا ۔ خدا کرے کہ تم بیٹے بیٹیوں کی شادیاں کرو ، بیاہ کرو تو دیکھو بے بلائے پہنچتی ہوں یا نہیں ۔''

نصوح : ''کوئی سامان ایسا نہیں ہو سکتا کہ ان کو فکر معاش سے فارغ البالی ہو ۔''

فہمیدہ : ''وہ ہمارے بہنوئی صاحب کچھ اس کی پیروی

ہی نہیں کرتے ۔ ان کا یہ مقولہ ہے کہ جتنا ہم کو اب ملتا ہے بس دنیا میں زندگی بسر کرنے کے لیے کافی ہے ۔''

نصوح : ''گھر میں تکلیف رہا کرتی ہوگی ۔''

فہمیدہ : ''تکلیف ہونی ہی چاہیے ۔ بیس روپے مہینے کی نوکری اور ہمارے بہنوئی کی سی احتیاط ۔ اللہ رکھے ، اتنا بڑا کنبہ ، مگر جیسا میں نے تم کو کہا ، جب سنا ان کو شکر گزاری ہی کرتے سنا ۔ اور کچھ خدا نے برکت بھی ایسی دی ہے کہ کپڑا لتا ، گہنا پاتا ، سامان ، ظاہر حیثیت کے موافق کچھ برا نہیں ۔ کسی کے قرض دار نہیں ۔ نیوتا بیوہار[۲] کے ایسے کھرے کہ اگر کسی نے ان کے گھر ایک روپیہ دیا ہوگا تو انھوں نے دو ضرور دیے ہوں گے ۔ غرض کنبے اور برادری میں بھی کسی سے شرمندہ نہیں ۔''

نصوح : ''بڑی ہی اچھی زندگی ہے ۔''

فہمیدہ : ''اس میں شک نہیں ۔ کیسی ہی مصیبت ہو ، میں نے ان کو مضطر اور بے قرار نہیں دیکھا ۔ ہر بات میں اللہ پر توکل ، خدا پر بھروسا ۔''

نصوح : ''مجھ کو حیرت ہے کہ تم دونوں سگی بہنیں

---

۲ ۔ کہیں کہیں یہ رسم ہے کہ شادی بیاہ کے موقعوں پر جن لوگوں سے لین دین کے برادرانہ تعلقات ہوتے ہیں ، وہ اپنے معمول کے مطابق ایک مقررہ رقم (عموماً ایک یا دو روپیہ) صاحب خانہ کو پیش کرتے ہیں ۔ یہ رقم ''نیوتا'' کہلاتی ہے اور اس کا باقاعدہ حساب رکھا جاتا ہے ۔ عام بول چال میں یہ لفظ اس قسم کے لین دین یا محض دعوت کے معنی میں آتا ہے ۔

اور عادتوں میں اتنا تفاوت ۔''

فہمیدہ : ''ماں کے گھر تک تو میرا بھی یہی حال تھا ۔ انھوں نے ہم دونوں کو یکساں سکھایا ، برابر پڑھایا ۔ مگر برا مت ماننا ، جب میں تمھارے پلے بندھی ، تمھارے گھر میں آ کر جو دیکھا تو دین کا کچھ تذکرہ نہ پایا ۔ رفتہ رفتہ نماز وغیرہ کی سب عادتیں چھوٹ گئیں ۔ ہماری ماں ، خدا جنت نصیب کرے ، بڑی دین دار تھیں ۔ جب دلہن کو رخصت کرتے ہیں تو دستور ہے کہ بیٹی کی ماں ، بیٹے کی ماں سے کہا کرتی ہے کہ میں تمھاری خدمت کو یہ لونڈی دیتی ہوں ۔ ہماری ماں نے ، مجھ کو اب تک یاد ہے ، رخصت کرتے وقت اماں جان[8] سے کہا کہ دیکھو بوا ، میری لڑکی نے آج تک نماز قضا نہیں کی ۔ اب میں اس کو تمھارے سپرد کرتی ہوں ۔ اتنا خیال رکھنا کہ اس کی نماز قضا نہ ہو ، ورنہ میں بری الذمہ ہوں ۔ اس کا وبال اس پر ہوگا یا تمھاری گردن پر ۔ جب میں نئی نئی بیاہ کر آئی تو شرم کے مارے اٹھتی میں نہ تھی ، چلتی پھرتی میں نہ تھی ۔ تمام کنبے کی عورتیں ایک دم کو مجھ سے الگ نہ ہوتی تھیں کہ میں تنہائی پا کر دو رکعت نماز پڑھ لیتی ۔ اور باوجودے کہ میری ماں نے چلتے چلتے اماں جان سے کہہ دیا تھا مگر انھوں نے بھی کچھ خیال نہ کیا ۔ بس اسی دن سے میری نماز جانی شروع ہوئی ۔ دو چار دن تو دل کو افسوس رہا ۔ ہوتے ہوتے عادت چھوٹ گئی اور ایسی شامت کی مار آئی کہ پھر مجھ کو نماز نہ پڑھنے کا رنج بھی نہیں ہوتا تھا ۔ غرض دنیا کی چند روزہ شرم نے مجھ کو پکی بے دین بنا دیا

۸ - نصوح کی ماں اور فہمیدہ کی ساس مراد ہے *

اور میری وہی کہاوت ہوئی کہ جس نے کی شرم اس کے پھوٹے کرم - لیکن چوں کہ نماز کی خوبی بچپن سے ذہن میں بیٹھ چکی تھی ، اب بھی اتنا تھا کہ جس دن سر دھویا ، دو چار وقت کی نماز ضرور پڑھ لیا کرتی تھی - یا کوئی بال بچہ بیمار ہوا تو نماز پڑھنے لگی - جب خدا نے اس تردد کو رفع کر دیا ، پھر چھوڑ دی - اب البتہ میں نے مصمم عہد کو لیا ہے کہ برابر نماز پڑھوں گی - خدا میرے قول کو پورا کرے -''

نصوح : ''آمین ، ثم آمین -''

اس کے بعد فہمیدہ نے نیچے اتر کر فوراً صالحہ کے واسطے ڈولی بھیجی اور لونڈیوں سے کہہ دیا کہ کہار سواری لے آئیں تو چپکے سے پہلے مجھ کو خبر کر دینا -

---

فصل ششم

نصوح اور منجھلے بیٹے علیم کی گفتگو

نصوح نے نماز عصر سے فارغ ہو کر منجھلے بیٹے علیم کو پچھوایا کہ دیکھو مدرسے سے آئے یا نہیں ۔ معلوم ہوا کہ ابھی آئے ہیں اور کپڑے اُتار رہے ہیں ۔ تو کہلا بھیجا کہ اپنی ضرورتوں سے فارغ ہو کر ذرا میرے پاس ہو جائیں ۔ تھوڑی دیر میں علیم مدرسے کا لباس اُتار کتابیں ٹھکانے سے رکھ باپ کی خدمت میں جا حاضر ہوا ۔ دیکھتے ہی باپ نے کہا : ''آؤ صاحب آج کل تو میں نے سنا ہے کہ تم کو بہت ہی محنت کرنی پڑتی ہے ۔''

بیٹا : ''ششماہی امتحان قریب ہے ، اسی کے واسطے کچھ تیاری کر رہا ہوں ۔ دن تھوڑے سے رہ گئے ہیں اور کتابیں دیکھنے کو بہت باقی ہیں ۔ ہر چند ارادہ کرتا ہوں کہ رات کو گھر پر کتاب دیکھا کروں ۔ مگر بن نہیں پڑتا ۔ لوگ جو بھائی جان کے پاس آ کر بیٹھتے ہیں ، ایسی اودھم مچاتے ہیں کہ طبیعت اچاٹ ہوئی چلی جاتی ہے ۔''

باپ : ''پھر تم کچھ اس کا انسداد نہیں کرتے ؟''

بیٹا : ''اس کا انسداد میرے اختیار سے خارج ہے اور رات رائگاں جاتی ہے ۔ دن کو البتہ میں نے مکان کا رہنا ہی چھوڑ دیا ۔ صبح ہوئی اور اپنے کسی ہم جماعت کے یہاں چلا گیا ۔''

باپ : ''اور بڑے امتحان کے واسطے بھی کچھ تیاری کر رہے ہو ؟''

بیٹا : ''ابھی اس کے بہت دن پڑے ہیں۔ اس سے فارغ ہو کر دیکھا جائے گا ۔''

باپ : ''کیا اس کا کوئی وقت مقرر ہے ؟''

بیٹا : ''جناب ، ہاں ۔ بڑے دن کی تعطیل کے قریب ہوا کرتا ہے ۔''

باپ : ''نہیں نہیں ، تم نے میری مراد کو نہیں سمجھا ۔ میں حساب آخرت کو بڑا امتحان کہتا ہوں ۔ کیا وہ بڑا امتحان نہیں ہے ؟''

بیٹا : ''کیوں نہیں ۔ سچ پوچھیے تو سب سے بڑا سخت امتحان وہی ہے ۔''

باپ : ''تو میں جب تمہارے ان دنیاوی چھوٹے چھوٹے امتحانوں کی خبر رکھتا ہوں ، تو کیا اس بڑے سخت امتحان کی نسبت میں نے تم سے پوچھا تو کچھ بے جا کیا ؟''

بیٹا : '' جناب میں تو نہیں کہتا کہ آپ نے بے جا کیا ۔ ایسا کہنا میرے نزدیک گستاخی اور گناہ دونوں ہے ۔''

باپ : ''اچھا تو میں سننا چاہتا ہوں کہ تم اس بڑے سخت امتحان کے واسطے کیا تیاری کر رہے ہو ؟''

بیٹا : ''جناب ، سچ تو ہے کہ میں نے اس امتحان کے واسطے مطلق تیاری نہیں کی ۔''

باپ : ''کیا یہ غفلت نہیں ہے ؟''

بیٹا : ''جناب ، غفلت بھی پرلے درجے کی غفلت ہے ۔''

باپ : ''لیکن جب تم ایسے دانش مند ہو کہ دنیا کے چھوٹے چھوٹے امتحانوں کے لیے مہینوں اور برسوں پہلے سے تیاری کرتے ہو تو اس سخت امتحان سے غافل رہنا بڑے تعجب کی بات ہے ۔''

بیٹا : ''شامت نفس ۔''

باپ : ''لیکن تمھاری غفلت کا کچھ اور بھی سبب ضرور ہوگا ۔''

بیٹا : ''سبب یہی ہے ، میری سہل انگاری ۔''

باپ : ''تم جواب دیتے ہو لیکن صرف لفظوں کو پھیر پھار کر ۔ میں نے تم سے غفلت کا سبب پوچھا اور تم نے کہا کہ سہل انگاری ۔ اور سہل انگاری اور غفلت ایک ہی چیز ہے ۔ تو گویا تم نے غفلت کو غفلت کا سبب کہا ۔''

بیٹا : ''شاید گھر میں دین داری کا چرچا نہ ہونے سے میری غفلت کو ترقی ہوئی ہو ۔''

باپ : ''بے شک ، یہی سبب ہے تمھاری غفلت کا ۔ اور

میں نے تم سے کھود کھود کر اسی لیے دریافت کیا کہ جہاں تک تمھاری غفلت میری بے پروائی کی وجہ سے ہے اس کا الزام مجھ پر ہے اور ضرور ہے کہ میں تمھارے روبرو اس کا اقرار کروں اور تم چھوٹے ہوکر مجھ کو ملامت کرو۔"

بیٹا: "نہیں جناب قصور سراسر میرا ہے۔ مجھ کو خدا نے اتنی موٹی بات کے سمجھنے کی عقل دی تھی کہ مجھ کو ایک نہ ایک دن مرنا ہے اور میرے پیدا کرنے سے صرف یہی غرض نہیں ہونی چاہیے کہ میں جانوروں کی طرح کھانے اور پانی سے اپنا پیٹ بھر کر سو رہا کروں۔"

باپ: "تمھاری باتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ تمھاری دینی معلومات بھی کم درجے کی نہیں ہے۔ لیکن نہ تو میں نے دین کے مسائل تم کو خود سکھائے اور نہ ان کے سیکھنے کی کبھی تاکید کی۔ مدرسے میں تاریخ و جغرافیہ و ہندسہ و ریاضی کے سوائے کوئی دوسری چیز پڑھاتے نہیں۔ پھر دینی معلومات حاصل کی تو کہاں سے کہاں کی؟"

بیٹا: "اس میں شک نہیں کہ میں نے چھوٹی سی عمر میں قرآن پڑھا تھا لیکن وہ دوسرے ملک کی زبان میں ہے۔ طوطے کی طرح اول سے آخر تک پڑھ گیا، مطلق سمجھ میں نہیں آیا کہ اس میں کیا لکھا ہے اور کیا اس کا مطلب ہے۔ پھر مکتب میں گیا تو وہاں بھی کوئی دین کی کتاب پڑھنے کا اتفاق نہ ہوا؛ قصے کہانی، ان میں بھی اکثر بری بری باتیں۔ یہاں تک کہ جن دنوں میں بہار دانش پڑھتا تھا، ایک پادری صاحب چاندنی چوک میں سر بازار وعظ کہا کرتے

تھے ، مکتب سے آتے ہوئے لوگوں کی بھیڑ دیکھ کر میں بھی کھڑا ہو جاتا تھا ۔ پادری صاحب کے ساتھ کتابوں کا بھی ایک بڑا بھاری ذخیرہ تھا اور اکثر لوگوں کو اس میں سے کتابیں دیا کرتے تھے ۔ ہمارے مکتب کے کئی لڑکے بھی کتابیں لائے تھے۔ انھوں نے کتاب کی جلد تو اکھاڑ لی ، اور ورقوں کو یا تو پھاڑ کر پھینک دیا یا پٹھے بنائے ۔ کتابوں کی عمدہ عمدہ جلدیں دیکھ کر مجھ کو بھی لالچ آیا اور میں نے کہا ، چلو ہم بھی پادری صاحب سے کتاب مانگیں ۔ مکتب سے اٹھ میں سیدھا پادری صاحب کے پاس چلا گیا ۔ بہت سے لوگ ان کو گھیرے ہوئے تھے ۔ ان میں ہمارے مکتب کے بھی دو چار لڑکے تھے ۔ لوگ ان کے ساتھ کچھ مذہبی بحث کر رہے تھے ۔ اس کو میں نے خوب نہیں سمجھا ۔ مگر ایک بات تھی کہ اکیلے پادری صاحب ایک طرف تھے اور ہندو ، مسلمان ، سینکڑوں آدمی ایک طرف ۔ لوگ ان کو بہت سخت سخت باتیں بھی کہتے تھے ۔ کوئی دوسرا ہوتا تو ضرور لڑ پڑتا مگر پادری صاحب کی پیشانی پر چین بھی تو نہیں آتی تھی ۔ سخت بات سن کر الٹے مسکرا دیتے تھے ۔ لڑکے ایک شیطان ہوتے ہیں۔ تھوڑی دیر تک تو کھڑے سنتے رہے ، چلنے لگے تو ان میں سے ایک نے کہا : ''لولو ہے ہے ، لولو ہے ۔'' اس کی یہ بات سب لوگوں کو ناگوار ہوئی اور دو چار آدمیوں نے اس کو مارنے کے لیے تھپڑ بھی اٹھائے ۔ پادری صاحب نے روکا اور منع کیا کہ خبردار! اس سے کچھ مت بولو ۔ لولو موتی کو بھی کہتے ہیں ۔ شاید اس نے یہ سمجھ کر کہا ہو تو اس کو انعام دینا چاہیے ۔ پادری صاحب کی اس بات نے مجھ

پر کیا ، شاید سب لوگوں کے دل پر بڑا ہی اثر کیا اور جب شام ہوئی ، لوگ رخصت ہوئے تو کئی آدمی آپس میں کہتے جاتے تھے کہ بھائی اس شخص کا عقیدہ چاہے کیسا ہی ہو لیکن حلم اور بردباری ، یہ صفت اس میں اولیاء اللہ کی سی ہے ۔

غرض پادری صاحب تو وعظ میں مصروف تھے اور میں اپنی تاک میں تھا کہ بھیڑ ذرا کم ہو یا پادری صاحب کا سلسلۂ سخن منقطع ہو تو کتاب مانگوں ۔ لیکن نہیں معلوم پادری صاحب کو میرے قیافے سے یا کس طرح معلوم ہوگیا کہ میں کچھ ان سے کہنا چاہتا ہوں ۔ آپ ہی پوچھا کہ صاحب زادے تم کچھ مجھ سے کہو گے ؟ میں نے کہا کہ آپ سب کو کتابیں دیتے ہیں ، ایک کتاب مجھ کو بھی دیجئے ۔ پادری صاحب : ''بہت خوب اس الماری میں سے تم ایک کتاب پسند کر لو ۔'' میں نے سنہری جلد کی ایک بڑی موٹی سی کتاب چھانٹی تو پادری صاحب نے کہا کہ مجھ کو اس کے دینے میں کچھ عذر نہیں ۔ لیکن تم اس کو پڑھ بھی سکو گے ۔ کون سی کتاب تم پڑھتے ہو ؟ میں نے کہا : ''بہار دانش ۔'' پادری صاحب : ''بھلا تمہارا آج کا سبق میں بھی سنوں ۔'' میں نے جزدان سے کتاب نکال پڑھنا شروع کیا ۔ اس دن کا سبق بھی کم بخت ایسا فحش اور بے ہودہ تھا کہ لوگوں کے مجمع میں مجھ کو اس کا پڑھنا دشوار تھا ۔ بہ مشکل کوئی دو تین سطریں میں نے پڑھی ہوں گی کہ پادری صاحب نے فرمایا ، بے شک تم نے جو کتاب پسند کی ہے اس کو بہ خوبی پڑھ سکو گے اور وہ کتاب میں تم کو خوشی سے دیتا ہوں ۔ لیکن میں افسوس

کرتا ہوں کہ کیوں میں نے تم کو ایسی کتاب کے پڑھنے
کو کہا جس کے پڑھنے سے تم اور سننے سے میں اور یہ
سب صاحب جو کھڑے ہوئے ہیں ، خدا کے گنہ گار ہوئے۔
خدا ہم سب کی خطا معاف کرے ۔ اور تم چاہے میری دوسری
بات مانو یا نہ مانو لیکن اس کتاب کو چھوڑ دو کہ اس کا
مطلب تمہارے مذہب کے بھی بالکل خلاف ہے ۔ میں تم سے
سچ کہتا ہوں کہ ایسے پڑھنے سے نہ پڑھنا تمہارے حق
میں بہت بہتر ہے ۔ یہ کتاب جو تم پڑھتے ہو ، تم کو گناہ
اور برائی سکھاتی اور بد اخلاقی اور بے حیائی کی خراب
راہ دکھاتی ہے ۔'' باوجودے کہ لوگ پادری صاحب کی
ہر ہر بات کو کاٹتے تھے مگر اس کو سب نے تسلیم کیا ۔

پادری صاحب سے جو کتاب میں مانگ کر لایا تھا
اس کا نام تو مجھ کو معلوم نہیں مگر سلیس اردو
میں کسی خدا پرست اور پارسا آدمی کے حالات تھے ۔
اگرچہ فی‌الواقع ، میں اس کتاب کو جلد ہی کے لالچ سے لایا
تھا ، لیکن میں نے کہا لاؤ میں دیکھوں تو اس میں کیا
لکھا ہے ۔ چناں چہ میں نے اس کو دیکھنا شروع کیا ۔
جوں جوں میں اس کتاب کو پڑھتا جاتا تھا ، میرا دل اس
میں لگتا تھا اور اس کی باتیں مجھ کو بھلی معلوم ہوتی جاتی
تھیں ۔ اس کتاب کے پڑھنے سے مجھ کو معلوم ہوا کہ میرا
طرز زندگی جانوروں سے بھی بد تر ہے اور میں روئے زمین پر
بد ترین مخلوقات ہوں ۔ اکثر اوقات مجھ کو اپنی حالت پر
رونا آتا تھا اور گھر والوں کا وتیرہ دیکھ دیکھ کر مجھ کو
ایک وحشت ہوتی تھی ۔ یا تو میری یہ کیفیت تھی کہ

مصیبت مند[1] لوگوں کو دیکھ کر ہنسا کرتا تھا یا اس کتاب کی برکت سے دوسروں کی تکلیف کو اپنی تکلیف سمجھنے لگا ۔

مکتب اور بہار دانش دونوں کو میں نے اسی دن سلام کیا تھا جس روز کہ پادری صاحب نے مجھ کو نصیحت کی ۔ گھر میں اکیلا پڑا ہوا دن بھر اسی کتاب کو دیکھا کرتا ۔ مکتب کے لڑکے چند بار مجھ کو بلانے آئے مگر میں نہ گیا ۔ آخر خود میاں جی صاحب تشریف لائے اور میں نے جی کو مضبوط کر ان سے صاف کہہ دیا کہ مجھ کو پڑھنا منظور نہیں ۔ آپ ان دنوں دکن میں تشریف رکھتے تھے ۔ ایک روز نصیبوں کی شامت ، میں نہیں معلوم کہاں چلا گیا ۔ میری غیبت میں وہ کتاب بھائی جان کی نظر پڑ گئی اور شب برات کے کوئی چار یا پانچ دن باقی تھے ۔ بھائی جان کو پٹاخوں کے واسطے ردی درکار تھی ۔ بے تامل کتاب کو چیر پھاڑ کر برابر کر دیا ۔ میں نے آ کر دیکھا ، بہتیرا سر پٹکا ، کیا ہوتا تھا ۔ دوڑا ہوا چوک گیا کہ پادری صاحب ہوں تو دوسرا نسخہ لاؤں ۔ مگر معلوم ہوا کہ صاحب آگرے چلے گئے ہیں ۔ کف افسوس مل کر رہ گیا ۔ بھائی صاحب کے دوستوں سے شکایت کی ، تو انھوں نے کہا : ''میاں شکر کرو کہ

---

۱ ۔ پرانے نسخوں میں ''مصیبت مند'' لکھا ہوا ہے ۔ بعض مرتبین نے مصنف کی اصلاح کرتے ہوئے ''مصیبت زدہ'' بنا دیا ہے ۔ ''مصیبت مند'' اگرچہ ایک اجنبی ترکیب ہے ، لیکن غلط نہیں ۔

وہ کتاب پھٹ گئی ، نہیں تو تم کرشٹان[۲] ہی ہو گئے ہوتے ۔'' یہ جواب سن کر تو مجھ کو ایک نئی حیرت پیدا ہوئی کہ اگر کرشٹان ایسے ہی لوگ ہوتے ہیں جن کا حال میں نے اس کتاب میں پڑھا ، تو ان کو برا سمجھنا کیا معنی ۔ خیر چندے یہ خیالات رہے ۔ اس کے بعد تو میں مدرسے میں داخل ہوا اور دوسری طرف متوجہ ہو گیا ۔ اگر اب میرے خیالات دین و مذہب سے کچھ علاقہ رکھتے ہیں تو یہ صرف اس کتاب کا اثر ہے ، ورنہ دین کا کوئی رسالہ بھی مجھ کو دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا ۔''

باپ : ''اہل اسلام اور عیسائیوں کے معتقدات میں کچھ اختلاف ہے ۔ مگر پھر بھی جس قدر کہ عیسائیوں کا مذہب اسلام سے ملتا ہوا ہے ، اتنا کوئی دوسرا مذہب نہیں ملتا ۔ قرآن میں کئی جگہ عیسائیوں اور ان کے بزرگان دین قسیسوں[۳] اور راہبوں کی تعریف آئی ہے ۔ عیسائیوں کی نرم دلی اور خاک ساری کی مدح کی ہے ۔ ان کی انجیل کلام الٰہی ہے ۔ عیسائیوں کے ساتھ مواکلت درست، مناکحت روا ۔ غرض ، مغائرت کہ اہل اسلام عیسائیوں کے ساتھ برتتے

---

۲ - یہ لفظ کرسچین (Christian) کی بگڑی ہوئی صورت ہے ۔

۳- دین نصاریٰ کے عالم قسیس کہلاتے ہیں ۔ یہاں قرآن مجید کی ایک آیت کی طرف اشارہ ہے جہاں اللہ تعالیٰ یہود و نصاریٰ کے بارے میں فرماتا ہے :

(ترجمہ) تمام آدمیوں میں سب سے زیادہ مسلمانوں سے عداوت رکھنے والے ان یہود اور مشرکین کو پاؤ گے اور مسلمانوں سے دوستی میں قریب تر ان کو پاؤ گے جو اپنے کو نصاریٰ کہتے ہیں ۔ یہ اس سبب سے کہ ان میں علماء قسیسین اور مشائخ (رہبان) ہیں۔ نیز اس لیے کہ یہ لوگ تکبر نہیں کرتے۔ (سورہ : ۵ ۔ آیت : ۸۲)

ہیں ، ایک امر نامشروع ہے اور میں نہیں سمجھتا کہ ہمارے مذہب کی عمدہ کتابیں تمھارے دل پر پادری صاحب کی کتاب سے بہتر اثر کرتیں ۔ خصوصاً جو ضرورت کہ مجھ کو در پیش ہے ، مجھ کو یقین ہے کہ تمھارا اس کتاب کو دیکھ لینا اس میں بہت کام آئے گا ۔ ہم دردی کی جیسی کچھ تاکید ہے ، تم نے اس کتاب میں دیکھا ہوگا ۔

بیٹا : ''اگر وہ مذہبی کتاب تھی ، تو میں جانتا ہوں کہ خاکساری و ہم دردی شرط عیسائیت ہے ۔''

باپ : ''شرط عیسائیت ، بلکہ شرط انسانیت ہے ۔

درد دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو
ورنہ طاعت کے لیے کچھ کم نہ تھے کروبیاں

لیکن میں تم سے سننا چاہتا ہوں کہ تم اس فرض کی تعمیل کہاں تک کرتے ہو ۔''

بیٹا : ''جناب شاید اگر میں اس کو ہم دردی کہہ سکوں تو مدرسے کا جو لڑکا مجھ سے کچھ پوچھنا یا پڑھنا چاہتا ہے ، میں اس میں مطلق دریغ نہیں کرتا ، گو میرا ذاتی حرج بھی ہوتا ہو ۔ امتحان سالانہ میں مجھ کو نقد روپے ملے تھے ، میں نے ایک پیسہ اپنے اوپر خرچ نہیں کیا ۔ محلے میں چند آدمی رہتے ہیں ، جن کو میں محتاج سمجھتا ہوں ۔ وقتاً فوقتاً ان کو اس میں سے دیتا رہا ۔ بلکہ ایک مرتبہ میں ایک دقت میں بھی مبتلا ہوگیا تھا ۔''

باپ : ''وہ کیا ؟''

بیٹا : "ایک مرتبہ عید کو ایک بڑی بھاری ٹوپی مجھ کو اماں جان نے بنا دی تھی - وہی ٹوپی اوڑھے ہوئے میں خانہ جان کے یہاں جاتا تھا - میاں مسکین[۴] کے کوچے میں پہنچا تو بہت سے چپڑاسی پیادے ایک گھر کو گھیرے ہوئے تھے اور بہت سے تماشائی بھی وہاں جمع تھے - یہ دیکھ کر میں بھی لوگوں میں جا گھسا تو معلوم ہوا کہ ایک نہایت غریب بوڑھی سی عورت ہے اور چھوٹے چھوٹے کئی بچے ہیں - سرکاری پیادے اس کے میاں کو پکڑے لیے جاتے تھے - اس واسطے کہ اس نے کسی بنیے کے یہاں سے آدھار کھایا تھا اور بنیے نے اس پر ڈگری جاری کرائی تھی - وہ مرد مانتا تھا کہ قرضہ واجب ہے ، مگر کہتا تھا کہ میں کیا کروں ، اس وقت بالکل تہی دست ہوں - ہر چند اس بے چارے نے بنیے کی اور سرکاری پیادوں کی بہتیری ہی خوشامد کی ، مگر نہ بنیا مانتا تھا ، نہ پیادے باز آتے تھے اور پکڑے لیے جاتے تھے - لوگ جو وہاں کھڑے تھے ، انھوں نے بھی کہا : "لالہ ، جہاں تم نے اتنے دنوں صبر کیا ، دس پانچ روز اور صبر کر جاؤ -" تو بنیا بولا :

---

۴ - کوچے کا یہ نام اگرچہ آئندہ واقعے کی مناسبت اور خان صاحب کی مسکینی کی رعایت سے منتخب کیا گیا ہے ، لیکن کوچہ حکیم بقا کی طرح (جس کا ذکر پہلے باب کی ابتداء میں آیا ہے) اس نام کا ایک کوچہ بھی دہلی میں موجود تھا - توبۃ النصوح (مطبوعہ لندن ۱۸۸۶ء) کے مرتب مسٹر ایم - کیمپسن کتاب کے حاشیے میں لکھتے ہیں :

"This street as well as that named at the commencement of the tale, really exists" (P. 128)

''اچھی کہی میاں جی ، اچھی کہی ! برسوں کا نانواں[5] اور روج کی ٹال مٹول ۔ بھگوان جانے ابھی تو کھان صاحب کی اجّت آتروائے لیتا ھوں ۔''

وہ شخص جس پر ڈگری جاری تھی ، غریب تو تھا ، لیکن غیرت مند بھی تھا ۔ بنیے نے جو عزت آتروانے کا نام لیا ، سرخ ھوگیا اور گھر میں گھس ، تلوار میان سے نکال چاھتا تھا کہ بنیے کا سر الگ کر دے کہ اس کی بیوی اس کے پیروں میں لپٹ گئی اور رو کر کہنے لگی : ''خدا کے لیے کیا غضب کرتے ھو ۔ یہی تمھارا غصہ ھے تو پہلے مجھ پر اور بچوں پر ھاتھ صاف کرو ۔ کیوں کہ تمھارے بعد ھمارا تو کہیں بھی ٹھکانا نہیں ۔'' ماں کو روتا دیکھ بچے اس طرح دھاڑیں مار کر روئے کہ میرا دل ھل گیا اور دوڑ کر سب کے سب باپ کو لپٹ گیے ۔ ان کی یہ حالت دیکھ کر خان صاحب بھی ٹھنڈے ھوئے اور تلوار کو میان کر کھونٹی سے لٹکا دیا اور بی‌بی سے کہا : ''اچھا تو نیک بخت ، پھر مجھ کو اس بے عزتی سے بچنے کی کوئی تدبیر بتا ۔'' بی‌بی نے کہا : ''بلا سے جو چیز گھر میں ھے ، اس کو دے کر کسی طرح اپنا پنڈ چھڑاؤ ۔ تم کسی طرح رہ جاؤ تو پھر جیسی ھوگی دیکھی جائے گی ۔

توا ، چکی ، پانی پینے کا کٹورا ، نہیں معلوم کن کن

---

۵ ۔ قرضے کی وہ رقم جو کسی کے نام لکھی ھوئی ھو ، بنیوں اور ساھوکاروں کی اصطلاح میں ''نانواں'' کہلاتی ھے ۔ اسی سے ''نانواں چکانا'' ، قرضہ ادا کرنے یا حساب بیباق کرنے کے معنی میں آتا ھے ۔ بعد کے ایڈیشنوں میں مرتبین نے اس لفظ کو ''لہنا'' یا ''لینا'' سے بدل دیا ھے ۔

وقتوں کی ہلکی ہلکی بے قلعی دو پتیلیاں ، بس یہی اُس گھر کی کل کائنات تھی ۔ چاندی کی دو چوڑیاں ، لیکن ایسی پتلی جیسے تار ، اُس نیک بخت عورت کے ہاتھوں میں تھیں ۔ یہ سب سامان خان صاحب نے باہر لا کر اُس بنیے کے روبہ رو رکھ دیا ۔ اول تو بنیا ان چیزوں کو ہاتھ ہی نہیں لگاتا تھا ۔ لوگوں نے بہت کچھ کہا سنا ۔ یہاں تک کہ ان سرکاری پیادوں کو بھی رحم آیا ، اُنھوں نے بھی بنیے کو سمجھایا ۔ بارے خدا خدا کر کے وہ اس بات پر رضامند ہوا کہ پانچ روپے اصل ، دو روپے سود ، ساتوں کے ساتوں دے دیں تو فارغ خطی لکھ دے ۔ لیکن خان صاحب کا کل اثاثہ چار ساڑھے چار سے زیادہ کا نہ تھا ۔ تب پھر گھر میں گئے اور بی‌بی سے کہا کہ ڈھائی روپے کی کسر رہ گئی ہے ۔ تو بی‌بی نے کہا : 'اب تو کوئی چیز بھی میرے پاس نہیں' ہاں لڑکی کے کانوں میں چاندی کی بالیاں ہیں ۔ دیکھو جو ان کو ملا کر پوری پڑے ۔'

وہ لڑکی کوئی چھ برس کی تھی ۔ بس بعینہ جتنی ہماری حمیدہ ۔ ماں جولگی اس کی بالیاں آتارنے تو وہ لڑکی اس حسرت کے ساتھ روئی کہ مجھ سے ضبط نہ ہو سکا اور میں نے دل میں کہا کہ الٰہی اس وقت مجھ سے کچھ بھی اس کی مدد نہیں ہوسکتی ۔ فوراً خیال آیا کہ ایک روپیہ اور کوئی دو آنے کے پیسے تو نقد میرے پاس ہیں ۔ دیکھوں ٹوپی بک جائے تو شاید خاں صاحب کا سارا قرضہ چک جائے ۔ بازار تو قریب تھا ہی ، فوراً میں گلی کے باہر نکل آیا ۔ رومال تو سر سے لپیٹ لیا اور ٹوپی ہاتھ میں لے ایک گوٹے والے کو دکھائی ۔ اُس نے چھ‌ ‌سے کی آنکی ۔ میں نے بھی چھوٹتے ہی کہا :

''لا بلا سے پچھےہی دے ۔'' غرض چھ وہ ، ایک میرے پاس نقد تھا ، ساتوں روپے لے میں نے چپکے سے اس عورت کے ہاتھ پر رکھ دیے ۔ تب تک پیادے خان صاحب کو گرفتار کر کے لے جا چکے تھے اور گھر میں رونا پیٹنا مچ رہا تھا ۔ دفعةً پورے سات روپے ہاتھ میں دیکھ کر اس عورت پر شادیٔ مرگ کی سی کیفیت طاری ہوگئی اور اس خوشی میں اس نے کچھ نہیں سوچا کہ یہ روپیہ کیسا ہے اور کس نے دیا ۔ فوراً اپنے ہمسائے کو روپیہ دے کر دوڑایا اور خود بچوں سمیت دروازے میں آ کھڑی ہوئی ۔ بات کی بات میں خان صاحب چھوٹ آئے تو بچوں کو کیسی خوشی کہ کودیں اور اچھلیں ، کبھی باپ کے کندھے پر ، کبھی ماں کی گود میں اور کبھی ایک پر ایک ۔

اب اس عورت کو میرا خیال آیا اور بچوں سے بولی : ''کم بختو ، کیا اودھم مچائی ہے ۔ (اور میری طرف اشارہ کر کے کہا) دعا دو اس اللہ کے بندے کی جان و مال کو جس نے آج باپ کی اور تم سب کی جانیں رکھ لیں ، نہیں تو ٹکڑا بھی مانگا نہ ملتا ۔ کوئی چچا یا ماموں بیٹھا تھا کہ اس کو تمھارا درد ہوتا اور اس مصیبت کے وقت تمھاری دست گیری کرتا ۔ صرف ایک باپ کے دم کا سہارا کہ اللہ رکھے ، اس کے ہاتھ پاؤں چلتے ہیں تو محنت سے مزدوری سے ، خدا کا شکر ہے ، روکھی سوکھی روز کے روز ، دو وقت نہیں تو ایک ہی وقت ملے تو جاتی ہے ۔ ہمارے حق میں تو یہ لڑکا کیا ہے رحمت کا فرشتہ ہے ۔ نہ جان نہ پہچان ، نہ رشتہ نہ ناتا اور اس اللہ کے بندے نے مٹھی بھر روپے دے کر آج ہم سب کو نئے سر سے زندہ کیا ۔''

وہ بچے جس شکر گزاری کی نظر سے مجھ کو دیکھتے تھے، اس کی مسرت اب تک میں اپنے دل میں پاتا ہوں ۔ روپیہ خرچ کرنے کے بعد مجھ کو عمر بھر ایسی خوشی نہیں ہوئی ، جیسی کہ اس دن تھی ۔ مگر دونوں میاں بیوی کے ذہن میں اس وقت یہ بات نہیں آئی تھی کہ میں نے روپیہ ان کو دے دیا ۔ وہ سمجھتے تھے کہ قرض کے طور پر دیا ہے ۔ وہ عورت مجھ کو اپنے گھر میں لے گئی اور ٹوٹی سی ایک چوکی پڑی تھی ، میں ہر چند منع کرتا رہا ، جلدی سے اس کو اپنے دوپٹے سے جھاڑ مجھ کو بیٹھنے کا اشارہ کیا اور میاں سے بولی : ”نوج کوئی تم جیسا بے خبر ہو ۔ کھڑے کیا ہو ۔ جاؤ ، ایک گوری بازار سے میاں کے لیے بنوا لاؤ ۔“

مَیں : ”نہیں میں پان نہیں کھاتا ۔ تکلیف مت کرو ۔“

عورت : ”بیٹا تمھاری خدمت میں اور ہم کو تکلیف؟ جی چاہتا ہے کہ آنکھیں تمھارے تلووں میں بچھا دوں ۔ قربان اس پیاری پیاری صورت کے ۔ نثار اس بھولی بھالی شکل کے ۔ بیٹا ! تم یہ بتاؤ کہ تم ہو کون ؟“

مَیں : ”میری خالہ ، میاں صابر بخش کی سرائے میں رہتی ہیں ۔“

عورت : ”پھر بیٹا یہ اپنا روپیہ تم ہم سے کب لوگے ؟ ہم اپنا اور بچوں کا پیٹ کاٹیں گے اور تمھارا قرضہ سب سے پہلے ادا کریں گے ، مگر کام ان دنوں مندا ہے ۔ دیں گے تو ہم جس طرح بن پڑے گا دو ہی مہینے میں ، مگر

جہاں تم نے اتنی مہربانی کی ہے ، للہ اتنا سلوک اور کرو کہ دو روپے مہینہ قسط کا لے لیا کرو ۔''

میں : ''آپ روپے ادا کرنے کا فکر[٦] نہ کیجیے ۔ میں نے لینے کی نیت سے نہیں دیے ۔''

یہ سن کر تمام خاندان کا خاندان اتنا خوش ہوا کہ میں بیان نہیں کر سکتا اور میں ان میں اس وقعت کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا جیسے خوش دل اور شکر گزار رعایا میں کوئی بادشاہ یا حلقۂ مریدانِ ارادت مند میں کوئی پیر و مرشد ۔ اس عورت کے منہ سے مارے خوشی اور شکر گزاری کے بات نہیں نکلتی تھی ۔ بار بار میری بلائیں لیتی تھی اور میرے ہاتھوں کو چومتی اور آنکھوں کو لگاتی تھی ۔ اسی کی بلاؤں میں رومال سر پر سے کھسک گیا تو اس نے دیکھا کہ میرے سر پر ٹوپی[٧] نہیں ۔ پوچھا تو مجھ کو کہنا پڑا کہ وہی ٹوپی بیچ کر میں نے روپیہ دیا ۔ پھر تو اس کا یہ حال تھا کہ بچھی جاتی تھی ۔ سات روپیہ کی بھی کچھ حقیقت تھی مگر اس نے مجھ کو سینکڑوں ہزاروں ہی دعائیں دی ہوں گی ۔ اس نے جو اتنی احسان مندی ظاہر کی تو میں الٹا اسی کا ممنون ہوا ۔ جس قدر خوشامد کرتی تھی ، میں شرمندہ ہوتا تھا اور جتنا وہ عاجزی سے پیش آتی تھی ، میں

---

٦ ۔ دہلی میں یہ لفظ مذکر بولا جاتا ہے ۔ نذیر احمد بھی عموماً مذکر ہی لکھتے ہیں ۔ لیکن اس کتاب میں دو تین جگہ فکر کے ساتھ تانیث کا صیغہ استعمال کیا ہے ۔

٧ ۔ اس زمانے میں برہنہ سر باہر نکلنا اس قدر خلاف تہذیب سمجھا جاتا تھا کہ لوگ دیکھ کر تعجب کرتے تھے ۔

زمین میں گڑا جاتا تھا ۔

غرض میں وہاں سے رخصت ہوا تو ٹوپی نہ ہونے کی وجہ سے سیدھا گھر لوٹ آیا ۔ عین گلی میں بھائی جان سے ملاقات ہوئی ۔ انھوں نے میری ہیئت کذائی دیکھ کر تعجب کیا اور بولے : ''ایں! کیا ٹوپی کے بدلے چنے لے کھائے ؟'' میں نے کچھ جواب نہیں دیا ، اس واسطے کہ مجھ کو اُس بات کا ظاہر کرنا منظور نہ تھا ۔ شام کو بھائی جان سے اور اماں جان سے تکرار ہوئی ۔ بھائی جان کچھ روپے مانگتے تھے اور اماں جان کہتی تھیں : ''بیٹا ان فضول خرچیوں سے گھر کے دن چلے گا ؟ لو پرسوں میں نے تم کو چار روپے دیے تم نے چاروں کے چاروں برابر کیے ۔ ناخن بھر چیز تم گھر میں لائے ہو تو بتا دو ۔ اتنا چٹورپن ، ایسا اسراف !'' بھائی جان نے کہا : ''میں چٹورا نہیں ہوں ، چٹورے تمھارے منجھلے صاحب زادے ہیں جن کو تم بڑا مولوی سمجھتی ہو کہ سر کی ٹوپی تک بیچ کر کھا گئے ۔''

اماں جان نے مجھ کو بلا کر پوچھا ۔ میں نے کہا : ''اگر بیچ کر کھانا ثابت ہو جائے تو جو چور کی سزا وہ میری سزا ۔''

امّاں جان : ''پھر کہیں کھودی ؟''

مَیں : ''کھوئی بھی نہیں ۔''

امّاں جان : ''بھائی تو تو عجب تماشے کا لڑکا ہے ۔ بیچی نہیں ، کھوئی نہیں ، پھر ٹوپی گئی تو کہاں گئی ؟''

مَیں : ''اگر آپ کو میری بات کا اعتبار ہے تو بس سمجھ لیجیے کہ میں نے کہیں اس کو بے جا طور پر صرف نہیں کیا ۔''

امّاں جان : ''اگر یہی تمھارے لچھن ہیں تو تم نے پڑھ لکھ کر ڈبو دیا ۔''

میں اس وقت عجب مشکل میں مبتلا تھا ۔ ظاہر کرنے کو جی نہ چاہتا تھا اور بے ظاہر کیے بن نہ پڑتی تھی ۔ ع

گویم مشکل وگر نہ گویم مشکل[8]

مگر مجھ کو یقین تھا کہ جب میرا معاملہ پاک صاف ہے تو دو بالفعل بھائی جان کے کہنے اور میرے چپ رہنے سے اماں جان کو ایک بدگمانی سی ہو گئی ہے لیکن کبھی نہ کبھی ضرور ان کے دل سے خدشہ دفع ہو ہی جائے گا ۔ اور کچھ نہ ہوگا تو میرے اگلے پچھلے فعلوں کو دیکھ کر اتنا تو سمجھ لیں گی کہ بیٹا بد راہ نہیں ہے ، نہیں معلوم ٹوپی کا کیا بھید ہے ۔ سو خدا کی قدرت ، ایک ہفتہ بھی نہیں گزرا تھا کہ صالحہ بیمار پڑی تو اماں جان اس کی عیادت کو گئیں ۔ میں ان کے ساتھ تھا ۔ ابھی اماں جان سواری سے نہیں اتری تھیں کہ ادھر سے وہی خان صاحب چلے آ رہے تھے ۔ مجھ کو دیکھ کر دور ہی سے دعائیں دینے لگے اور ایسے تپاک اور دل سوزی کے ساتھ میری خیر و عافیت پوچھی کہ جیسے کوئی اپنا بزرگ اور عزیز دریافت حال کرتا ہے ۔ خیر میں نے مناسب حالت جواب دیا ۔ اماں جان آخر یہ سب

---

۸ ۔ کہوں تو مشکل نہ کہوں تو مشکل ۔ گو مگو کا عالم۔

باتیں پردے کے اندر بیٹھی ہوئی سن رہی تھیں ۔ آترنے کے ساتھ ہی مجھ سے پوچھا : ''علیم ، یہ کون شخص تھا جو تم سے باتیں کرتا تھا ؟''

مَیں : ''یہ ایک خان صاحب ہیں اور میاں مسکین کے کوچے میں رہتے ہیں ۔ بس میں اسی قدر جانتا ہوں ۔''

امّاں جان : ''لیکن باتیں تو تم سے ایسے گرویدہ ہو ہو کر کرتے تھے کہ گویا برسوں کی پہچان ہے ۔''

مَیں : ''نہیں شاید ان کو میرا نام بھی معلوم نہیں ۔''

امّاں جان : ''پھر تمھارے ساتھ ایسے خلوص سے کیوں پیش آئے ؟''

مَیں : ''بعض لوگوں کا دستور ہوتا ہے کہ ذرا سے تعارف سے بھی بڑے تپاک کے ساتھ پیش آیا کرتے ہیں ۔''

اگرچہ میرے جواب سے اماں جان کی تشفی نہیں ہوئی مگر ان کو اندر جانے کی جلدی تھی ، چلی گئیں ۔ خان صاحب نے کہیں اپنے گھر میں میرا تذکرہ کیا ۔ میں تو گھر چلا آیا ۔ مگر گمان غالب ہے کہ ان کی بیوی اماں جان کے پاس گئیں اور میرے اس ٹوپی بیچنے اور روپیہ دینے کا تمام ماجرا بیان کیا ۔ پھر جو اماں جان آئیں تو مجھ سے کہنے لگیں : ''علیم ہم نے تمھاری چوری آخر پکڑی پر پکڑی ۔'' میں نے حیران ہو کر پوچھا کہ میری چوری ؟

امّاں جان : ''ہاں تمھاری چوری ۔''

مَیں : ''بھلا میں بھی تو سنوں ۔''

امّاں جان : ”کیوں ؟ تم پہلے ٹوپی کا حال بتاؤ تب مجھ سے اپنی چوری کی حقیقت سنو ۔“

اتنا کہنے سے میں سمجھ گیا اور ہنس کر چپ ہو رہا ۔

باپ : ”بے شک ، جتنی باتیں تم نے بیان کیں ، داخل ہم دردی ہیں ۔ خصوصاً خان صاحب کا قصہ ہم دردی کی ایک اعالی درجے کی مثال ہے ۔ لیکن چشمے سے وہ مقامات سیراب ہونے چاہئیں جہاں سے وہ چشمہ نکلا ہے ۔ اسی طرح پہلے اپنے عزیز و اقارب ، نیکی اور سلوک کے مستحق ہیں ۔“

بیٹا : ”میں خدا کا شکر کرتا ہوں کہ میرے قریب کے رشتہ دار میرے سلوک کے حاجت مند نہیں ہیں اور خدا نے اُن کو مجھ سے بے نیاز اور مستغنی کیا ہے ۔“

باپ : ”کیا سلوک صرف روپے پیسے کے دینے سے ہی ہوتا ہے ؟“

بیٹا : ”میں تو ایسا ہی سمجھتا تھا ۔“

باپ : ”نہیں ، جو جس چیز کا حاجت مند ہے اس کا رفع حاجت کرنا ہم دردی اور نفع رسانی ہے ۔ ہمارا خاندان دین داری سے بے بہرہ اور خدا شناسی سے بے نصیب ہے اور شیوۂ خدا پرستی میں ہر ہر متنفس کو تعلیم و تلقین کی حاجت اور وعظ و نصیحت کی ضرورت ہے ۔ تم نے اس فرض کو ادا کرنا تو درکنار ابھی تک فرض ہی نہیں سمجھا ۔“

بیٹا : ”آپ بجا فرماتے ہیں ، مجھ سے بڑی غلطی ہوئی ۔“

باپ : ''اور تم سے کہیں زیادہ غلطی میری ہے ۔ بہر کیف ، اب بھی تلافیٔ مافات کرنی ضرور ہے اور میں نے مصمم ارادہ کر لیا ہے کہ اپنے گھر میں کسی کو لایعنی طور پر زندگی نہ بسر کرنے دوں ۔ اگرچہ اس بات کو نہایت حسرت و افسوس کے ساتھ تسلیم کرتا ہوں کہ اب اصلاح کا وقت باقی نہیں اور میرا عزم ، عزم بے ہنگام ہے ۔ لیکن اگر تم میری مدد کرو تو میں کامیابی کی بہت کچھ امید کرسکتا ہوں ۔''

بیٹا : ''ان شاء اللہ ، آپ مجھ کو نافرمان بیٹا اور نا خلف فرزند نہیں پائیں گے ۔ مگر مجھ کو حیرت ہے کہ میں آپ کی کیا مدد کر سکوں گا ۔''

باپ : ''تمھارا یہی مدد کرنا ہے کہ بس تم دین داری کا نمونہ بن جاؤ اور اگرچہ معلوم ہوتا ہے کہ ان دنوں تم نے بہ ضرورت امتحان ، موسمی توبہ ''کر'' رکھی ہے لیکن مناسب یہ ہے کہ گنجفہ ، شطرنج ، کنکوا ، بٹیریں ، مرغ ، تمام مشاغل لایعنی کے ترک کا عہد واثق کرو ۔''

بیٹا : ''یہ تو سراسر میری منفعت کی بات ہے اور اگر میں اس میں کسی طرح کا انکار کروں تو آپ کی نافرمانی ، اپنی خرابی ، خدا کا گناہ ، دنیا کی بد نامی ، عاقبت کی رسوائی ، کوئی پہلو بھی تو اچھا نہیں ۔ اور اگر بالفرض آپ کوئی ایسی بات بھی فرماتے جس میں میرا نقصان ہوتا ، تاہم مجھ کو سوائے تعمیل ارشاد کیا چارہ تھا ۔ بندہ اور خدا ، غلام اور مالک ، رعیت اور بادشاہ ، نوکر اور آقا ، بیوی اور شوہر ، شاگرد اور استاد ، بیٹا اور باپ ، میں تو جانتا ہوں یہ سب

کچھ ایک ہی طرح کی نسبتیں ہیں اور میں وعدہ کرتا ہوں کہ ان شاء اللہ ، میرا طرز زندگی آئندہ ایسا ہی ہوگا جیسا آپ کو منظور ہے ۔''

باپ : ''بارک اللہ و جزاک اللہ[۹] ۔ بس تم نے آج مجھ کو مطمئن کر دیا ۔ خدا تم کو دین اور دنیا دونوں میں سرخ رو رکھے ۔ اچھا اب جاؤ اپنا کام کرو ۔ ذرا اپنے بڑے بھائی کو میرے پاس بھیج دینا ۔''

بیٹا : ''شاید آپ یہی گفتگو اُن سے کرنی چاہتے ہیں ۔''

باپ : ''ضرور ۔''

بیٹا : ''اگر بالمشافہ ان سے گفتگو نہ ہوتی تو میرے نزدیک بہتر تھا ۔''

باپ : ''تمھارا خوف بے جا نہیں ہے ۔ میں کئی کئی دن سے اس بات میں غور کر رہا ہوں ۔ آخرکار یہی تجویز ٹھہری کہ ایک دفعہ مجھ کو رُو در رُو اتمامِ حجّت کر دینا ضرور ہے ۔''

۹ ۔ خدا تجھے برکت دے اور نیک بدلہ دے ۔

فصل ہفتم

نصوح نے بڑے بیٹے کلیم کو بلایا اور ہر چند فہمیدہ اور علیم دونوں نے سمجھایا مگر وہ نہ آیا پر نہ آیا

غرض علیم رخصت ہو کر مردانے مکان میں گیا تو میاں کلیم کو پیام طلب جا سنایا۔

کلیم: "کیا ہے۔ خیریت تو ہے؟ آج کل تو ہم لوگوں پر بڑی عنایت ہے۔"

علیم: "بھلا کبھی عنایت نہیں بھی تھی؟"

کلیم: "اس کو کوئی سلیم[1] سے پوچھے۔"

اتنے میں سلیم بھی دروازے سے نمودار ہوا۔ مگر اس سے پہلے وہ اپنا سر منڈوا چکا تھا اور اس خیال سے کہ ایسا نہ ہو بڑے بھائی جان دیکھ لیں، چاہتا تھا کہ چپکے چپکے

[1] - تعریض ہے حال سابق پر کہ سلیم شوخی کے پیچھے اکثر باپ کے ہاتھ سے پٹتا رہا تھا *

دبے پاؤں گھر میں گھس جائے ۔ لیکن جوں ہی بے چارے نے گھر کے اندر قدم رکھا کہ کلیم نے آواز دی ۔ سلیم تو بھائی کی آواز سن کر کانپ اٹھا اور سمجھا کہ سر منڈاتے ہی اولے پڑے ۔ مگر منجھلے بھائی کو بیٹھا ہوا دیکھ کر کسی قدر دم میں دم آیا اور پاس آ کر بے پوچھے کہنے لگا کہ ابا جان کے حکم سے میں نے آج بال منڈا دیے ۔

بڑا بھائی (منجھلے کی طرف مخاطب ہو کر) : ''دیکھیے 'صورت ببیں حالش مپرس[۲] ۔' ایک شفقت پدری تو یہ ہے کہ بے چارے کی اچھی خاصی صورت کو لے کر بگاڑ دیا اور برسوں کی کمائی خاک میں ملوا دی ۔

ایک ہم ہیں کہ لیا اپنی ہی صورت کو بگاڑ
ایک وہ ہیں جنھیں تصویر بنا آتی ہے[۳]

کیوں سلیم ، تمھارا دل تو بالوں کے واسطے بہت کڑھا ہوگا؟''

چھوٹا بھائی : ''میں تو خود ایک مدت سے بالوں کے منڈوا دینے کی فکر میں تھا ۔ بلکہ شاید آپ کو یاد ہو ، ایک مرتبہ سر کھول کر حجام کے رو بہ رو بیٹھ گیا تھا ۔ آپ خفا ہونے لگے تو میں اٹھ کھڑا ہوا ۔''

بڑا بھائی : ''آہا ! اب مجھ کو یاد آیا کہ تمھارے ان چار یاروں نے جن کو میں مکر و فریب کے عناصر اربعہ سمجھتا ہوں ، تم کو بھکا دیا تھا ۔ بھلا ایسے کوڑھ مغزوں کو کالج میں پڑھنے سے فائدہ؟

۲ ۔ صورت ہی دیکھ لو ، حال نہ پوچھو ۔
۳ ۔ یہ شعر ، اس صفحے کا آخری جملہ اور اس سے اگلا شعر ، ابتدائی ایڈیشن کے بعد کتاب سے خارج کر دیے گئے ۔

صحبت عیسیٰ بنائے خر کو انسان کس طرح
تربیت سے واقعی نا اهل دانا کب بنے

چھوٹا بھائی: ''آپ ناحق ان بےچاروں کو برا کہتے ہیں۔ وہی بات تو ابا جان نے بھی کہی۔''

بڑا بھائی: ''ابا جان نے ابھی بیماری سے اٹھ کر کہی یا کبھی پہلے بھی کہی تھی۔''

چھوٹا بھائی: ''نہیں پہلے تو کبھی کچھ نہیں کہا۔''

بڑا بھائی: ''پھر سمجھ لو کہ ابا جان کو خلل دماغ ہے۔ میں نے تو شروع ہی میں کہہ دیا تھا کہ ڈاکٹر نے جو اسہال بند کرنے کی دوا دی ہے، ابخرے دماغ کو چڑھ گئے ہیں۔''

منجھلا بھائی: ''یہ کیسی بات آپ کہتے ہیں۔ ابھی میں ابا جان کے پاس سے چلا آتا ہوں۔ دو گھنٹے تک متواتر مجھ سے گفتگو کرتے رہے۔ میرے نزدیک تو ان کے خیالات پہلے سے کہیں عمدہ اور معقول ہو گئے ہیں۔''

بڑا بھائی: ''سنتا ہوں کہ ان دنوں نماز بہت پڑھا کرتے ہیں۔''

منجھلا بھائی: ''تو کیا اسی کو آپ نے خلل دماغ قرار دیا۔''

بڑا بھائی: ''کیا خلل دماغ کے سر میں سینگ لگے ہوتے ہیں۔ بیمار ہو کر اٹھے تھے، کوئی بڑا بھاری جلسہ کرتے

کہ شہر میں نام ہوتا ۔ آٹھرے بھی تو اونگھتے ہوئے۔ دو چار مرتبہ میں نے ان کو مسجد میں نماز پڑھتے دیکھا ہے ۔ یہ نوری جولاھا تو امام بنتا ہے اور محلے کے سقے، حجام، کنجڑے، مسجد کے مسافر، اس قسم کے لوگ اس کے مقتدی ہوتے ہیں اور ان ہی میں یہ حضرت بھی جا کر شریک نماز ہوتے ہیں ۔ بھائی میں تو تم سے سچ کہوں، یہ دیکھ کر مجھ کو اس قدر شرم آتی ہے کہ میں نے ادھر کا رستہ چلنا چھوڑ دیا ۔ یہ مُلّانے، جو خدا کی قدرت، ہمارے ابا جان کے ہم نشین بنے ہیں، اس قدر تو ذلیل اوقات ہیں کہ دعوت کے لقموں اور مسجد کی روٹیوں پر تو ان کی گزر ہے مگر مغرور بھی پرلے ہی سرے کے ہوتے ہیں۔ کبھی راہ میں مڈبھیڑ ہو جاتی ہے، تو خیر یہ تو مجال نہیں کہ سلام نہ کریں لیکن اتنے بڑے ٹرّے کہ بندگی، نہ آداب، نہ تسلیم، دور ہی سے السلام علیکم کا پتھر کھینچ مارتے ہیں ۔ ہاتھ یہ نہیں اٹھاتے، سر یہ نہیں جھکاتے اور اس پر طرہ یہ کہ سو قدم سے مصافحے کو ہاتھ پھیلا کر لپکتے ہیں ۔ ع

دراز دستی ایں کوتہ آستیناں بیں[۴]

سلیم! تم کو صرف سر ہی منڈانے کا حکم تھا یا نماز کی بھی ہدایت ہوئی ہے ۔''

چھوٹا بھائی: ''جناب نماز کے لیے تو سخت تاکید کی ہے کہ خبردار کسی وقت کی قضا نہ ہونے پائے اور اس کے علاوہ کنکوا اڑانا، شطرنج کھیلنا، جانوروں کی لڑائی میں

---

۴ ۔ ان چھوٹی آستین والوں کو دیکھ، کیسے لمبے لمبے ہاتھ مارتے ہیں ۔

شریک ہونا ، جھوٹ بولنا ، قسم کھانا ، بے ہودہ بات بکنا ، برے لڑکوں میں بیٹھنا ، ان سب باتوں سے منع کیا ہے ۔''

بڑا بھائی : ''کیوں نہیں تم سے ایک ہی بات کہہ دی کہ مر رہو ۔''

منجھلا بھائی : ''(یہ جملہ سن کر بے اختیار ہنس پڑا اور کہنے لگا) کیا آپ کے نزدیک ان شرطوں کی تعمیل کرنا اور مرنا دونوں برابر ہیں ؟''

بڑا بھائی : ''جب تمام کھیلوں کی ممانعت اور لوگوں سے ملنے اور بات کرنے کی بندی ہوئی تو تم ہی انصاف کرو کہ ایسے جینے اور مرنے میں کیا امتیاز ہو سکتا ہے ۔

زندگی زندہ دلی کا ہے نام
مردہ دل خاک جیا کرتے ہیں

منجھلا بھائی : ''میں تو سمجھتا ہوں کہ ہماری بالفعل کی زندگی کی نسبت اس طرح کی زندگی میں جو ابا جان تعلیم کرتے ہیں ، روحی مسرت زیادہ ہے ۔ اگرچہ میں کھیل کود کی چیزوں میں خصوصاً ان دنوں کم مصروف ہوتا ہوں ، اس واسطے کہ مدرسے کے کام سے فرصت نہیں ملتی مگر جتنا مصروف ہوتا ہوں ، اس سے سوائے کوفت اور کبیدگی کے میں تو کوئی نتیجہ نہیں دیکھتا ۔ رہا یار دوستوں کا مشغلہ ، سو میں ان میں سے کسی کو کسی کا دوست نہیں سمجھتا ۔ بھلا کوئی سے دو ایسے بتائیے جن میں ہر روز تُو تُو مَیں مَیں کی نوبت نہ پہنچتی ہو ۔''

بڑا بھائی : "پھر بھی یہ لوگ ان حجاموں ، کنجڑوں اور مسجد کے مسافروں سے بہتر ہیں جو نمازیں پڑھ پڑھ کر شریف بننا چاہتے ہیں ۔

زنہار ازاں قوم نہ باشی کہ فریبند
حق را بسجودے و نبی را بہ درودے[۵]"

منجھلا بھائی : "اگر شریف ایسے ہی ہوتے ہیں جیسے ہم اور ہمارے یار دوست ہیں تو میرے نزدیک ایسی شرافت پر کوئی معقول پسند آدمی ناز نہیں کر سکتا ۔ کون سی بے ہودگی ہے جو ہم لوگ نہیں کرتے ۔ خصوصاً جب کہ اکٹھے ہوں ۔ کون سی بے تہذیبی ہے جس کے امرتکب ہم نہیں ہوتے ، خاص کر اس وقت کہ ایک دوسرے سے ملیں ۔ دھول دھپا ، لام کاف ، چھیڑ چھاڑ ، مار کٹائی ، دھینگا مشتی ، ہاتھا پائی ، کس خاص چیز کا نام لوں ۔ ایک جلسہ اور دنیا بھر کی تفضیح ، ایک مجمع اور زمانے بھر کی رسوائی ۔ نام کے شریف اور پاجیوں کی سی عادت ، رکھنے کو بھلے مانس اور بازاریوں جیسی طبیعت ۔"

بڑا بھائی : "چلو خیر معلوم ہوتا ہے کہ تم تو بیعت کرنے کو تیار بیٹھے ہو ۔"

منجھلا بھائی : "تیار کیسا ، ابھی تو بیعت کیے چلا آتا ہوں ۔"

بڑا بھائی : "سلیم تم اپنی کہو ۔"

۵ ۔ ان لوگوں کے زمرے میں ہرگز شامل نہ ہونا جو اپنے سجدوں سے خدا کو اور درود سے رسول کو دھوکا دیتے ہیں ۔

چھوٹا بھائی : ”جناب ، میں ان سے پہلے منڈ چکا ہوں۔“

بڑا بھائی : ”تمھارا منڈنا سند نہیں ۔ تمھارا معاملہ ، ع

ور نہ ستانی بہ ستم می رسد[٦] ،

کا معاملہ ہے ۔ مگر (منجھلے بھائی کی طرف اشارہ کر کے) ان کو توڑا تو آنھوں نے اپنے نزدیک بڑا کفر توڑا ۔ رہ گیا اکیلا میں ۔“

منجھلا بھائی : ”آپ اسی وقت تک اکیلے ہیں کہ ابا جان تک نہیں پہنچے ۔ گئے اور داخلِ حلقہ ہوئے ۔“

بڑا بھائی : ”اجی بس اس کو دل سے دور رکھیں ۔ ع

یاں وہ نشے نہیں جنھیں ترشی آتار دے

منجھلا بھائی : ”ابا جان سے ملنا شرط ہے ۔“

بڑا بھائی : ”آخر کریں گے کیا ؟“

منجھلا بھائی : ”سمجھائیں گے ۔“

بڑا بھائی : ع

”میں نہ سمجھوں تو بھلا کیا کوئی سمجھائے مجھے“

منجھلا بھائی : ”وہ باتیں ہی اس طرح کی کہتے ہیں

---

٦ ۔ اگر تو نہ لے گا تو زبردستی پہنچ جائے گا (کیوں کہ جو کچھ قسمت میں ہے وہ مل کر رہتا ہے) ۔ پورا شعر یوں ہے :

ہرچہ نصیب است بہم می رسد
ور نہ ستانی بہ ستم می رسد

کہ لوہے کو پگھلائیں ، پتھر کو موم بنائیں ۔''

بڑا بھائی : ''تو بس میں بھی جا چکا ۔''

منجھلا بھائی : ''یہ بات تو آپ کی بالکل نامناسب ہے ۔''

بڑا بھائی : ہو ۔ ع

''رندِ عالم سوز را بامصلحت بینی چہ کار؎ ''

منجھلا بھائی : ''لیکن شاید ابا جان نے آپ کو کچھ اور ہی بات کے لیے بلایا ہو ۔''

بڑا بھائی : ''اجی تانت باجی راگ پایا ۔ اس کے سوا اور کوئی بات نہیں ۔''

منجھلا بھائی : ''اگر ابا جان نے دوبارہ بلوا بھیجا ۔''

بڑا بھائی : ''میں جانوں گا کہ ضرور ان کو خللِ دماغ ہے ۔''

منجھلا بھائی : ''والد ، جیسے میرے ویسے آپ کے ۔ آپ کو اختیار ہے ان کی شان میں جو چاہیں سو کہیں ۔ لیکن اتنا میں آپ سے کہے دیتا ہوں کہ اس اصرار کا انجام اچھا نہیں ۔''

بڑا بھائی : ''اتنا میں بھی سمجھتا ہوں لیکن میں اس انجام کی کچھ پروا نہیں کرتا ۔''

منجھلا بھائی : ''لیکن اس بگاڑ میں آپ فائدہ کیا

؎ ۔ اپنی دنیا تباہ کرنے والے رند کو مصلحت اندیشی سے کیا سروکار ۔

سمجھتے ہیں ؟"

بڑا بھائی : "اور میرا نقصان ہی کیا ہے ؟"

منجھلا بھائی : "اگر اور کچھ نقصان نہ بھی ہو تو ابا جان کی ناخوشی کیا کچھ تھوڑا نقصان ہے ؟"

بڑا بھائی : ع "رنج و آزردگی غیر سبب را چه علاج[۸]"

منجھلا بھائی : "اول تو ابھی آزردگی کی نوبت نہیں آئی لیکن اگر خدا نہ خواستہ آئے گی تو لوگ اس کو بے سبب نہیں کہیں گے ۔ اور سبب کی ابتدا آپ کی طرف سے ہوتی ہے کہ انھوں نے بلایا ہے اور آپ نہیں جاتے ۔ بھلا دنیا میں کوئی باپ ایسا ہوگا کہ فرزند اس کی نافرمانی کرے اور وہ ناخوش نہ ہو ۔"

بڑا بھائی : "ان کو میرے افعال سے بحث کیا ، اور میرے اعمال سے تعرّض کیوں ؟"

منجھلا بھائی : "اول تو میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ آپ سے کیا کہیں گے ، لیکن مانا کہ وہی کہیں جو مجھ سے اور سلیم سے کہا ، تو کیا ان کو نصیحت کا اختیار اور ہدایت کا منصب نہیں ہے ؟"

بڑا بھائی : "ہے ، لیکن حمیدہ پر ، سلیم پر ، اور تم پر ، کیوں کہ تم لوگ بہ طوعِ خاطر ان کی نصیحت سننی چاہتے ہو ۔"

منجھلا بھائی : "کیوں ؟ جیسے ہم ان کے فرزند

۸ - بے وجہ رنجش اور خفگی کا کیا علاج ۔

ویسے آپ ۔"

بڑا بھائی : "میں فرزند کبھی تھا ، اب سینگ کٹا کر بچھڑوں میں ملنا میرے لیے عار ہے ۔ اور میں اپنے تئیں ان کی حکومت سے مستثنیٰ اور ان کے اختیارات سے آزاد سمجھتا ہوں ۔"

منجھلا بھائی : "لیکن شریفوں میں یہ دستور نہیں ہے کہ اولاد بڑی ہو جائے تو ماں باپ کا ادب و لحاظ اٹھا دے ۔ میں دیکھتا تھا کہ ابا جان اس قدر جد مرحوم کا پاس کرتے تھے کہ ان کے سامنے حقہ پینا کیسا ، پان کھانے میں بھی ان کو تامل ہوتا تھا ۔ کیا آپ نے نہیں دیکھا ؟"

بڑا بھائی : "لیکن میں نے بھی اس وقت تک ابا جان کو الٹ کر جواب نہیں دیا ۔"

منجھلا بھائی : "درست ہے لیکن یا بہ آں شورا شوری یا بہ ایں بے نمکی[۹] ؟"

بڑا بھائی : "تالی دونوں ہاتھ سے بجتی ہے ۔ اب بھی اگر ابا جان میرے حال سے تعرض نہ کریں تو میں کسی طرح کی نا فرمانی یا گستاخی کرنی نہیں چاہتا ۔"

منجھلا بھائی : "تو اس صورت میں کچھ آپ کی اطاعت بھی محمود نہیں ہے ۔"

---

۹ - پہلے اتنی گرم جوشی کا اظہار اور اب ایسا پھیکا پن اور بے رخی ۔

بڑا بھائی : ''میں مدح سے باز آیا ۔ مجھ کو میرے حال پر رہنے دیں اور میرے نیک و بد سے متعرض نہ ہوں ۔

رند خراب حال کو زاہد نہ چھیڑ تو
تجھ کو پرائی کیا پڑی، اپنی نبیڑ تو''

منجھلا بھائی : ''اس کا یہ مطلب کہ آپ ان سے قطع تعلق کر چکے ۔''

بڑا بھائی : ''کیا ضرور ہے کہ جب میں پھر لڑکوں کی طرح مکتب میں پڑھوں تب ہی بیٹا کہلاؤں، ورنہ فرزندی سے عاق کیا جاؤں ۔''

منجھلا بھائی : ''کوئی آپ سے مکتب میں پڑھنے کے لیے نہیں کہتا اور یہ بھی امید نہیں ہے کہ ابا جان آپ کی بڑائی کا پاس نہ کریں ۔''

بڑا بھائی : ''جب کہ مجھ کو اپنا نیک و بد سمجھنے اور نفع و نقصان میں امتیاز کرنے کی عقل ہے تو مجھ سے یہ کہنا کہ یہ کرو اور یہ مت کرو، گویا مجھ کو بے تمیز لڑکا بنانا ہے ۔''

منجھلا بھائی : ''کیا انسان کی رائے غلطی نہیں کرتی ؟''

بڑا بھائی : ''ایسا احتمال ان کی رائے پر بھی ہو سکتا ہے ۔''

منجھلا بھائی : ''تو کیوں نہیں آپ انھی سے جا کر گفتگو کرتے کہ بحث ہو ہوا کر ایک بات قرار پا جائے ۔''

بڑا بھائی : ''مجھ کو گفتگو کرنے کی کچھ ضرورت نہیں - ع

ہر کسے مصلحت خویش نکو می داند۱۰

منجھلا بھائی : ''انھی کو ضرورت سہی - اور جب کہ آپ کو اپنی رائے پر وثوق ہے پھر آپ بالمشافہ گفتگو کرنے سے گریز کیوں کرتے ہیں ؟''

بڑا بھائی : ''دنیا میں کوئی مباحثہ طے ہوا ہے جو یہ ہوگا -''

منجھلا بھائی : ''ہٹ دھرمی اور تعصب اور سخن پروری نہ ہو تو پھر ہر بحث کا خاتمہ ہو سکتا ہے -''

بڑا بھائی : ''ہمارے ابا جان کو بھی ایک بات کی زڑ لگ جاتی ہے - اب نماز روزے کا خیال آگیا ہے تو بس اسی کی دھن ہے - چند روز بعد دیکھ لینا ، وہی ابا جان ہیں وہی ہم ہیں اور وہی کھیل تماشے ہیں -''

منجھلا بھائی : ''آپ چوں کہ مجھ سے بڑے ہیں ، بے شک زیادہ واقفیت رکھتے ہیں لیکن میں بھی ابا جان کے مزاج سے ناآشنا نہیں ہوں - اصلاحِ خاندان کا ان کو تہہ دل سے خیال ہے اور اس خصوص میں ان کو ایک اہتمامِ خاص ہے - میں نہیں کہہ سکتا کہ ان کا ارادہ متزلزل اور عزم ناپائدار ہو - اور آپ کے بارے میں جو کچھ ان کو منظور ہو ، مگر آپ کے سوا ، میں تو گھر بھر میں کسی کو نہیں

---

۱۰ - ہر شخص اپنی مصلحت کو خوب سمجھتا ہے -

دیکھتا کہ وہ گھر میں رہے اور اپنا پرانا ڈھرّا نہ چھوڑے ۔''

بڑا بھائی : ''ذرا اماں جان سے اور مجھ سے دو دو باتیں ہو جائیں تو تم کو ارادے کا استحکام اور عزم کا استقلال خود بہ خود معلوم ہو جائے گا ۔''

چھوٹا بھائی : ''اماں جان تو آج بڑی خفا بیٹھی ہیں ۔''

بڑا بھائی : ''کیوں ؟''

چھوٹا بھائی : ''آپ کو نہیں معلوم ؟ آپا جان سے اور ان سے آج بڑی لڑائی ہوئی ۔''

بڑا بھائی : ''کس بات پر ؟''

چھوٹا بھائی : ''آپا جان ، لڑکا حمیدہ کو دے کر ہاتھ منہ دھونے چلی گئیں ۔ حمیدہ ، لڑکے کو بٹھا نماز پڑھنے لگی ۔ آپا جان نے نماز پڑھتی کو دھکیل دیا ۔ اس کی ناک میں تخت کی کیل لگ گئی ۔ ڈھیر سا خون نکلا ۔ اسی پر تکرار ہونے لگی ۔ آپا جان نے کئی مرتبہ ، توبہ توبہ ، نماز کو برا کہا ۔ اماں جان نے بار بار منع کیا ، نہ مانا ۔ آخر اماں جان نے تھپڑ کھینچ مارا ۔''

بڑا بھائی : ''سچ کہو ۔''

چھوٹا بھائی : ''آپ چل کر دیکھ لیجیے ۔ آپا جان کوٹھری میں پڑی رو رہی ہیں ۔ صبح سے کھانا نہیں کھایا ۔''

منجھلا بھائی : ''واقعی کچھ لڑائی ضرور ہوئی ہے ۔ میں جو ابا جان کے پاس گیا تو آتے جاتے سب کو چپ دیکھا

اور سمجھا کہ بے سبب نہیں ہے۔''

بڑا بھائی : ''کہیں گھر بھر نے متوالی کودوں[11] تو نہیں کھا لی ؟ ابھی سے جہاد بھی شروع ہو گیا۔ حمیدہ کا نماز پڑھنا دیکھو اور ذرا سی بات پر بے چاری نعیمہ کے مار کھانے پر خیال کرو۔''

منجھلا بھائی : '' میرے نزدیک تو ان میں سے کوئی بات بھی تعجب کی نہیں۔ حمیدہ نے نماز پڑھی تو کیا کمال کیا۔ باتیں تو بڑی بوڑھیوں کی سی کرتی ہے۔''

بڑا بھائی : ''تو کیا ضرور ہے کہ باتیں بڑی بوڑھیوں کی سی کرے تو نماز بھی بوڑھیوں کی سی پڑھے۔ اس کی عمر گڑیاں کھیلنے اور ہنڈکلھیاں پکانے کی ہے ، نہ زہد و مراقبے کی۔''

منجھلا بھائی : ''کیا یہ ایسی مشکل بات ہے کہ حمیدہ اس کو نہیں سمجھ سکتی۔''

بڑا بھائی : ''مار مار کر سمجھایا جائے تو شاید ''صدرہ'' اور ''شمس بازغہ''[12] کو بھی کہہ دے گی کہ ہاں میں سمجھ گئی۔''

۱۱ - کودوں ایک سستے قسم کا اناج ہے جسے چاول کی طرح ابال کر کھاتے ہیں۔ بعض اوقات موسمی اثرات اور آب و ہوا کی خرابی سے کودوں کے دانوں میں ایسا زہریلا مادہ پیدا ہو جاتا ہے کہ اس کے کھانے سے آدمی بے ہوش ہو جاتا ہے۔ اسی لیے اس خاص قسم کے کودوں کو متونی یا متوالی کودوں کہتے ہیں۔

۱۲ - فلسفہ و حکمت کی مشہور درسی کتابیں۔

منجھلا بھائی : ”لیکن اس کو تو مار نہیں پٹی ۔“

بڑا بھائی : ”ایک کو پٹی تو گویا سب ہی کو پٹی ۔ جب نعیمہ ہی کو اماں جان نے تھپڑ کھینچ مارا تو اب کس کی عزت رہ گئی ۔ بڑی بیٹی ، بیاہی ہوئی ، صاحبِ اولاد کو مارنا ، یہ شرافت دین دارانہ ہے ۔

نے کعبے نے دیر کے قابل
مذہب ان کا سیر کے قابل

سلام ہے ایسے دین کو کہ انسان اپنے آپے سے باہر ہو جائے اور دنیا کے نیک و بد پر کچھ نظر نہ کرے ۔ آخر یہ خبر ممکن نہیں کہ اس کی سسرال نہ پہنچے ۔ سمدھیانے والے کیا کہیں گے ۔ غیرت ہو تو گھر بھر چلّو پانی میں ڈوب مریں ، حیا ہو تو کنبے میں منہ نہ دکھائیں ۔ اسی پر تم مجھ کو ابا جان کے پاس جانے کی رائے دیتے ہو ۔ اگر کہیں مجھ پر بھی ایسا ہی دستِ شفقت پھیر دیا تو پھر ؛ ع

ایں منم کاندر میانِ خاک و خون بینی سرے[۱۳]

---

۱۳ ۔ شیخ سعدی نے گلستان کے باب اول میں ایک بدشکل لیکن بہادر شہزادے کی حکایت بیان کی ہے ۔ اسی حکایت میں شہزادے کی زبانی ، اس کے کردار کی ترجمانی ایک قطعہ کی صورت میں کی گئی ہے ، جس کا پہلا شعر یہ ہے :

آں نہ من باشم کہ روزِ جنگ بینی پشتِ من
ایں منم کاندر میانِ خاک و خون بینی سرے

ترجمہ : میں وہ نہیں ہوں کہ میدان جنگ میں پیٹھ دکھا جاؤں ۔ میں ایسا ہوں کہ میرا سر خاک و خون میں لتھڑا ہوا پاؤ گے ۔ (کلیم کا مطلب یہ ہے کہ اگر مجھ پر ہاتھ اٹھایا تو میں ڈٹ کر مقابلہ کروں گا بلکہ جان پر کھیل جاؤں گا) ۔

اور مجھ کو نعیمہ کے جاں بر ہونے کی بھی امید نہیں۔ ع

سن لیجیو کہ آج اگر ہے تو کل نہیں "

منجھلا بھائی : "اس بات کا مجھ کو بھی تعجب ہے۔ لیکن جب تک اماں جان کے منہ سے تمام کیفیت نہ سن لوں، میں نہیں کہہ سکتا کہ انھوں نے بے جا کیا یا بجا کیا۔"

بڑا بھائی : "تمھارے ساتھ یہ معاملہ ہوا ہوتا اور پھر تم بے جا اور بجا میں تردد رکھتے تو میں تم کو خلفِ ارشد اور فرزندِ سعادت مند جانتا۔

جس پہ بیتی ہو یہ وہی جانے
جو کہ بے درد ہو وہ کیا جانے"

منجھلا بھائی : "شاید وقت پر طبیعت کا حال دگرگوں ہو جائے تو خبر نہیں، ورنہ میں تو ماں باپ کی تادیب کو سوجب بے حرمتی نہیں سمجھتا۔"

بڑا بھائی : "شاید ایسی ہی باتوں نے اُن کو دلیر کر دیا ہے۔"

منجھلا بھائی : "جس کو خدا ماں باپ بناتا ہے تو اس کو اتنی بات کے سمجھنے کی عقل بھی دیتا ہے کہ اولاد پر اس کو کیسے کیسے اختیار حاصل ہیں۔"

بڑا بھائی : "غرض تمھارے نزدیک ماں باپ کو اختیار ہے کہ اولاد گو بڑی بھی ہو جائے مگر ان کو بے تمیز بچوں کی طرح ماریں پیٹیں تو کچھ الزام نہیں۔"

منجھلا بھائی : "مجھ سے فتویٰ طلب نہیں ہے کہ ایک

عام رائے دوں ۔ البتہ اپنے گھر کے اس خاص معاملے میں اتنا کہہ سکتا ہوں کہ اماں جان نے جب بہت ہی ضرورت سمجھی ہوگی تو آپا جان پر ہاتھ اٹھایا ہوگا ۔ اور فرض کیا کہ اماں جان ہی کی زیادتی سہی ، تو کیا ایک طمانچے کے مارنے سے ان کی عمر بھر کی شفقتیں اکارت اور سال ہا سال کی نیکی برباد؟

آن را کہ بجائے تست ہر دم کرمے
عذرش بنہ ار کند بہ عمرے ستمے[۱۴]

اب بھی آپا جان کی محبت جو اماں جان کو ہوگی ، مجھ کو اور آپ کو اس کا ایک شمّہ تو ہو لے ۔

بڑا بھائی : "غرض جو کچھ ہو :

میرے وحشت خانے میں جوشِ جنوں کی دھوم ہے
عافیت مفقود اور آسودگی معدوم ہے"

بھائی بھائی یہی باتیں کر رہے تھے کہ اتنے میں رسولن نامی لونڈی دوڑی آئی اور علیم سے کہا کہ میاں پوچھتے ہیں ، میری بات کا جواب تم نے ہست نیست[۱۵] کچھ نہیں دیا ۔

رسولن کو تو علیم نے یہ کہہ کر رخصت کیا کہ تو چل کر کہہ ابھی آتے ہیں اور بڑے بھائی سے کہا

---

۱۴ ۔ جو شخص ہر وقت تجھ پر مہربانی کرے ، اگر اس سے عمر بھر میں کوئی ظلم ہو جائے تو اسے معاف کر دے ۔

۱۵ ۔ ہاں،نہیں ۔ اقرار یا انکار ۔ یہ اردو کا محاورہ ہے ۔ فارسی میں نہیں آتا ۔

کہ ابا جان آپ کے منتظر بیٹھے ہیں، جائیے کھڑے کھڑے ہو آئیے۔

بڑا بھائی: "اگر مجھ کو یہ یقین ہوتا کہ میرا جانا اور چلا آنا ایک سرسری بات ہے تو میں اب تک جا کر کبھی کا چلا آیا ہوتا۔"

منجھلا بھائی: "آپ نے یہ کیوں کر تجویز کر لیا کہ سرسری نہیں ہے۔"

بڑا بھائی: "خدا کو دیکھا نہیں تو عقل سے پہچانا۔"

منجھلا بھائی: "بس شاید ابا جان کو اتنی ہی بات آپ کے منہ سے سننی منظور ہے۔"

بڑا بھائی: ع

"ہر سخن موقع و ہر نکتہ مکانے دارد[۱۶]"

منجھلا بھائی: "مجھ کو حیرت ہے کہ آپ کو تردد کس بات کا ہے۔"

بڑا بھائی: "میں ان کے مزاج سے خائف اور اپنی عادت سے مجبور ہوں۔"

منجھلا بھائی: "لیکن جانے میں جس بات کا احتمال ہے تو نہ جانے میں اس کا تیقن ہے۔"

بڑا بھائی: "احتمال تم کو ہے، نہ مجھ کو۔ میں

۱۶ – ہر بات اور ہر نکتے کا ایک خاص موقعہ و محل ہوتا ہے۔

سمجھے بیٹھا ہوں کہ بالا خانے پر چڑھا اور آفت نازل ہوئی۔"

منجھلا بھائی : "میں زیادہ اصرار کرنا بھی مناسب نہیں سمجھتا۔ آپ کو اختیار ہے جو چاہے سو کیجیے۔ لیکن اتنا پھر کہے دیتا ہوں کہ اس کا انجام بہ خیر نہیں معلوم ہوتا۔"

بڑا بھائی : ع۔

"ہر چہ بادا باد ما کشتی در آب انداختیم[۱۷]"

منجھلا بھائی : "تو پھر میں ابا جان سے کہلائے بھیجتا ہوں۔"

بڑا بھائی : "یہ تم کو اختیار ہے۔ میں جب ان کے بلانے سے جانا لابد نہیں سمجھتا تو ان کے پوچھنے سے جواب دینے کو کب ضروری جانتا ہوں۔"

منجھلا بھائی مایوس ہو کر اٹھا اور تھوڑی دور جا کر پھر لوٹ آیا اور کہنے لگا کہ میرا پاؤں آگے نہیں پڑتا اور کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کہوں تو کیا کہوں۔ یہ میں خواب جانتا ہوں کہ آپ کا نہ جانا بڑی ہی خرابی برپا کرے گا۔ نہیں معلوم اس وقت آپ کو کیا ہو گیا ہے۔ آپ جاتے اور ان کی بات نہ مانتے تاہم چنداں قباحت نہ تھی۔ لیکن نہ جانے میں بگاڑ کی ابتدا، فساد کا آغاز، نافرمانی کا شروع آپ کی طرف سے ہوتا ہے۔ تمام دنیا آپ کو اس کا الزام دے گی اور سارا جہان آپ پر قصور عائد کرے گا۔ اور چوں کہ میں اس کا نتیجہ سر تا سر آپ کے حق میں زبوں سمجھتا ہوں، میں نہیں چاہتا کہ میری اس میں شرکت ہو۔

---

۱۷ - جو ہو سو ہو اب تو ہم کشتی پانی میں ڈال چکے۔

آپ کو جانا منظور نہیں تو بہتر ہوگا کہ آپ کسی دوسرے کے ہاتھ کہلا بھیجیے ۔

بڑا بھائی : ''لیکن مجھ سے انہوں نے پوچھا نہیں تو میں کیوں کہلا بھیجوں ۔''

سنجھلا بھائی ایسا روکھا جواب سن کر پھر چلا ۔ بے چارہ عجب ضغطے میں تھا کہ . . . ادھر باپ نے بہ تاکید پوچھ بھیجا ہے تو جواب میں کچھ ہاں یا نہیں کہنا چاہیے اور چوں کہ سمجھ چکا تھا کہ نہ جانا بھائی کی ہمیشہ ہمیشہ تباہی کا موجب ہوگا ، اندر سے جی نہیں مانتا تھا کہ اس کی بربادی کی بات منہ سے نکالے ۔ اسی گبھراہٹ میں دوڑا ہوا ماں کے پاس گیا اور کہا کہ اماں جان غضب ہوا چاہتا ہے ۔ ماں بے چاری نعیمہ کی سوچ میں بیٹھی ہوئی تھی ، کیوں کہ کوٹھری میں فرش پر ایک حالت سے پڑے پڑے نعیمہ کو سارا دن گزرا ۔ نہ تو اس نے سر اٹھایا ، نہ کوئی چیز اس کے منہ میں گئی ۔ ماں نے گلوریاں خاص دان میں بھروا کر پاس رکھوا دی تھیں ، وہ بھی سب اسی طرح رکھی رکھی سوکھا کیں ، پانی اور کھانے کا کیا مذکور ۔ لڑکا گھڑی دو گھڑی تو چپکا رہا پھر اس نے الگ رونا شروع کیا ۔ سارا گھر اس کو سنبھالتا تھا مگر اس نے تالو سے زبان نہ لگائی ۔ بہتیرا نانی بہلا پھسلا کر دودھ دیتی مگر گود سے نکل نکل پڑتا تھا ۔ نہ اٹھے سکھ، نہ بیٹھے چین ۔ سب کو حیران کر مارا ۔ دن تو خیر بری بھلی طرح گزر بھی گیا ۔ اب، ع : رات آئی تو یہ جانا کہ قیامت آئی ۔ صالحہ کو جو بلوایا تھا تو ایک یوں ہی سا پیام کہلا بھیجا تھا ۔ وہاں

سے جواب آیا کہ آج شام کو گھر میں مولوی صاحب کا وعظ ہے ۔ ان شاء اللہ کل بڑے تڑکے صبح نماز پڑھ کر میں پہنچوں گی ۔ اسی اضطراب میں میاں علیم نے جو ایک دم سے جا کر کہا کہ غضب ہوا چاہتا ہے ، ماں کا کلیجہ دھک سے ہو گیا اور سمجھی کہ نعیمہ کی خیر نہیں ۔ گبھرا کر پوچھا : ''کیا؟''

بیٹا : ''بھائی جان کو ابا جان چار گھڑی دن رہے سے بلا رہے ہیں ۔ یہ وقت ہونے آیا ، نہیں جاتے ہیں ۔ مردانے میں پردہ کرا دوں ، آپ ذرا چل کر سمجھا دیجیے ۔ شاید مان جائیں ۔ میں تو کہہ کر تھک گیا ۔''

فہمیدہ کا یہ حال تھا کہ نعیمہ سے بد تر اس کی کیفیت تھی ۔ لوگوں کے دکھانے کو دسترخوان پر بیٹھ تو گئی تھی ، مگر ایک دانہ حلق سے نہیں اترا ۔ جیسی بیٹھی تھی ویسی ہی منہ جھٹلا کر اٹھ کھڑی ہوئی ۔ بار بار کسی نہ کسی بہانے سے کوٹھری کے پاس جاتی ۔ کواڑوں کے پاس کھڑی ہو ہو کر درزوں میں جھانکتی اور نعیمہ کے رونے کی آہٹ لیتی ۔ گھر والوں میں سے جو سامنے آ نکلتا اس کو بھیجتی کہ جاؤ ہو سکے تو مناؤ ، لیکن کسی کو اتنا جیہا نہ تھا کہ کوٹھری کے اندر قدم رکھتا ۔ بیدارا جس نے نعیمہ کو پالا تھا اور ہر طرح کا دعویٰ رکھتی تھی ، لڑکے کو لے کر دودھ پلوانے کے بہانے سے پاس جا کر بیٹھی ۔ ابھی منہ سے بات بھی نہیں کہنے پائی تھی کہ نعیمہ نے اپنی دولتی چلائی کہ بیدارا کئی لڑھکنیاں کھا کر گیند کی طرح لڑھکتی لڑھکاتی باہر آ کر گری ۔ خدا نے خیر کی کہ لڑکا نہالچے

سمیت گود سے نکل پڑا ورنہ اتنی دور میں نہیں معلوم کیا سے کیا ہو جاتا ۔ بیدارا کی مدارات دیکھ کر پھر تو جس سے فہمیدہ کوٹھڑی میں جانے کا نام لیتی ، وہ کانوں پر ہاتھ دھرتی کہ نہ بیوی ، میری ہڈیوں میں تو خدا کی لاٹھی سہارنے کا بوتا نہیں ہے ۔ چاہتے سب تھے کہ نعیمہ کو منائیں مگر کوٹھری میں جانے سے ایسے ڈرتے تھے کہ گویا اندر کالی ناگن بیٹھی ہے ۔ پاؤں رکھا اور اس نے ڈس لیا ۔

باہر اس ذرا سے فتنے یعنی نعیمہ کے بچے نے آفت توڑ رکھی تھی ۔ اگال دان ، پان دان ، سینیاں بجاتے ، کنڈیاں کھڑکاتے ، مگر اس عزیز کے کان پر جوں نہ چلتی تھی ۔ گود میں لٹاؤ ، جھولے میں سلاؤ ، کندھے لگاؤ ، لیے لیے پھرو مگر کسی طرح اس کو قرار نہ تھا ۔ بے زبان بچہ منہ سے بولتا نہیں ، چالتا نہیں ، برابر روئے جاتا ہے ؛ کوئی کیا جانے کہ اس کو کس بات کی تکلیف ہے ۔ پہلے تو خیال ہوا کہ کہیں افیم[۱۸] تو نہیں تھوک دی ۔ مسور برابر چھوڑ خاصی مٹر جتنی گولی دی ، مطلق اثر نہیں ۔ جانا کہ ہنسلی[۱۹] جاتی رہی ، وہ بھی ملوائی اور دونا چلایا ۔ سمجھے کہ پیٹ میں درد ہے ۔ دودھ میں سہاگہ گھس کر دیا ، پھر بھی نہ چپ ہوا ۔ آخر جب خوب ہلاک

۱۸ - بعض عورتیں بچوں کو سلانے کے لیے بہت تھوڑی مقدار میں (رائی برابر) افیم کھلا دیتی ہیں ۔ 'مسور برابر' یا 'مٹر جتنی گولی' محض مبالغہ ہے ۔

۱۹ - کبھی کبھی کسی بے احتیاطی سے ننھے بچوں کی ہنسلی (Collar bone) اپنی جگہ سے کھسک جاتی ہے جسے ہنسلی ٹلنا یا ہنسلی اترنا کہتے ہیں ۔ ہنسلی ٹل جائے تو مالش کرنے سے ٹھیک ہو جاتی ہے ۔

ہو لیا تو ہار کر، کوئی دو گھڑی دن رہے، نانی کے کندھے لگ کر سو گیا۔ یہ بے چاری بھی دن بھر کی تھکی ماندی، نہار منہ، اس پر دل اداس، طبیعت مغموم، بت کی طرح ایک دیوار سے لگی بیٹھی اونگھ رہی تھی کہ پہلے صالحہ کا جواب آیا۔ اوپر سے میاں علیم، بھائی کا مژدہ لے کر پہنچے۔ سن کر رہی سہی عقل بھی کھوئی گئی۔ تھوڑی دیر تک تو چپ سناٹے میں بیٹھی رہی، اس کے بعد اپنے آپے میں آئی اور علیم سے کہا، "پھر بیٹا تم نے بڑے بھائی کو کچھ نہ سمجھایا"۔

بیٹا: "میں نے کتنا کتنا سمجھایا۔"

میاں: "نعیمہ کا حال تم نے کچھ سنا؟"

بیٹا: "جی ہاں سنا۔"

میاں: "بس خدا نے دونوں کو ایک سانچے میں ڈھالا ہے۔ مجھ کو تو امید نہیں کہ کلیم رو براہ ہو۔ جب اس کو خدا ہی کا خوف اور باپ ہی کا ڈر نہ ہوا تو بھلا میں کون بلا ہوں۔ یوں تم کہتے ہو، چلو میں کہہ سن بہتیرا کچھ دوں گی۔ کیوں علیم، بھلا تمہارے نزدیک میری زیادتی تھی یا نعیمہ کی؟"

بیٹا: "میں نے مفصل حال تو سنا نہیں لیکن جس قدر سنا اس سے سر تا سر آپا کا قصور معلوم ہوتا ہے اور مجھ کو زیادہ تحقیقات کرنے کی ضرورت بھی نہیں۔ میں نے سنتے کے ساتھ ہی کہہ دیا تھا کہ اماں جان نے جب ایسی ہی سخت ضرورت سمجھی ہوگی تو آپا پر ہاتھ اٹھایا ہوگا۔"

ماں : ''علیم ، کیا تم سے کہوں ۔ خدا کی شان میں ایک ایک بے ادبی کہ معاذ اللہ! میں تو تھرا اُٹھی کہ ایسا نہ ہو کہیں چھت گر پڑے ۔ اور جان جان کر ، منع کرتے کرتے ۔''

بیٹا : ''بے شک آپ نے مارا تو بہت واجب کیا ۔ خیر آپا کا چنداں اندیشہ نہیں ۔ آپ ہی غصہ اُتر اترا جائے گا ۔ بڑے بھائی کا کھٹکا ہے ۔ یہاں کل تک وارا نیارا ہوتا ہوا معلوم ہوتا ہے ۔''

ماں : ''دونوں ایک دوسرے کے قدم بر قدم ہیں ۔ اس نعیمہ نے کیا وارا نیارا کرنے میں کچھ اُٹھا رکھا ہے ۔ سارا دن گزر گیا ، نہ پانی پیا ، نہ کھانا کھایا ، نہ بچے کو دودھ پلایا ۔''

بیٹا : ''بچے کو دودھ نہیں پلایا ؟ بھلا اس بے چارے کا کیا قصور ؟''

ماں : ''بیدارا ایک دفعہ لے کر گئی تھی ، بے چاری کے ایسی لات ماری کہ صحنچی میں ہلدی تھوپے پڑی کراہ رہی ہے ۔''

بیٹا : ''میں چلوں اور سمجھاؤں ؟''

ماں : نہ بیٹا ، اپنی عزت اپنے ہاتھ ۔ تم گئے اور چھوٹے تو ہو ہی ، کچھ جا بے جا کہہ بیٹھی تو ناحق تم کو برا لگے ، کیا فائدہ ۔''

بیٹا : ''جب وہ میری بڑی بہن ہیں تو مجھ کو اُن

کا کہنا برا کیوں لگنے لگا ۔''

ماں : ''تو بھی تمہارے جانے سے کچھ فائدہ نہیں ۔ میں نے صالحہ کو بلا بھیجا ہے، وہ آئے گی تو اس کو اپنے طور پر ٹھیک ٹھاک کرے گی ۔''

بیٹا : ''واقعی یہ آپ نے خوب تجویز کی ۔ مگر اب رات ہوگئی ، کب آئیں گی ؟''

ماں : ''ان کے یہاں اس وقت وعظ ہے ۔ اس نے کہلا بھیجا ہے کہ کل بڑے سویرے پہنچوں گی ۔ خیر ، جوں توں رات کٹ ہی جائے گی ۔''

بیٹا : میں صالحہ کو جا کر لے نہ آؤں ؟ اتنے میں آپ بھائی جان سے باتیں کیجیے ۔''

ماں : ''ہاں بہتر تو ہوگا ۔ میں نے اس کو یہ حال کہلا نہیں بھیجا ورنہ وہ تو سنتے کے ساتھ دوڑی آتی ۔''

غرض علیم تو صالحہ کو لینے گیا اور فہمیدہ پردہ کرا مردانے میں پہنچی ۔ اتنی ہی دیر میں یہاں تاش کھیلنے شروع ہوگئے تھے ۔ فہمیدہ جو گئی تو چاندنی پر تاش کے ورق بکھرے ہوئے پڑے تھے ۔ فہمیدہ نے دیکھ کر کہا کہ آگ لگے اس کھیل کو ۔ کھیل نہ ہوا بلائے جان ہوا کہ رات کو بھی بند نہیں ہوتا ۔

بیٹا : ''نکما بیٹھا ہوا آدمی کچھ کرے یا نہ کرے ۔
ع : بے کار مباش کچھ کیا کر ۔''

ماں : ''بیٹا ، خدا نہ کرے کہ تم نکمے ہو ۔ کرنے کر دیا جائے ۔

اماں : تم اپنی [illegible]

والا ہو تو کام بہتیرے ۔ باپ نے تم کو کئی دفعہ بلایا ، نکمے تو تھے ، تم سے اتنا نہ ہو سکا کہ جاؤں سن تو آؤں کیا کہتے ہیں ۔"

بیٹا : "بس میں نے یہیں سے بیٹھے بیٹھے سن لیا ۔"

ماں : "کچھ نہ سنا نہ سنایا ۔ جاؤ ہو آؤ ۔ یہ اچھی بات نہیں ۔"

بیٹا : "اچھی بات کیا نہیں ؟ میں جانتا ہوں جو وہ کہیں گے ۔"

ماں : "تم جانتے سہی ، مگر جا کر سن لینے میں بیٹا کچھ قباحت ہے ؟"

بیٹا : ع ۔ "قباحت سی قباحت ہے ، خرابی سی خرابی ہے؟"

ماں : "میں بھی سنوں ؟"

بیٹا : "اب مجھی سے کہلواتی ہو ۔ تم آپ سمجھ جاؤ ۔"

ماں : "میں تو تمہاری پہیلی نہیں سمجھتی ۔"

بیٹا : "ایسی پہیلیاں نعیمہ خوب بوجھتی ہے ۔"

ماں : خدا کسی کو ایسی الٹی سمجھ نہ دے جیسی نعیمہ کی ہے ۔ تم اس کی زبان سنتے ہو کہ خدا تک کا لحاظ اس نے اٹھا دیا ۔ نماز کو اٹھک بیٹھک ، خدا کی شان میں توبہ توبہ ، یہ کلمہ کہ کیسا خدا ۔ بے دین سے بے دین بھی ایسی بات منہ سے نہیں نکالتا ۔ ابھی ایک آفت گھر پر آ چکی

ہے کہ ایک چھوڑ تین تین مردے اسی گھر سے اٹھے مگر خوف مطلق نہیں ، ذرا سا ڈر نہیں ۔"

بیٹا : "وبا بھی ایک مرگِ انبوہ تھا ۔ اچھے برے سب ہی قسم کے لوگ مرے ۔"

ماں : "تو کیا اچھوں کو مرتا دیکھ کر آدمی برا بن جائے ۔"

بیٹا : "نہیں ، میں تو یہ نہیں کہتا کہ برا ہونا اچھا ہے ۔"

ماں : "اس سے بڑھ کر اور کیا برائی ہوگی کہ آدمی خدا کو خدا نہ سمجھے ۔"

بیٹا : "اچھی کہی ۔ خدا کو خدا کون نہیں سمجھتا ۔ نعیمہ کے منہ سے نہیں، معلوم کیوں کر ، ایک بات نکل گئی ہو گی ۔"

ماں : "پھر تم کو باپ کے پاس جانے میں کیا تامل ہے ؟"

بیٹا : "میں نے سنا ہے کہ نماز پڑھنے کا قول کراتے ہیں ۔ کھیل کود کو منع کرتے ہیں ۔"

ماں : "ابھی تو تم نے کہا کہ میں خدا کو خدا سمجھتا ہوں ۔ تو کیا نماز اس کا حکم نہیں ہے ؟"

بیٹا : "میں یہ بھی نہیں کہتا کہ نماز اس کا حکم نہیں ہے لیکن مجھ سے ایسے حکم کی تعمیل نہیں ہو سکتی ۔"

ماں : ''تو تم نے یہ نا حق کہا کہ میں خدا کو خدا سمجھتا ہوں ۔ اگر تم خدا کو خدا سمجھتے تو ضرور اس کا حکم مانتے ۔ چلو بیٹا ، دنیا اور دین دونوں سے آزاد ہوئے ۔ ادھر باپ بلائے اور نہ جاؤ تو گویا باپ کو باپ نہ جانا ۔ ادھر خدا فرمائے اور نماز نہ پڑھو ، یعنی خدا کو خدا نہ سمجھا ۔''

بیٹا : ''مجھ کو حیرت ہے کہ گھر میں کیوں یہ نئے نئے دستور اور قاعدے جاری کیے جاتے ہیں ۔ وہی خدا ہے اور وہی ہم سب ہیں ، تو جس طرح پہلے سے رہتے سہتے چلے آئے ہیں ، اب بھی رہنے دیں ۔ دوسرے کے افعال سے کیا بحث اور کسی کے اعمال سے کیا سروکار ؟ اگر کوئی بے دین ہے تو اپنے لیے اور کوئی زاہد اور پرہیزگار ہے تو اپنے واسطے ۔''

ماں : ''سروکار کیوں نہیں ۔ اولاد کی تعلیم ماں باپ پر فرض ہے ۔''

بیٹا : ''پہلے سے فرض تھی یا اب علالت میں کوئی خاص وحی نازل ہوئی ہے ۔''

ماں : ''اگر تم ایسی حقارت سے ماں باپ کا ذکر کرتے ہو تو یہ تمھاری سعادت مندی کی دلیل ہے ! تم تو کتابیں پڑھتے ہو ، ماں باپ کا کیسا کچھ ادب لکھا ہے ۔ لوگوں میں بھی اس کی ایک کہاوت مشہور ہے : با ادب با نصیب ۔ بیٹے ! تمھارے باپ بے چارے نے ہرگز یہ دعویٰ نہیں کیا کہ مجھ کو الہام ہوتا ہے یا مجھ پر آسمان سے وحی اترتی ہے ۔''

بیٹا : ''اگر وحی نہیں ہے تو اسی علالت کا اثر ہے۔''

ماں : ''تم باپ تک گئے ہوتے تو کبھی ایسے احتمالات نہ کرتے۔ یہ تمھاری نئی تجویز نہیں ہے۔ تم تو ابتدائے علالت سے باپ کو جنون اور سرسام بتاتے ہو۔ لیکن کیا مجنون کا یہی کام ہے کہ عاقبت تک کی مآل اندیشی کرے؟ دیوانے ایسے ہی ہوتے ہیں کہ آخرت تک کا انجام سوچیں؟ ایک مرتبہ ذرا کی ذرا چل کر ان کی باتیں سنو اور پھر ان کو مجنون سمجھو تو البتہ میں قائل ہو جاؤں گی۔

بیٹا : ''کیا میں بھی سلیم ہوں کہ ان کی باتوں میں آ جاؤں گا؟''

ماں : ''ہماری نظروں میں تو تم سلیم سے بھی چھوٹے ہو۔''

بیٹا : ''بس یہ مہربانی نعیمہ کے ساتھ خاص رہے۔''

ماں : ''اگر مہربانی ہی مہربانی ہوتی تو شاید تم کو اس کے کہنے کی نوبت بھی نہ آتی، کیوں کہ مہربانی اسی کے ساتھ کی جاتی ہے جو اس کی قدر کرے اور مہربانی کرنے والے کا احسان مانے۔ مجبوری تو یہی ہے کہ نری مہربانی نہیں ہے بلکہ اپنی گردن کا بوجھ اور اپنے سر کا فرض اتارنا ہے۔''

بیٹا : ''یہ نیا مسئلہ ہے کہ بڈھے طوطوں کو مار مار کر پڑھایا جائے۔''

اماں : ''تم اپنے تئیں بڈھا سمجھتے ہو؟''

بیٹا : ''میں دودھ پیتا ہوا بے تمیز بچہ سہی ، لیکن میں نہیں چاہتا کہ کوئی میرے افعال سے تعرض کرے ۔ میں اپنا برا بھلا آپ سمجھ سکتا ہوں ۔''

ماں : ''ماں باپ اولاد کے بد خواہ نہیں ہوتے ۔ ہم لوگ بھی تمہاری ہی بہتری کے لیے کہتے ہیں ۔''

بیٹا : ''مجھ کو اپنی بہتری منظور نہیں ہے ۔''

ماں : ''میں جانتی ہوں کہ یہ بات تم اس وقت ضد سے کہہ رہے ہو ۔ بھلا دنیا میں کوئی بھی ایسا ہے جو اپنی بہتری نہیں چاہتا ۔''

بیٹا : ''جب میں تمہاری مداخلت اپنے افعال میں نہیں جائز رکھتا تو تم بیٹھے بٹھائے مجھ کو چھیڑنے والی کون ؟''

ماں : ''میں تمہاری ماں ، وہ تمہارے باپ ۔''

بیٹا : ''یہ بھی اچھی زبردستی ہے ۔ مان نہ مان میں تیرا مہمان ۔ مجھ کو تمہارے ماں باپ ہونے سے انکار نہیں ۔ گفتگو اس بات میں ہے کہ تم کو میرے افعال میں زبردستی دخل دینے کا اختیار ہے یا نہیں ، سو میں سمجھتا ہوں کہ نہیں ہے ۔ تم کہتی ہو کہ ہم بہ مجبوری دخل دیتے ہیں ، اس واسطے کہ ماں باپ پر اولاد کا تعلیم کرنا فرض ہے ۔ سو اول تو میں اس کو داخلِ تعلیم ہی نہیں سمجھتا اور مانا کہ داخلِ تعلیم ہو تو میرے نزدیک صرف دس بارہ برس کی عمر تک اولاد محتاجِ تعلیم ہے ۔ اس کے بعد ماں باپ کو ان کی رائے میں کچھ دخل نہیں ۔ وہ اپنا نفع و نقصان خود

سمجھ سکتے ھیں - اگر یہی منظور تھا کہ میں بڑا ھو کر مسجد کا مُلّانا یا قبرستان کا قرآن خواں یا لنگر خانۂ خیراتی کا ٹکڑ گدا بنوں ، تو شروع سے مجھ کو ایسی تعلیم کی ھوتی کہ اب تک بھلا کچھ نہیں تو میں دو چار حج بھی کر آیا ھوتا - پنج آیت میں میری قرآت کی دھوم ھوتی ، تراویح میں میرے لہجۂ قرآن خوانی کی شہرت - کہیں مردہ مرتا جائے نماز مجھ کو ملتی - کہیں قربانی ھوتی ، کھال میرے پاس آتی - صدقے کا میں آڑھتیا ھوتا ، زکوٰۃ کا ٹھیکے دار ، دعوتوں کا مستحق ، خیرات کا حق دار - نہ یہ کہ پڑھاؤ کچھ ، پوچھو کچھ - سکھاؤ اور چیز اور امتحان لو دوسری چیز میں - دنیا میں جیسے اور شریف معزز خاندانوں کے بیٹے ھیں ، اگر میں سب میں اچھا نہیں تو کسی سے برا بھی نہیں - مشاعرے میں میری غزل ساتھ کے مشق کرنے والوں میں سب سے بڑھی چڑھی ھوتی ھے - شطرنج میں ، مرزا شاہ رخ تو خیر پرانے کھیلنے والوں میں ھیں اور حق یہ ھے کہ اچھی شطرنج کھیلتے ھیں ، دوسرا کوئی مجھ کو مات کر دے تو البتہ میں اس کی ٹانگ تلے سے نکل جاؤں - ھمارے محلے میں میاں وزیر[۲۰] ، بادشاھی پیادوں کے جمعدار ، بڑے شاطروں میں مشہور ھیں - میں فرزیں اٹھا کر ان کے ساتھ کھیلتا ھوں - گنجفہ اگرچہ میں کم کھیلتا ھوں لیکن بیٹھ جاؤں تو ایسا بھی نہیں کہ کوئی صفو[۲۱] پر نادری چڑھائے -

۲۰ - شطرنج کی مناسبت سے وزیر اور پیادوں میں رعایت لفظی ملحوظ ھے - وزیر ، پیادہ ، فرزیں ، یہ شطرنج کی گوٹیں ھیں - فرزیں اٹھا کر کھیلنا ، شطرنج کے کھیل کی ایک چال ھے -

۲۱ - جب کھیلنے والے کے پاس پتے نہ ھوں اور اس پر نادری چڑھائی جائے - گنجفے کی بازی میں ھر یکے کو نادری کہتے ھیں -

اور قریب قریب یہی حال تاش اور چوسر کا ہے ۔ کبوتر جیسے آج ہماری چھتری[22] کے دم دار ہیں ، شہر میں شاید دو چار جگہ اور ہوں گے ۔ پتنگ میں ایسا اڑاتا ہوں کہ ایک دھیلچیے سے دو ٹھڈے کی تکل ایک نہیں تو سینکڑوں کاٹی ہوں گی ۔ لکھنے سے عاری میں نہیں ، پڑھنے سے عاجز میں نہیں ۔ میں نہیں جانتا کہ امیروں اور امیرزادوں کا وہ کون سا ہنر[23] ہے جو مجھ کو نہیں آتا ۔

قسمت سے تو ناچار ہوں اے ذوق وگرنہ
سب فن میں ہوں میں طاق مجھے کیا نہیں آتا

کل کی بات ہے کہ میری مدح ہوتی تھی اور مجھ کو ہر بات پر شاباش ملتی تھی ۔ اب دفعۃً میں ایسا بے ہنر ہوگیا کہ مجھ کو سیکھنے اور تعلیم پانے کی ضرورت ہے ۔ ع : ہائے ہم کیا کہیں کیا ہوگئے کیا کیا ہو کر ۔ میرا کون سا فعل ہے جو تم کو اور ابا جان کو معلوم نہیں؟ کیا ابا جان نے میری غزلیں نہیں سنیں؟ میں ان کے ہاتھ کے صاد کیے ہوئے شعر دکھا سکتا ہوں ۔ ابھی پورا ایک مہینا بھی نہیں گزرا کہ شطرنج کا ایک بڑا مشکل نقشہ ابا جان نے کسی اخبار میں دیکھا تھا ، اس کو میں نے حل کیا ۔ کبوتر اڑاتے تم نے نہیں دیکھے ، یا پتنگوں کی لڑائی انھوں نے نہیں سنی ؟ کبھی تم نے روکا یا انھوں

۲۲ - چھتری : کبوتروں کے بیٹھنے کا اڈا ۔ دم دار : دم خم والے ، جان دار ۔ دھیلچیے : دھیلے کی کنکیا اسے دھیلچی یا دھیلچا بھی کہتے ہیں ۔ تکل : بڑی اور بھاری پتنگ ۔ دو ٹھڈے کی : دو کمانیوں والی ۔

۲۳ - کلیم سچ کہتا ہے ۔ اس زمانے میں امیروں اور امیر زادوں کے فن اور ہنر یہی تھے جو اس نے گنائے ہیں ۔

نے ٹوکا ؟ اب یہ نئی بات البتہ سننے میں آئی ہے کہ نماز پڑھو ۔ مسجد میں معتکف بن کر بیٹھو ۔ کھیلو مت ۔ کسی یار آشنا سے ملو مت ۔ بازار مت جاؤ ۔ میلے تماشے میں مت شریک ہو ۔ بھلا کوئی مجھ سے یہ باتیں ہونے والی ہیں ۔

جو دل قمار خانے میں بت سے لگا چکے
وہ کعبتین چھوڑ کے کعبے کو جا چکے''۲۳

ماں : ''میں سچ کہتی ہوں کہ جتنی باتیں تم نے کہیں ، تمہارے باپ ، جن کو تم مجنون اور مختل الحواس تجویز کرتے ہو ، سب پہلے سے سمجھے ہوئے بیٹھے ہیں اور ان کو معلوم ہے کہ تم سے ان عادتوں کا ترک ہونا دشوار ہے اور ابتدا میں تم کو تعلیم نہ کرنے کا تذکرہ کر کے اس حسرت کے ساتھ روتے ہیں کہ دیکھنے والا تاب نہیں لا سکتا ۔ غضب تو یہی ہے کہ تم ان تک چلتے نہیں ، ورنہ تم کو معلوم ہو جاتا کہ باپ کے دل کی کیا کیفیت ہے ۔ وہ خود قائل ہیں کہ اولاد کا کچھ قصور نہیں ۔ ان کے بگاڑ کا وبال ، ان کی خرابی کا الزام سب میری گردن پر ہے ۔ اپنے تئیں کوستے ہیں اور کہتے ہیں کہ میں ان کا باپ تھا یا عدو تھا کہ میں نے جان بوجھ کر ان کا ستیا ناس کیا ، دیدہ و دانستہ ان کو غارت کیا ۔ اب کس منہ سے ان کو سمجھاؤں اور کیوں کر ان سے آنکھیں ملاؤں ۔ مگر پھر آپ ہی یہ بھی کہتے ہیں کہ اگر میں نے اپنے فرض کے

---

۲۳ ۔ کعب ، چوکور کو کہتے ہیں ۔ کعبہ کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ وہ چوکور ہے ۔ کعب کے دوسرے معنی ہیں پانسہ یا مُہرہ ۔ کعبتین یعنی پانسوں کی جوڑی ۔

ادا کرنے میں اب تک کوتاہی کی تو کیا تلافیٔ مافات سے غافل رہنا ترک فرض سے کچھ کم ہے۔ ناچار، اپنے مقدور بھر کوشش کروں گا، مجبور، حتی الوسع زحمت اٹھاؤں گا۔''

بیٹا: ''خیر، ایسا ہی فرض کا خیال ہے تو دوسرے بچوں کو اپنی رائے کے مطابق تعلیم کریں، مجھ کو میرے حال پر چھوڑ دیں۔''

ماں: ''کیا خدا نہ خواستہ تم اولاد میں نہیں ہو؟''

بیٹا: ''ہوں لیکن مجھ سے بھی آخر کہہ نہ چکے۔ بس ان کے ذمے سے فرض ساقط ہو گیا۔''

ماں: ''یہی حجت دوسرے بھی پیش کر سکتے ہیں۔''

بیٹا: ''جھک مارنے کی بات ہے۔ چھوٹوں کو ماننا چاہیے۔''

ماں: ''کیا چھوٹے سدا چھوٹے ہی رہیں گے۔''

بیٹا: ''بڑے ہوئے پیچھے بے شک ان کو بھی آزادی ہونی چاہیے۔''

ماں: ''گھر میں اگر کوئی انتظام کرنا منظور ہو تو جب تک چھوٹے بڑے سب اس کی تعمیل نہ کریں وہ انتظام چل نہیں سکتا۔''

بیٹا: ''چلے یا نہ چلے، بی! میں تم سے صاف کہوں، مجھ سے تو یہ نماز روزے کا کھٹراگ سنبھلنے والا نہیں۔ یہ سر حاضر ہے، نعیمہ کی طرح چاہو مجھ کو بھی دو چار

جوتیاں مار لو ۔''

ماں : ''الٰہی ! نماز کچھ ایسی مشکل ہے کہ جوتیاں کھانی قبول پر نماز پڑھنی منظور نہیں ۔''

بیٹا : مجھ کو تو ایسی ہی مشکل معلوم ہوتی ہے ۔''

ماں : ''خیر، تم میری اور باپ کی خاطر پڑھ لیا کرنا ۔''

بیٹا : ''مجھ سے ہو ہی نہیں سکتی ۔''

ماں : ''تو یوں کہو ، تم کو باپ کے کہنے کی ضد ہے ۔''

بیٹا : ''جو کچھ سمجھو ۔''

ماں : ''بھلا پھر اس کا انجام کیا ہوگا ؟''

بیٹا : ہوگا کیا ۔ بہت کریں گے خفا ہوں گے ۔ دو چار دن میں سامنے نہ جاؤں گا ۔ آخر تم کہہ سن کر بات کو رفت و گزشت کرا ہی دو گی ۔ کیوں بی اماں کرادوگی نا ؟''

ماں : ''اگر یہی انجام ہوتا تو میں تم سے اتنا اصرار ہرگز نہ کرتی ۔''

بیٹا : ''پھر کیا مجھے پھانسی دلوا دیں گے ، مار ڈالیں گے ، کیا کریں گے ؟''

ماں : ''بھلا بیٹا کوئی کسی کو مار سکتا ہے ؟ ایک ذرا ہاتھ لگانے پر تو نعیمہ نے یہ آفت توڑ رکھی ہے کہ اللہ پناہ دے ۔ جان سے مارنا تو خدا کا گناہ اور حاکم کا جرم ۔''

بیٹا : ''شاید یہ کریں کہ گھر سے نکال دیں ۔''

ماں : ''شاید ۔ تم تو بیٹے ہو ، اُن کو اس بلا کا اہتمام ہے کہ اگر میں بھی ان کی رائے کے خلاف کروں تو تیس برس کا گھر خاک میں ملانے کو تیار ہیں ۔''

بیٹا : ''شاید اسی ڈر کے مارے تم سب کے سب انھی کی سی کہنے لگے ۔''

ماں : ''اس وقت تک تو کسی کے ساتھ کسی طرح کی سختی کرنے کی نوبت نہیں آئی ۔ باتیں ہی وہ اس غضب کی کرتے ہیں کہ گنجائش انکار باقی نہیں رہتی ۔ لیکن ہاں جو تمھاری طرح کوئی کٹھ حجتی کرتا تو ضرور بگڑتے ۔''

بیٹا : ''میں اُن کی خفگی سے تو خیر کسی قدر ڈرتا بھی تھا لیکن گھر سے نکلنے کی بندۂ درگاہ ذرا بھی پروا نہیں کرتے اور گھر کی طمع سے جو نماز پڑھتے ہیں اُن کو ہی کچھ کہتا ہوں ۔ اپنے کھانے کپڑے پر گھمنڈ کرتے ہوں گے ۔ میں اُن جیسے دس کو کھانا کپڑا دے سکتا ہوں ۔''

ماں : ''باپ بے چارے نے تو یہ بات بھی منہ سے نہیں نکالی ۔ تم اپنے دل سے جو چاہو سو کہو ۔''

بیٹا : ''نہیں ان کے اصرار سے معلوم ہوتا ہے کہ کھانے کپڑے کا ڈراوا دکھا کر وہ چاہتے ہیں کہ دین کا ٹوکرا زبردستی ہم لوگوں کے سر پر لادیں ، سو یہ دل سے دور رکھیں ۔ میں خود گھر سے دل برداشتہ ہو رہا ہوں ۔ نہیں معلوم کیا سبب تھا کہ میں اب تک رہ گیا ۔ اگر پہلے سے

ذرا بھی مجھ کو معلوم ہوا ہوتا تو خدا کی قسم ، کب کا گھر سے ایسا گیا ہوتا جیسے گدھے کے سر سے سینگ ۔ اور اب دیکھ لینا ، دیوانہ را ہوئے بس است[۲۵] ہے۔"

ماں : "بیٹا ، تم کیسی باتیں کرتے ہو ۔ باپ تک تم گئے نہیں ۔ نہ اپنی کہی نہ اُن کی سنی ۔ آپ ہی آپ تم نے ایک بات فرض کر لی اور اس پر غصہ کرنے لگے ۔"

بیٹا : "درست ۔ چھیڑ چھاڑ میری طرف سے شروع ہوئی یا اُن کی طرف سے ؟"

ماں : "اپنی بہتری کی بات کو تم نے چھیڑ چھاڑ سمجھا۔ اور مانا کہ انھی کی طرف سے چھیڑ چھاڑ شروع ہوئی سہی ، تو تم کو گھر سے ناراض ہونے کا کیا سبب ؟ گھر میں تو میں بھی ہوں ، اللہ رکھے تمھارے بھائی ہیں ، بہنیں ہیں ، ہم سب نے تمھارا کیا قصور کیا ؟"

بیٹا : "تم سب تو انھی سے ملے ہوئے ہو ۔ اچھا ، اگر تم کو میرا پاس ہے تو میرا ساتھ دو ۔"

ماں : "اگر تمھارے باپ کی زیادتی ہوتی تو بے شک میں تمھاری طرف داری کرتی ۔ انسان وہ کام کرے کہ دس بھلے آدمیوں میں بات آ پڑے تو لوگ اس کو الزام نہ دیں ۔ فرض کیا کہ تم اتنی ہی بات پر گھر سے خفا ہو کر چلے گئے تو لوگ تم ہی کو قصور وار ٹھہرائیں گے ۔"

بیٹا : "لوگ میرے قاضی نہیں ، مفتی نہیں ۔ میں کسی

۲۵۔ دیوانے کو ایک "ہو" بہت ہے ۔

کی رعیت نہیں ۔ جب میں اپنے سگے باپ کے کہنے کی پروا نہیں کرتا تو لوگ پڑے بھونکا کریں ۔''

ماں : ''بیٹا ، دنیا میں رہ کر تو ایسی آزادی نہیں سکتی ۔''

بیٹا : ''اجی ایسی نبھے کہ جیسے کہتے ہیں :

کیسا اس کو نباہتا ہوں
ان شاء اللہ دیکھئے گا !''

ماں : ''کیا تم گھر سے چلے جاؤ گے ؟''

بیٹا : ''تو کوئی مجھ کو روک بھی سکتا ہے ؟

مانع دشت نوردی کوئی تدبیر نہیں
ایک چکّر ہے مرے پاؤں میں زنجیر نہیں''

ماں : ''کیوں ، روکنے والی میں بیٹھی ہوں ۔ کیا میرا تم پر اتنا بھی حق نہیں ہے ؟''

یہ کہہ کر فہمیدہ کا دل بھر آیا اور اس پر رقت طاری ہو گئی ــــــ ''میں نے تم کو نو مہینے اسی دن کے واسطے پیٹ میں رکھا تھا اور اسی لیے تمھارے پالنے کی مصیبتیں اٹھائی تھیں کہ جب بہار دیکھنے کے دن آئیں تو تم مجھ سے الگ ہو جاؤ ۔ کلیم ! سچ کہتی ہوں ، ذرا جا دیکھ ، قیامت تک تو دودھ بخشنے ہی کی نہیں ۔''

بیٹا : ع ''ایں ہم اندر عاشقی بالائے غم ہائے دگر[۲۶]''

۲۶ ۔ عاشقی میں جہاں اور غم ہیں ایک یہ بھی سہی ۔

ماں : ''بھلا ایسے جانے میں کیا فلاح و برکت ہوگی کہ باپ کو ناراضمند کر کے جاؤ اور ماں کو ناخوش ، اور بے وجہ ، بے سبب ۔''

بیٹا : ''خیر ، اب تو یہی دل پر ٹھنی ہے : ع

سر جائے پہ دردِ سر نہ جائے

اور کچھ خاص کر یہی سبب نہیں ۔ مدتوں سے گھر میں بیٹھے بیٹھے میرا دل اکتا گیا تھا اور ہمیشہ خیال آیا کرتا تھا کہ چلو ذرا باہر کی بھی ہوا کھاؤں ؛ ع

چل درِ بے کدہ تک ہے حرکت میں برکت''

ماں : ''گھر سے ناراض ہوکر جاؤگے تو اچھا باپ دادے کا نام تمام شہر میں اچھلے گا ۔''

بیٹا : ''جب باپ نے میرا پاس آبرو نہ کیا تو خاندان کی عزت رہے تو بلا سے اور جائے تو بلا سے ۔''

ماں : ''باپ دادوں کی عزت تو رہے یا جائے ، تم نے گھر سے باہر قدم رکھا اور تمھاری بات دو کوڑی کی ہوئی ۔ یہی تمھارے دوست آشنا جو رات دن تمھاری للو پتو میں لگے رہتے ہیں ، سلام تک کے روادار تو ہونے ہی کے نہیں ، ہم دردی اور غم گساری کا تو کیا مذکور ہے ۔''

بیٹا : ''گھر سے نکل کر کیا میں نے دھلی میں رہنے کی قسم کھائی ہے ۔ ملکِ خدا تنگ نیست ، پائے مرا لنگ نیست ۔ جدھر کو منہ اٹھ گیا ، چل کھڑے ہوئے ۔''

ماں : ''بھلا میں بھی تو سنوں کہ تم نے کون سا ٹھکانا سوچا ہے۔''

بیٹا :

جب مے کدہ چھٹا تو پھر اب کیا جگہ کی قید
مسجد ہو ، مدرسہ ہو ، کوئی خانقاہ ہو

ماں : ''بھلا پھر اس میں خوبی کیا نکلی کہ تم نے عیش چھوڑا ، آرام چھوڑا ، گھر چھوڑا ، عزیز و اقارب چھوڑے اور ان سب کے بدلے ملا تو کیا ملا : بد نامی کا خلعت ، رسوائی کا خطاب ، مفلسی اور محتاجی کا انعام ، تکلیف و مصیبت کا پروانہ ، تردد و پریشانی کا فرمان ۔ موٹی سی موٹی سمجھ اور چھوٹی سے چھوٹی عقل بھی اس کو جائز نہیں رکھتی ۔''

بیٹا : ''عقل چہ کتّی است کہ پیشِ مرداں بیاید[۲۷] ۔''

ماں : ''تم تو باپ کو باؤلا اور مجنون بتاتے تھے ، مگر باؤلوں کی سی باتیں ، دیوانوں کی سی حرکتیں تم خود کرتے ہو ۔ دیکھو کہے دیتی ہوں ، بہت پچھتاؤ گے ، بہت افسوس کرو گے ۔ میں یہ نہیں کہتی کہ تم میری بات مانو لیکن جس کو تم اپنے نزدیک معقول پسند اور دانش مند سمجھتے ہو اُس سے پوچھو ، صلاح لو ، مشورہ کرو ، دیکھو تو کیا کہتا ہے ۔''

بیٹا : ''ع : رائے اپنی صلاح ہے اپنی ۔''

---

۲۷ ۔ عقل کی کیا مجال ہے کہ جواں مردوں کے آڑے آئے ۔

ماں : ''بھلا اتنا تو تم سمجھو کہ میں جو تم سے اتنا اصرار کر رہی ہوں اور اتنی دیر سے تمھارے پیچھے سر کھپا رہی ہوں ، اس میں کچھ میرا نفع یا تمھارے باپ کا فائدہ ہے ؟ اگر تم نیک بنوگے تو کچھ ہم کو بخش دوگے ، یا گُمراہ چلوگے تو کچھ ہم سے چھین لوگے ؟ مگر خدا نے یہ اولاد کی ماںتا کم بخت ایسی ہمارے پیچھے لگا دی ہے کہ جی نہیں مانتا اور دل صبر نہیں کرتا کہ تم کو بگڑتے دیکھیں اور نہ روکیں ، تم خرابی کے لچھن اختیار کرو اور ہم منع نہ کریں ۔''

ماں اور بیٹے میں یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ بیدارا اندر سے ایک خط لیے ہوئے نکلی اور وہ خط اس نے لا کلیم کے ہاتھ میں دیا ۔ رات کا وقت اور بیدارا کا اندر سے خط لے کر نکلنا ۔ فہمیدہ سمجھ گئی کہ ضرور کلیم کے باپ کا خط ہے ۔ جب تک کلیم خط پڑھتا رہا ، فہمیدہ چپ بیٹھی دیکھا کی ۔ خط پڑھ چکنے کے بعد کلیم چاہتا تھا کہ پھر وہی بات شروع کرے ، اتنے میں فہمیدہ نے پوچھا : ''باپ نے کیا لکھا ہے ؟''

بیٹا : ''ان کو تو جانتی ہو، جس بات کے پیچھے پڑتے ہیں، پہروں کی خبر لاتے ہیں ۔ پھر بلایا ہے ۔''

ماں : ''صرف بلاوے کا اتنا بڑا بھاری خط ۔ ذرا میں بھی دیکھوں ۔''

فہمیدہ نے خط لے کر پڑھا ۔ اس میں لکھا تھا : (خط)

اے جانِ پدر ! اَرْشَدَکَ اللہُ تَعَالٰی[۲۸] ۔ میں نے پہلے تم کو علیم اور پھر رسولں کے ہاتھ بلوایا اور تم نہ تو آئے اور نہ معذوری و معذرت کہلا بھیجی ، جس سے ظاہر ہے کہ تم نے مجھ کو ہیچ اور میرے حکم کو بے وقعت محض سمجھا ۔ اگرچہ میرے نزدیک دنیا کا ضروری سے ضروری کام بھی ایسا نہیں ہو سکتا کہ باپ بلائے اور بیٹا اس کام کے حیلے سے باپ کے پاس حاضر ہونے میں مکث کرے ، لیکن اگر کوئی ایسی صورت در پیش تھی کہ تم اس کو میری طلب پر مقدم رکھنا چاہتے تھے تو اس کو مجھ پر ظاہر اور اپنی مجبوری سے مجھ کو مطمئن کرنا بھی تم پر لازم تھا ۔

نہ صرف اس نظر سے کہ میں تمھارا باپ ہوں اور تم میرے بیٹے ہو بلکہ آدابِ تمدن اور اخلاقِ معاشرت اسی طرح کے برتاؤ کے مقتضی ہیں ۔ دنیا کا انتظام جس قاعدے اور دستور سے چلتا ہے ، تم اپنے تئیں اس سے بے خبر اور ناواقف نہیں کہہ سکتے ۔ ہر گھر میں ایک مالک ، ہر محلے میں ایک رئیس ، ہر بازار میں ایک چودھری ، ہر شہر میں ایک حاکم ، ہر ملک میں ایک بادشاہ ، ہر فوج میں ایک سپہ سالار ، ہر ایک کام کا ایک افسر ، ہر فرقے کا ایک سرکردہ ہوتا ہے ۔ الغرض ہر گھر ایک چھوٹی سی سلطنت ہے ۔ اور جو شخص اس گھر میں بڑا بوڑھا ہے ، وہ اس میں بہ منزلہ بادشاہ کے ہے اور گھر کے دوسرے لوگ بہ طور رعایا اس کے محکوم ہیں ۔ اگر ملک کی بد نظمی حاکم

---

۲۸ - خدا تجھے نیک ہدایت دے ۔

ملک کی غفلت اور بے عنوانی سے ہوتی ہے تو ضرور اس گھر میں جو خرابی ہے، اس کا الزام مجھ پر ہے ۔ اور میں نہایت ندامت اور حسرت کے ساتھ تسلیم کرتا ہوں کہ اب تک میں بہت ہی غافل بادشاہ اور بڑا ہی بے خبر حاکم رہا ہوں ۔ میری غفلت نے میرے ملک کو غارت اور میری سلطنت کو تباہ کر دیا ۔ میری بے خبری نے نہ صرف مجھ کو ضعیف الاختیار بنایا بلکہ رعیت کو بھی ایسا سقیم الحال کر دیا کہ اب ان کے پنپنے کی امید نہیں ۔ جس طرح چھوٹے چھوٹے نواب اور رجواڑے سلطان وقت کے حضور میں اپنے ملکوں کی بد نظمی کے واسطے جواب دہی کیا کرتے ہیں اور ان کی غفلت اور بے عنوانی کی سزا ملتی ہے ۔ واجد علی شاہ[۲۹] سے سلطنت منتزع ہوئی ۔ والیٔ ٹونک[۳۰] مسند حکومت سے آتار دے گئے ۔ میں بھی بادشاہ دو جہان کے حضور میں اپنے گھر کی خرابی کا جواب دہ ہوں اور دوسروں کو سزایاب ہوتے دیکھ کر اب مجھ کو سچا اور پورا تنبّہ ہوا ہے اور میں نے مصمم ارادہ کر لیا ہے کہ آئندہ سے میری خانہ داری کے ملک میں جتنے رخنے ہیں بند اور جتنے خلل ہیں مسدود ، جتنے نقص ہیں پورے ، جتنے سقم ہیں دفع کیے جائیں ۔ بڑی خطرناک قباحت جو میں اپنے ملک خانہ داری میں پاتا ہوں ، یہ ہے کہ میں اور میری رعایا

۲۹ ۔ لکھنؤ کا آخری فرماں روا جو اپنی عیش پرستی کے لیے روایتی طور پر مشہور ہے ۔ ۱۸۵۶ء میں اودھ کا علاقہ انگریزوں نے ہڑپ کر لیا اور واجد علی شاہ کو گرفتار کر کے مٹیا برج کلکتہ میں نظر بند کر دیا ۔

۳۰ ۔ وسط ہند میں مسلمانوں کی ایک ریاست تھی ۔

یعنی تم لوگ شاہنشاہ دو جہان سے سرکشی و بغاوت پر آمادہ و کمربستہ ہو اور خراج عبادت جو ہم کو وقت مقرر پر ادا کرنا چاہیے بالکل باقی پڑا ہے۔ خراج جو ہم پر عائد کیا گیا ہے، میں دیکھتا ہوں تو نہایت ہی ہلکا اور نرم اور رعایتی ہے۔ اگر ہم چاہتے تو کوئی قسط بھی باقی نہ رہتی اور جو مطالبۂ شاہی تھا، بے زحمت، اپنے وقت پر خزانۂ عامرہ سرکاری میں داخل ہو جایا کرتا۔ باایں همه جو کوتاہی ہماری طرف سے ہوئی ظاہر ہے۔ اس نادهندی کی کوئی نامعقول تاویل بھی تو ہم نہیں کر سکتے۔

اب معاملہ دو حال سے خالی نہیں: یا تو پچھلا خراج تمام و کمال بےباق کریں اور اپنا قصور معاف کرائیں اور آئندہ کو عہد کریں کہ کبھی باقی نہ رکھیں گے؛ یا بادشاہ کے ساتھ لڑیں اور مقابلہ کریں اور ہو سکے تو اپنے تئیں اس کے ربقۂ اطاعت سے آزاد کر لیں۔ شاہی قوت اور ہمارا ضعف تو ظاہر ہے۔ بھلا ہماری تو کیا ہستی ہے، فرعون اور نمرود اور شداد اور ہامان اور قارون، کیسے کیسے جابر اور مقتدر ہو گزرے ہیں؛ باغی ہوئے تو کسی کا نام و نشان تک باقی نہ رہا۔ پس سوائے اطاعت و انقیاد دوسرا چارہ نہیں۔ رعایائے ملک میں تم کو سر برآوردہ اور ممتاز سمجھ کر صلاح و مشورے کے لیے بلایا تھا۔ تمھارے نہ آنے سے ثابت ہوا کہ تم کو سرکار کا ذرا سا بھی خوف نہیں۔

اب تک میں نے تشبیہ و تمثیل میں تم سے گفتگو کی اور اس سے تم کو معلوم ہو جائے گا کہ کس مجبوری سے میں

تمھارے معاملات میں دخل دیتا اور تمھارے افعال سے سے تعرض کرتا ہوں - میرا دخل و تعرض بے شک تم کو دخل بے جا اور تعرض نا روا معلوم ہوتا ہوگا لیکن ذرا اپنی اور میری ذمہ داری کو انصاف کے ساتھ موازنہ کرو گے ، تو سمجھ لو گے کہ اس کو بے جا اور نا روا سمجھنا بڑی غلطی ہے - جن شرطوں کا میں تم کو پابند کرنا چاہتا ہوں ، میں اپنے تئیں اور کسی کے تئیں ان سے مستثنیٰ نہیں کرتا - پھر شکایت کیا اور گلہ کیوں ؟

تم جیسے نوجوان آدمیوں کو مذہب کے بارے میں کبھی کبھی خدشات بھی واقع ہوا کرتے ہیں اور یہ کچھ عیب کی بات نہیں - خدشے کا واقع ہونا دلیل جستجو ہے اور جستجو کا انجام ہے حصول - جوئندہ یابندہ - اگر تم میں سے کوئی ایسا خدشہ پیش کرنا چاہے تو میں اس کا جواب دینے کو موجود ہوں - جہاں تک میں سمجھتا ہوں، مذہب کے اصول ایسے سچے اور یقینی اور بدیہی اصول ہیں کہ ان میں تردد و انکار کا دخل ہو ہی نہیں سکتا - چوں کہ ابتدائے شعور سے اب تک ہم لوگ غفلت اور سستی اور بے پروائی اور خداوند جل و علا شانہ کی مخالفت اور عدول حکمی اور نافرمانی میں زندگی بسر کرتے رہے اور گناہ اور خطا کاری کی عادتیں ہمارے دلوں میں راسخ ہوگئی ہیں ، البتہ میں جانتا اور مانتا ہوں کہ ایک مدت میں زنگ معصیت ہمارے سینوں سے دور ہو کر یہ آئینے ایمان کی جلا سے منور ہوں گے - لیکن بالفعل میرا مطلب اسی قدر تھا کہ ہر شخص مناسب حالت اپنا اپنا فکر کر چلے -

جب میں اپنی اور تم سب کی پچھلی زندگی پر نظر کرتا ہوں تو اپنی بوٹیاں توڑ توڑ کر کھاتا ہوں ، کیوں کہ اس ساری خرابی کا بانی اور اس تمام تر بدی کا موجب میں ہوں۔ اے کاش ! میرا اتنا ھی قصور ہوتا کہ میں اپنی ذات سے گنہ گار قرار دیا جاتا۔ نہیں ، تم سب کے گناہوں میں میرا ساجھا اور تم سب کی خطاؤں میں میری شرکت ہے ۔ میں خدا کا گنہ گار الگ ہوں اور تمھارا قصور وار الگ ۔ لیکن افسوس ہے کہ اس گناہ کا کفارہ اور اس قصور کی تلافی میرے اختیار سے خارج ہے۔ ھاں ، مگر یہ کہ تم مجھ پر رحم کر کے اپنی اصلاح وضع کرو ۔ کیا تمھاری سعادت مندی اس بات کو جائز رکھتی ہے کہ تمھارے سبب قیامت میں میری رسوائی ہو ؟ کیا تمھاری حمیت اس بات کو پسند کرتی ہے کہ تمھاری وجہ سے حشر کے دن میں خدا کے غضب میں پکڑا جاؤں؟ چوں کہ تم میرے بڑے بیٹے ہو، مجھ کو سب سے زیادہ تمھارا بھروسا تھا کہ تم اس مشکل میں میرا ساتھ دو گے ، میری مدد کرو گے ، نہ کہ تم نے ملنے سے بھی کنارہ کیا ۔ میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ میری آس ٹوٹ گئی اور میرے ذھنی منصوبے تمام بگڑ گئے۔ اتنی بڑی مہم اور میں اکیلا ! اتنا مشکل کام اور میں تنہا !

تم جانتے ہو کہ تمھارا انحراف میرے انتظام میں کتنا خلل ڈالے گا ۔ چھوٹے بڑے سب تم کو سند گردانیں گے اور بات بات میں تمھارا حوالہ دیں گے ۔ اگر تم اسی مصلحت سے میری شرائط کو قبول کر لیتے تو تمھارا کیا بگڑ جاتا ؟ تم نے ابتداء ھی سے وہ سختی اختیار کی جس کی مجھ کو انجام

میں بھی تم سے توقع نہ تھی ۔ جتنی مشکلیں مجھ کو پیش آنے والی ہیں میں ان سے بے خبر نہیں ہوں ۔ اور اگر اس ارادے کا ترک کر دینا میرے اختیار میں ہوتا تو میں تم کو سچ کہتا ہوں ، میں اس بات کو منہ ہی سے نہ نکالتا ۔ لیکن میں خوب جانتا ہوں کہ میں کوئی انوکھا آدمی نہیں ہوں ۔ آخر مجھ کو ایک نہ ایک دن مرنا ہے ۔ ابھی جب میں نے ہیضہ کیا تو کیا مرنے میں کچھ باقی رہ گیا تھا ؟ خدا کی قدرت تھی کہ اس نے مجھ کو از سر نو پھر جلا دیا ۔ لکن بکرے کی ماں آخر کب تک خیر منائے گی ۔

رہا گر کوئی تا قیامت سلامت
پھر آخر کو مرنا ہے حضرت سلامت

اور جس طرح مرنا یقینی ہے یہ بھی یقینی ہے کہ مجھ کو اپنے اعمال و افعال کے واسطے خدا کے حضور میں جواب دہی کرنی پڑے گی اور نہ صرف اپنے اعمال و افعال کے واسطے بلکہ تم سب کے اعمال و افعال کے واسطے بھی ۔ پس سوائے اس کے کہ میں اپنا اور تم سب کا طرز زندگی بدل دوں اور کچھ چارہ نہیں ۔ اگر تم میرے پاس آئے ہوتے اور مجھ سے اور تم سے بات چیت ہوئی ہوتی تو میں تمھاری رائے دریافت کر کے ایک خاص طور پر تم سے گفتگو کرتا ۔ اب مجھ کو معلوم نہیں کہ جتنی باتیں میں نے کہیں ان میں سے کون سی تم کو تسلیم ہے اور کس کس سے تم کو انکار ہے ؟

اب زیادہ لکھنا فضول و عبث سمجھتا ہوں ، لیکن جو میرے ذہن میں تھا ، لکھ چکا ۔ میں تم سے اس کے جواب کا متقاضی نہیں اور اس کے دو سبب ہیں ۔ اول یہ کہ میں اپنے تقاضے

کا لا حاصل اور بے اثر ہونا دیکھ نہیں سکتا۔ دوسرے، صرف ایک ہی جواب ہے کہ اس کو میں بطیب خاطر سن سکتا ہوں، وہ یہ کہ تم میری شرطوں کو منظور کرو۔ ورنہ میں اپنے تئیں مواخذۂ عاقبت سے بچانے کے لیے البتہ ان چند روزہ رشتوں کا پاس اور ان عارضی قرابتوں کی پرواہ نہیں کر سکتا۔ اور یہ میری ہارے درجے کی تدبیر ہے اور میں خدا سے گڑ گڑا کر دعا مانگتا ہوں کہ مجھ کو اس کے اختیار کرنے کی ضرورت واقع نہ ہو۔ والدعا۔"

خط پڑھ کر فہمیدہ بیٹے سے کہنے لگی "دیکھا؟"

بیٹا: ع "جو کچھ خدا دکھائے سو ناچار دیکھنا"

ماں: "کیا اب بھی تم کو باپ کی نسبت جنون کا احتمال ہے؟"

بیٹا: "احتمال کیسا، اب تو یقین کامل ہے۔ بہ قول شخصے: ع

دیوانہ گر نہیں ہے تو ہشیار بھی نہیں

اپنے تئیں بادشاہ سمجھنا جنون نہیں تو کیا ہے؟"

ماں: "اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن[۳۱]"

بیٹا: "کیوں، آپ نے انا للہ کس بات پر کہا؟"

ماں: "تمھاری الٹی سمجھ اور تمھاری بد قسمتی پر۔"

بیٹا: ع۔ "بہتر ہے وہی جو کچھ بدی ہے"

۳۱۔ ہم اللہ کے ہیں اور ہمیں اُسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔

ماں : ''تو کیا سچ مچ تم باپ کے پاس نہیں جاؤ گے ؟''

بیٹا : ''اب تو میرا نہ جانا اُن پر بھی ظاہر ہو گیا ، پھر کیا ضرورت ہے ۔ کل جیسی ہوگی دیکھی جائے گی ۔''

ماں : ''دیکھو پھر میں تم سے کہے دیتی ہوں کہ رات کو اطمینان سے تم اس خط کے مطلب پر غور کرو ۔ تمہارے باپ نے کوئی بات بے جا نہیں لکھی ۔ جو شخص اس خط کو دیکھے گا ، تم کو قائل معقول کرے گا ۔''

فصلِ ہشتم

نعیمہ کی خالہ زاد بہن صالحہ نے اس کو آ کر منایا، کھانا کھلایا اور اُسی کے ساتھ نعیمہ خالہ کے یہاں چلی گئی

ابھی فہمیدہ یہ بات پوری بھی نہیں کرنے پائی تھی کہ صالحہ کی ڈولی آ پہنچی ۔ اترتے کے ساتھ خالہ سے پہلے یہی پوچھا : ''کہو آپا نے کچھ کھایا پیا یا نہیں ؟''

خالہ : ''کچھ بھی نہیں ۔''

صالحہ : ''ہیں کہاں ؟''

خالہ : ''درے کے اندر کوٹھری[1] میں ۔''

صالحہ : ''آخر بات کیا ہوئی تھی ؟''

خالہ : ''کیا علیم نے تم سے کچھ نہیں کہا ؟''

صالحہ : ''اتنا ہی کہا کہ لڑائی ہوئی ہے ، صبح

---

۱ - وہ کمرہ جو سہ درے (یا در دالان) کے اندر کھلتا ہو۔

سے کھانا نہیں کھایا - میں ہر چند پوچھتی رہی ، کچھ نہیں بتایا اور کہا کہ بھائی وہاں چل کر پوچھ گچھ لینا -"

تب خالہ نے شروع سے آخر تک سب ماجرا کہہ سنایا -

صالحہ بڑی دانش مند لڑکی تھی اور اگرچہ نعیمہ سے عمر میں کچھ چھوٹی تھی مگر دونوں میں بڑا ہی میل ملاپ تھا - صالحہ کو جو دقت پیش آنے والی تھی اس کو سوچ کر اس نے خالہ سے کہا : "ان شاء اللہ آپا کو میں راضی کر لوں گی ، مگر میرے سوائے اس مکان میں دوسرا آدمی کوئی نہ رہے - کیوں کہ گھر میں جتنے آدمی ہیں ، آخر سب اس حال سے واقف ہیں ؛ ان میں سے کوئی سامنے جائے گا ، تو آپا کو ضرور حجاب ہوگا -"

بات صالحہ نے معقول سوچی تھی ، کیوں کہ جب ایک مجمع میں کسی آدمی کی بے عزتی ہوتی ہے تو جو لوگ اس کی تفضیح دیکھ چکے ہیں ، وہ سب کو اپنا دشمن ٹھہرا لیتا ہے - شاید اس خیال سے کہ یہ سب کھڑے دیکھتے رہے اور انھوں نے میری کچھ مدد نہ کی - اور ان میں سے جب کوئی شخص سامنے آتا ہے تو اس ستم رسیدہ کو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا اسی نے مجھ کو فضیحت کرایا تھا - پس ضرور اس کے غصے کو ترقی اور اس کے غضب کو زیادتی ہوتی ہے - اور بے چاری بیدارا نے جو ناحق ایک دولتی کھائی تو اسی وجہ سے ، ورنہ اس کا کیا قصور تھا - وہ ماں بیٹیوں کے بیچ میں کچھ بولی نہیں چالی نہیں ، نہ کسی طرح کا دخل دیا ، نہ کسی کی طرف داری کی اور دخل دینے کی فرصت کس کو ملی - ماں بیٹیوں میں ایک بات پر رد و کد

ہونی شروع ہوئی ، جیسے ہمیشہ ہوا کرتی ہے ۔ ماں نے دفعۃً بیٹی کو طمانچہ کھینچ مارا ۔ غرض بات کی بات میں تو تیاری ، سامان ، ارادے ، چڑھائی ، مار کٹائی ، ہار جیت ، سب کچھ ہو گیا ۔ گھر والے دیکھتے کے دیکھتے ہی رہے ۔

صالحہ نے جو اپنا انتظام خالہ کو سنایا ، انھوں نے بھی پسند کیا اور سب لوگوں سے کہہ دیا کہ اس قطعے میں کوئی نہ جائے ۔ ہر ایک کو سونے بیٹھنے کا ٹھکانا بتا دیا اور اپنے واسطے یہ تجویز کی کہ ہم گھر والے سب مردانے میں پردہ کرا کر سو رہیں گے ۔ بلکہ صالحہ نے کہا بھی کہ آپ کوٹھے پر سوئیں ، خالہ نے جواب دیا کہ ابھی مجھ کو ان بڑے حضرت ، میاں کلیم کے ساتھ سر مارنا ہے ۔

صالحہ : ”کیا ان سے بھی لڑائی ہوئی ہے ؟

خالہ : ”لڑائی کیسی ان سے تو چھٹم چھٹا ہو رہی ہے ۔“

صالحہ : ”کس بات پر ؟“

خالہ : ”بات تو اتنی سی ہے کہ باپ نے ان کو نماز روزے کے واسطے نصیحت کرنے کو اپنے پاس اوپر بلوایا ، یہ نہیں گئے ۔“

صالحہ : خالو جان نے بلوایا اور یہ نہیں گئے ؟“

خالہ : ”تم کو نہ جانے پر تعجب ہوتا ہے ، باتیں سنو تو حیران ہو جاؤ ۔ باپ کو دیوانہ اور مجنون ، نماز کو کھڑاگ ، دین کے پیشواؤں کو مُلانے ، قلاؤذئے ،

مردہ شو ، ٹکڑ گدے ، بھک منگے بتاتے ہیں ۔''

صالحہ : ''کسی نے آپ سے غلط کہہ دیا ہوگا ۔''

خالہ : ''میرے رُو در رُو ۔''

صالحہ : ''پھر کسی سے ان کو سمجھایا ہوتا ۔''

خالہ : ''ایک سمجھانا ۔ علیم نے بہتیرا سر مارا ۔ میں شام سے اب تک کہتے کہتے تھک گئی ۔ جن مصیبتوں سے آج کا دن کٹا ہے ، خدا ہی جانتا ہے ۔ دانہ تک میرے یا حمیدہ کے منہ میں گیا ہو تو جس طرح کی چاہو قسم لے لو ۔ اس پر نعیمہ کا فکر ، کلیم کا تردد اور سب سے بڑھ کر نعیمہ کے بچے کا سنبھالنا ، کہ آج اس کو دن بھر روتے گزرا ہے ۔''

صالحہ : ''آپ کھانا کھائیے ۔ دوسرا وقت بھی نا وقت ہوگیا ۔ یقین ہے کہ آپ کے کھاتے کھاتے میں آپا کے واسطے کھانا منگواتی ہوں ۔''

خالہ : ''میری کیا جلدی ہے ، میں کھا ہی لوں گی ۔ حمیدہ بےچاری کے صبر کو دیکھو کہ اس نے کھانے کا نام بھی تو نہیں لیا ۔ کل اسی وقت کا کھائے ہوئے ہے ۔ خالی پیٹ میں دن بھر پانی آنڈیلتی رہی ہے ۔ میں نے ہر چند کہا نہ مانا ۔ آخر بھوکی سو رہی ۔''

صالحہ : ''کیا آپ حمیدہ پر بھی کچھ خفا ہوئی تھیں ؟''

خالہ : ''مطلق نہیں ۔ اس نے بہن کے افسوس میں کھانا

نہیں کھایا ۔ بہن کا وہ حال کہ بس چلے تو جان سے مار ڈالنے میں تامل نہیں اور اس کی یہ کیفیت کہ بہن پر اپنا دم دیتی ہے ۔ بھانجھے کو اس قدر چاہتی ہے کہ رات کو بھی ساتھ لے کر سوتی ہے ۔"

صالحہ : "حمیدہ کو آپ جگائیے اور اطمینان سے آپ بھی کھانا کھائیے اور اس کو بھی کھلائیے ۔ آپا کی اب کچھ فکر نہ کیجیے ۔"

یہ کہہ کر صالحہ اندر مکان میں گھستے ہی پکاری : "کیوں بی ، میری آپا کہاں ہیں ؟" گھر میں کوئی ہو تو جواب دے ۔ سب سے پہلے باورچی خانے میں گئی ، وہاں نہ دیکھا ۔ دالان میں آئی ، وہاں بھی نہ پایا تو سہ درے میں ڈھونڈھتی پھری ۔ غرض ٹال مٹول کرتے کرتے آخر کار درے والی کوٹھری کے پاس آ کر جھانکنے لگی ، جہاں نعیمہ تھی ۔ نعیمہ دن بھر تو فرش پر پڑی رہی مگر صالحہ کی آواز سنتے کے ساتھ جلدی سے اٹھ منہ لپیٹ پلنگ پر جا لیٹی اور دروازے کی طرف پیٹھ کر لی ۔ صالحہ نے پہلے تو انجان بن کر پوچھا : "یہ پلنگ پر کون لیٹا ہے ؟" پھر آپ ہی آپ کہنے لگی : "آہا آپا ہیں ۔ ایں ، اکیلی کوٹھری میں اور ایسے سویرے !" اتنا کہا اور دوڑ کر نعیمہ کو لپٹ گئی ۔

نعیمہ نے جب سے صالحہ کی آواز سنی ، اس کو ایک طرح کی حیرت تھی کہ سان نہ گمان دفعۃً یہ کہاں سے آ موجود ہوئیں ۔ مگر یہ بات اس کے ذہن میں بھی نہیں گزری کہ بلوائی ہوئی آئی ہے ۔ نعیمہ نے اس وقت اپنے تئیں ایسا بنا

لیا کہ گویا دیر سے پڑی سوتی ہے اور بھاری سی آواز بنا کر بولی : ''اے ہے ، بھائی ہم کو دق نہ کرو ، ہم کو سونے دو ۔''

صالحہ : ''ہائے بی آپا ! میں ہوں صالحہ ۔ اٹھو منہ کھولو ، ابھی سے کیوں سو رہیں ، جی کیسا ہے ؟''

اگرچہ نعیمہ نے چاہا تھا کہ صالحہ پر اپنی کیفیت ظاہر نہ کرے مگر اس نے ایسی ہم دردی سے پوچھا کہ نعیمہ ضبط نہ کر سکی اور رونے لگی ۔ اس کو روتا دیکھ کر صالحہ نے اصرار سے پوچھنا شروع کیا : ''کیا سر دکھتا ہے ؟ پیٹ میں درد ہے ؟ بچے کا جی کیسا ہے ؟ سسرال والوں نے کچھ کہلا بھیجا ہے ؟ گھر میں کسی سے لڑائی ہوئی ہے ؟'' صالحہ بہتیرا پوچھتی تھی مگر نعیمہ ہاتھوں سے پرے دھکیلتی جاتی تھی اور کچھ جواب نہیں دیتی تھی ۔ آخر صالحہ نے کہا : ''نہ بتاؤ تو مجھی کو کھاؤ ۔'' تب نعیمہ خفا ہو کر بولی : ''چل مکارہ ، مجھی سے باتیں بنانے آئی ہے ۔ کیا تجھ کو خبر نہیں ؟''

صالحہ : ''ابھی مولوی ہدایت اللہ صاحب کے وعظ سے اٹھی چلی آتی ہوں ۔ یہاں آئی تو خالہ اماں اور گھر والے سب مردانے مکان میں ہیں ۔ اتنا سنا کہ بڑے بھائی خفا ہو کر گھر سے جا رہے ہیں ۔ مجھ کو تم سے ملنے کی جلدی تھی ۔ اماں کو سلام کر سیدھی اندر چلی آئی ۔ یہاں آ کر دیکھا تو نہ آدم نہ آدم زاد ۔ تم کو سارے گھر میں ڈھونڈتی پھری ۔''

نعیمہ : ''کیوں ، بڑے بھائی کس بات پر گھر سے نکل

رہے ہیں ؟''

صالحہ : ''لوگ آپس میں کہہ رہے تھے کہ خالو ابا نے کہلا بھیجا ہے ، نماز پڑھیں تو میرے گھر میں رہیں ورنہ جہاں چاہیں چلے جائیں ۔''

نعیمہ : ''آگ لگے اس نماز کو ۔ یہ کیا اب گھر میں کسی کو تھوڑا ہی رہنے دے گی ۔ یہ تو حمیدہ کے سوائے سبھی کو نکلوائے گی ۔''

صالحہ : ''تو کیا آپا تم بڑے بھائی ہی کے واسطے پڑی رو رہی تھیں ؟''

نعیمہ : ''مجھ کو تو بے چارے بڑے بھائی کی خبر بھی نہیں ۔ ان سے پہلے میں خود آپ نکلنے کو بیٹھی ہوں ۔''

صالحہ : ''توبہ آپا توبہ ۔ کیسی بد فال منہ سے نکالتی ہو کہ خدا پناہ میں رکھے ۔ اللہ نہ کرے کہ کسی بھلے مانس اشراف کی بہو بیٹی گھر سے نکلے ۔''

نعیمہ : ''جب سے اس نماز روزے کا چرچا ہمارے گھر میں ہوا ہے ، بھلمنساہت اور شرافت سب گئی گزری ہوئی ۔ اب آئی ہو تو دو چار دن رہ کر ہر ایک کا رنگ ڈھنگ دیکھنا ۔ نہ وہ زمین رہی نہ آسمان ۔ گھر کا باوا آدم ہی کچھ بدل سا گیا ہے ۔ نہ وہ ہنسی ہے ، نہ وہ دل لگی ہے ، نہ وہ چرچے ہیں ، نہ وہ مذاق ہے ، نہ وہ چہچہے ہیں ۔ گھر میں ایک اداسی چھائی رہتی ہے ۔ ورنہ ابھی ایک مہینے کا مذکور ہے کہ محلے کی عورتیں تمام تمام دن بھری رہا کرتی

تھیں ۔ کوئی گیت گا رہی ہے ، کوئی کہانی کہہ رہی ہے ۔ یہ ہمسائی عجوبہ ، کچھ اس طرح کی زندہ دل ہیں کہ ہر روز نئی نئی نقلیں کر کے سب کو ہنساتے ہنساتے لٹا لٹا دیتی تھیں ۔ اب کوئی گھر میں آ کر تھوکتا بھی نہیں ۔ گھر ہے کہ کم بخت اکیلا پڑا بھائیں بھائیں کیا کرتا ہے ۔"

صالحہ : "آخر اس کا سبب کیا ؟"

نعیمہ : "سبب تمھاری خالہ جان اور حمیدہ کے ابا جان کی بد مزاجی ۔ کسی کو کیا غرض ، کیا مطلب کہ اپنے کام کاج کا حرج کرے اور پرائے گھر آ کر بیٹھے ۔ کیا لوگوں کے گھروں میں بیٹھنے کی جگہ نہیں ؟ لوگوں کی خاطر داری ہوتی تھی ، محبت سے ان کے ساتھ پیش آتی تھیں ، لوگ دوڑے آتے تھے ۔ اب یہ حال ہے کہ ہر وقت منہ کپے کی طرح پھولا رہتا ہے ۔ غیر آدمی کیوں برداشت کرنے لگے ۔ سب کے سب چلتے پھرتے نظر آئے ۔ ابا جان کے اچھے ہونے پر ڈومنیوں نے سینکڑوں ہی پھیرے کیے ۔ سب ہی نے کہا ۔ ہمسائی عجوبہ نے منتیں کیں ، ہاتھ جوڑے ، ایک نہ مانی ۔ آخر وہ رت جگا تو خاک بھی نہ ہوا ، نگوڑے مسجد کے ملانوں کو بلا کر کھلا دیا ۔ اب تو ہوا ، دن رات نماز کا وظیفہ ہے ۔ وہ دیکھو تخت پر نماز کا چیتھڑا[۲] بچھا رہتا ہے ۔ وضو کا کلھڑا کیا مجال کہ کسی وقت پاس سے الگ ہو جائے ۔ کام کاج سے فارغ ہوئیں تو یا نماز پڑھنے کھڑی

---

۲ ۔ حقارت سے جا نماز کو نماز کا چیتھڑا اور وضو کے بدھنے کو کلھڑا کہا ہے ۔ کلھڑا :۔ مٹی کا چھوٹا سا برتن جو گلاس کی جگہ استعمال ہوتا ہے ۔

ہو گئیں یا کتاب پڑھنے بیٹھ گئیں ۔ ایک حمیدہ کُٹنی اُن کو ایسی مل گئی ہے کہ اور ان کو آکسایا کرتی ہے ۔ میرا بس چلے تو کُتیا کو ایسا ماروں کہ یاد کرے ۔''

صالحہ : ''اے ہے ، حمیدہ تو نگوڑی ایسی غریب اور بھولی لڑکی ہے کہ میں نے تو آج تک کوئی اس کی شرارت کی بات دیکھی کیا سنی بھی نہیں ۔ اور تم کو تو اتنا چاہتی ہے کہ کاہے کو کوئی بہن کسی بہن کو چاہے گی ۔ رمضان کی بات مجھ کو اب تک نہیں بھولی ۔ تم کو تو یاد ہوگا کہ اخیر عشرے میں مَیں نے اس کو بلوا بھیجا تھا ۔ گھر میں سبھی کو افطاری تقسیم ہوتی تھی ، اس کو بھی حصہ ملتا تھا ۔ بچہ سمجھ کر ہر چیز میں سے کچھ کچھ زیادہ دے دیتے تھے مگر اس کو منہ پر رکھنا قسم تھا ۔ لوگ کھاتے اور یہ منہ دیکھتی ۔ بہتیرا سمجھاتے کہ بھائی یہ کیا بری عادت ہے ۔ چیز ہوتے سہاتے تم نہیں کھاتیں ۔ مگر یہ اللہ کی بندی چکھتی تک بھی تو نہیں تھی ۔ پہلے مجھ کو خیال ہوا کہ شاید خِسّت کی وجہ سے نہیں کھاتی ۔ مگر میں نے پوچھا تو کہنے لگی : ''آپا بغیر کوئی چیز میرے حلق سے نہیں اترتی ۔'' دیکھو ، دن بھر تمھارے لڑکے کو لیے رہتی ہے ۔ اور لڑکے کو بھی کچھ ایسا آرام ملتا ہے کہ کیسا ہی پھڑکتا ہو ، اس کی گود میں گیا اور چپ ۔ اور تمھاری کیا خصوصیت ہے ، ہر ایک سے وہ اسی طرح محبت سے ملتی ہے ۔ میں تو تم سے سچ کہوں ، مجھ کو تو بہت ہی پیار آتا ہے ۔ جب آتی ہوں خوب بھینچ بھینچ کر کئی کئی دفعہ گلے لگاتی ہوں ۔''

نعیمہ : ''جس کو دیکھتی ہوں ، حمیدہ ہی کا کلمہ بھرتا ہے اور میری یہ کیفیت ہے کہ اس کو دیکھ کر میری آنکھوں میں خون اترتا ہے ۔''

صالحہ : ''اچھی ، کیوں ؟''

نعیمہ : ''مجھ کو اماں جان سے اسی نے برا بنوایا ۔ ورنہ آج تک اماں نے کبھی ہوں بھی نہیں کہا تھا ، یا آج چھوٹتے[۳] کے ساتھ ، نہ بات نہ چیت ، مجھ کو تھپڑ کھینچ مارا ۔ خیر الٰہی ، حمیدہ بندی ، تجھ کو انھی ہاتھوں سے اماں جوتیاں ماریں تب میرے کلیجے میں ٹھنڈک پڑے ۔ اور جیسی تو آج کل سر چڑھی ہے ، ویسی ہی نظروں سے گرے تب میرے دل کی مراد بر آئے ۔''

صالحہ : ''خالہ اماں نے تم کو تھپڑ مارا ؟ یہ کب اور کیوں ؟

نعیمہ : ''آج صبح ذرا کی ذرا لڑکا حمیدہ کو دے کر میں ہاتھ منہ دھونے چلی گئی ۔ تم کہتی ہو کہ بھانجے پر فدا ہے ۔ لڑکے کو روتا ہوا زمین پر پٹک دیا ۔ اس کو اتنا بھی ترس نہ آیا کہ ابھی پسلی کے دکھ سے مر مر کے بچا ہے ؛ یوں جو زمین میں بٹھائے دیتی ہوں ، ایسا نہ ہو کہ اس کو صبح کی ٹھنڈی ہوا لگ جائے اور پھر بیمار پڑے ۔ پس اتنا قصور میرا ضرور ہے کہ میں نے ہولے سے حمیدہ کو ہاتھ لگایا ۔ ہاتھ کا لگانا تھا کہ وہ فیلہائی دھڑام سے تخت پر گر پڑی ۔ کہیں ذرا سی خراش آگئی ۔''

---

۳ - فی الفور ۔ یکایک ۔

صالحہ : ''کیا کہوں ، مجھ کو تو یقین نہیں آتا کہ حمیدہ اور بھانجے کو بے سبب روتا ہوا زمین پر بٹھا دے اور خالہ جان حمیدہ کی طرف ہو کر تم کو ماریں ۔ بھلا جاؤں خالہ جان سے پوچھوں ؟''

نعیمہ : ''حمیدہ کے بٹھا دینے کا سبب میں بتاؤں ۔ ان کی نماز قضا ہوتی تھی اور ان کی اماں جان اس بات پر بگڑیں کہ میں نے نماز کو کیوں برا کہا ۔''

صالحہ : ''پھر تم نے نماز کو برا کہا تھا ؟''

نعیمہ : ''کہا تھا اور اب بھی کہتی ہوں ۔ اماں کو تو کچھ نہیں کہا ۔ نماز کو برا کہنا ان کو برا کیوں لگا؟''

صالحہ : ''بھلا کوئی آدمی تمھارے ماں باپ کو برا کہے تو تم کو برا لگے یا نہ لگے ؟''

نعیمہ : ''اماں جان کو کوئی شوق سے برا کہے ، مجھ کو ذرا برا لگنے ہی کا نہیں ۔''

صالحہ : ''آج یا سدا سے ؟''

نعیمہ : ''(مسکرانے لگی اور بولی) کم بخت بے حیا ہنسی کو دیکھو کہ خود بہ خود چلی آتی ہے ۔ نہ بوا ، ایسی باتیں ہم سے نہ کرو ۔''

صالحہ : ''کیا خوب ۔ میں تمھارے ایسے غصے سے نہیں ڈرتی ۔ بہت کروگی خالہ جان نے تم کو ایک طانچہ مارا ہے ، تم مجھ کو دو طانچے مار لینا ۔ لیکن اماں باوا کا

اتنا پاس نہیں تھا تو سسرال والوں سے لڑیں کیوں ؟“

نعیمہ : ”بات بات میں ناحق کوئی برا کہا کرے تو جی نہ جلے ؟“

صالحہ : ”میں یہ کب کہتی ہوں کہ نہ جلے ۔ لیکن خالہ جان نے نماز کا پاس کیا اور اُن کو تمھاری بات بری لگی تو بے جا کیا ہوا ؟“

نعیمہ : ”تو کیا نماز اُن کی اماں ہے یا نانی ہے ؟“

صالحہ : ”جن کو ایمان ہے ان کو ماں سے بڑھ کر پیاری اور نانی سے زیادہ عزیز ہے ۔“

نعیمہ : ”تو کیا میں تمھارے نزدیک بے ایمان ہوں ؟“

صالحہ : ”آدمی ہی بے ایمان بھی ہوتے ہیں ۔ جو بے ایمانوں کا کام کرے وہ بے ایمان ۔ میں ہوئی تو میں اور تم ہوئیں تو تم ۔“

نعیمہ : ”دیکھو صالحہ ، خدا کی قسم ایسی باتوں پر لڑائی ہو جائے گی ۔ بے ایمان تم ہوگی ، تمھارے ہوتے سوتے بے ایمان ہوں گے ۔“

صالحہ : ”خدا کے فضل سے میں تو بے ایمان نہیں ہوں مگر ہوتے سوتے کون ہوئے ـــ تم ؟“

نعیمہ : ”بھلا ایمان سے کہنا ، تم نے میری کون سی بات بے ایمانوں کی سی دیکھی ؟“

صالحہ : ”ایمان سے مت کہلواؤ ۔“

نعیمه : ''نہیں ، تمھیں خدا کی قسم ، بھلا کوئی بات تو بتاؤ ۔''

صالحه : ''پھر برا تو نہیں مانوگی ؟''

نعیمه : ''سچی بات میں برا ماننے کی کیا وجه ؟''

صالحه : ''سچ اور ایمان کی بات تو یه ہے که تمھارے قول و فعل کوئی بھی ایمان داروں کے سے نہیں ۔ اور مجھ سے پوچھنے کی کیا ضرورت تم خود ھی بتا دو که میں فلانا کام ایمان والوں کا سا کرتی ھوں ۔ کھانا ، پینا ، سونا ، گھر کا کام دھندا ، بچوں کا پالنا ، یه تو دنیا میں برے بھلے سب ھی کیا کرتے ھیں ۔ بھلا ایک کام تو ایسا بتاؤ جس سے تمھارا ایمان دار ھونا پہچانا جائے ''

نعیمه : ''بھلا دنیا میں تمھارے نزدیک کوئی بھی ایمان دار ہے یا نہیں ؟''

صالحه : ''کیوں نہیں ۔ اللہ کے بندے سیکڑوں ھزاروں ۔''

نعیمه : ''بھلا میں بھی کسی کا نام سنوں ۔''

صالحه : ''دور کیوں جاؤ ، یه تمھاری ھی گلی میں ایک حضرت بی رھتی ھیں ، جن کے نواسے بھائی علیم کے ساتھ مدرسے میں پڑھنے جاتے ھیں ۔ بس ایمان دار ان کو کہتے ھیں ۔ دیکھو تو ، کیا نیک زندگی ہے ۔''

نعیمه : ''میں تو ان کو دن بھر سیتے ھی دیکھتی ھوں ۔''

صالحہ : ''سچ ہے ، مگر خدا کے واسطے غریب غربا کے کپڑے مفت اور امیروں کے مزدوری پر ۔ لیکن جتنی سلائی ہوتی ہے سب اللہ کے نام دے دیتی ہیں ، ایک پیسہ اپنے اوپر خرچ نہیں کرتیں ۔ یہ عمر اور کڑاکے کے جاڑوں میں پہر رات رہے سے اٹھ کر خدا کی عبادت ۔ گھر میں نوکر نہیں چاکر نہیں ، اپنے ہاتھوں سارے گھر کا کام کاج اور اس پر نماز کی یہ پابندی کہ نماز تہجد تک قضا نہیں ہونے پاتی ۔ محلے میں کتنی لڑکیوں کو انھوں نے پڑھنا سکھایا ، کتنوں کو حیوان سے آدمی بنایا ، اور حسبۃً للہ ، بے غرض ، بے مطلب ۔

میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ مسجد کے کوئی پندرہ بیس مسافر دونوں وقت روٹی پکوانے کو آٹا بھیج دیتے ہیں ۔ اپنے ہاتھوں سے سب کا آٹا گوندھنا ، پکانا ، گھر سے دال سالن جو کچھ وقت پر موجود ہو دینا ۔ اکثر ایسا ہوا ہے کہ سالن نہیں بچا آپ روکھی ہی روٹی کھا کر اٹھ کھڑی ہوئیں ۔ بے چارے مسافر اکثر جوار باجرے کا آٹا لے آتے ہیں ، وہ تو آپ رکھ لیتی اور اپنے گھر سے ان کو گیہوں کی روٹی بھیج دیتی ہیں ۔ ایک دن باجرے کی روٹی ، وہ بھی روکھی ، بیٹھی کھا رہی تھیں ۔ نوالہ حلق سے نہیں اترتا تھا ۔ ہر ہر لقمے کے بعد پانی پینے کی ضرورت ہوتی تھی ۔ میں جو جا نکلی تو مجھ کو دیکھ کر کہنے لگیں : ''بیٹا مجھ کو باجرے کی روٹی بہت بھاتی ہے ۔ کچھ ایسی سوندھی میٹھی اور خستہ ہوتی ہے کہ سبحان اللہ ۔''

ایک طالب علم نے ان سے گاڑھے کی مرزائی سلوائی ۔ اور شاید وہ پہلا ہی کپڑا تھا کہ اس بے چارے کو سلوانے

کا اتفاق ہوا ۔ اس واسطے کہ جب وہ شخص کپڑے لے کر دروازے پر آیا تو حضرت بی صاحب نے اس سے کہا کہ بیٹا اپنی پرانی مرزائی بھیج دو کہ اس کو دیکھ کر قطع کر لوں ، تو اس نے نہایت حسرت کے ساتھ کہا کہ مائی صاحب ، میرے پاس مرزائی نہیں ہے ۔ حضرت بی صاحب : ''بیٹا ، مرزائی نہ ہو تو انگرکھا ہی سہی ۔ خیر ، کچھ اٹکل تو مل جائے گی ۔'' طالب علم : ''انگرکھا بھی نہیں ۔'' مجبوراً اندر پردے میں حضرت بی صاحب نے اس سے پوچھ لیا کہ کمر کتنی ہے ، چولی کتنی نیچی رہے گی ، آستین کس قدر لمبی ہوگی ۔ طالب علم نے بتایا ۔ لیکن دیکھا تو کپڑا کمی کرتا تھا ۔ تب طالب علم نے کہا کہ مائی صاحب جس طرح ہو سکے کھینچ تان کر اسی میں بنا دو ۔ اور آج نماز جمعہ سے پہلے ہی سی دو کہ الوداع کا دن ہے ، میں جامع مسجد میں پہن کر جاؤں ۔ غرض مرزائی سی گئی تو اس کے بدن میں ٹھیک نہ آئی ۔ وہ بے چارہ مایوس ہو کر رو دیا اور اس نا امیدی میں حضرت بی صاحب پر اتنا خفا ہوا کہ شاید گھر کی کوئی لونڈی پر بھی نہیں ہوتا ۔ اندھی ، بےوقوف ، بےتمیز ، پھوہڑ ، بدسلیقہ ، بےرحم ، جو جو کچھ اس کے منہ میں آیا ، بےدریغ کہہ ڈالا ۔ باوجودیکہ گھر میں سب کو برا معلوم ہوا لیکن حضرت بی صاحب روتی جاتی تھیں اور الٹی اس کی استمالت کرتی تھیں ۔ بڑے نواسے کا نیا تہ دوز[۴] چکن کا کرتہ اس کو

۴ ۔ ہاتھ کے سلے ہوئے کرتوں میں سلائی اس اہتمام سے کی جاتی ہے کہ بخیہ باہر سے نظر نہ آئے ۔ اس قسم کی سلائی کو 'گم سلائی' بھی کہتے ہیں ۔

دیا ۔ لیکن اس نے دور اٹھا کر پھینک دیا اور کہا مجھ کو بدن ڈھکنے کے واسطے کپڑے کی ضرورت ہے ؛ یہ واھیات کپڑا میرے کس کام کا ہے ، جس کو پہن کر آدمی ننگے کا ننگا ۔ حضرت بی نے اپنے نواسوں کی تمام گٹھڑیاں[۵] کھول ڈالیں ۔ خاصہ ، تن زیب ، ململ ڈھاکہ ، پاٹن ، ڈوریہ ، رینگ ، شبنم ، نینوں ، سینوں ، سوزن کار ، طرح طرح کے خوش وضع اور طرح دار کپڑے اس کو دکھائے اور ایک اس کو پسند نہ ھوا ۔ کسی کو تو اس نے کہا : ''مردوں کے استعمال کے قابل نہیں ۔'' کسی کی نسبت تجویز کیا کہ یہ متکبروں کی پوشاک ہے ۔ آخر حضرت بی نے بازار سے کورا لٹھا منگوا ، نماز جمعہ سے پہلے اس کی مرزائی تیار کی ،

تب وہ طالب علم ٹلا ۔ حضرت بی کی طرح کوئی اپنا پتّا مسار لے تب ایمان کا دعویٰ کرے ۔ اب تم خود غور کرلو کہ دن رات میں تم ایمان داروں کے سے کتنے کام کرتی ھو ۔''

نعیمہ : ''ایک حضرت بی ایسی ھوئیں ۔ بھلا کوئی دوسری عورت بھی اس مزاج کی شہر میں ہے ؟''

صالحہ : ''چوں کہ تم اس طرح کے لوگوں سے نفرت رکھتی ھو ، اس واسطے تم کو معلوم نہیں ورنہ شہر میں بہتیرے خدا کے نیک بندے پڑے ھیں ۔ کہاں تک ان کے نام گنواؤں ۔ ہے کیا ، کوئی کم کوئی زیادہ ۔ ایک میری ھی

۵ - پہلے صندوق کا رواج اتنا نہیں تھا ۔ کپڑے گٹھریوں میں باندھ کر رکھے جاتے تھے ۔ حضرت بی اور اُن کے نواسوں کی طرز معاشرت کو دیکھتے ھوئے ان قیمتی کپڑوں کا ذکر بے محل معلوم ھوتا ہے ۔

اماں ہیں ، وہ بھی اپنے محلے کی حضرت بی ہیں ۔"

نعیمہ : "دو چار آدمی اس طرح کے ہوئے سہی ۔ میں تو اپنی ہی جیسی عورتیں اکثر دیکھتی ہوں ۔"

صالحہ : "بے شک ، دنیا میں نیک کم ہیں اور برے بہت ۔"

نعیمہ : "میں جانتی ہوں عورتوں کے واسطے بہت نماز روزے کی کچھ ضرورت نہیں ۔ بس ان کی یہی عبادت ہے کہ گھر کے کام کاج دیکھیں ، بچوں کی خبر گیری کریں ۔ ان کو خانہ داری کے بکھیڑوں سے اتنی فرصت کہاں ملتی ہے کہ نمازیں پڑھا کریں ۔ مرد البتہ ، نہ کھانے پکانے کا فکر ، نہ بچوں کا جھگڑا ، جتنی چاہیں عبادت کریں ۔"

صالحہ : "مردوں کو کمانے کا تھوڑا کام ہے کہ بےچارے دن دن بھر اسی میں لگے رہتے ہیں ۔ محلے کے دبکیوں کو دیکھو کہ منہ اندھیرے سے جو کھٹا کھٹ شروع کرتے ہیں تو آدھی رات تک کان پڑی آواز نہیں سنائی دیتی ۔ پھر بھی جتنا خدا کا خیال مرد رکھتے ہیں ، عورتیں کم بخت اس کا آدھا ، پاؤ بھی نہیں رکھتیں ۔"

نعیمہ : "چاہے تم کچھ ہی کہو ، عورت مرد کی برابری تو ہرگز نہ ہوگی ۔ ضرور اللہ میاں نے عورتوں کے حق میں کچھ نہ کچھ آسانی رکھی ہوگی ۔"

صالحہ : "سبب ؟"

نعیمہ : "بھلا کہیں نگوڑی عورتوں سے محنت ہو سکتی

ہے؟"

صالحہ : "عبادت میں نہ چھپر اٹھانا ہے نہ لکڑیاں ڈھونی ہیں، کہ عورتیں کم زوری کا عذر اور نزاکت کا حیلہ پیش کریں۔ بلکہ ایک حساب سے عورتوں کو زیادہ عبادت کرنی چاہیے۔ کیوں کہ اول تو عورتوں کو عبادت کی فرصت زیادہ ملتی ہے، دوسرے خدا کی نعمتوں سے عورتیں زیادہ حصہ پاتی ہیں۔ کھانے پینے میں مرد عورت سب برابر۔ کپڑے میں مرد بے چارے ایک حصہ تو عوتیں ویسے دس۔ نہ عورتوں کا ایک پائجامہ نہ مردوں کا ایک برس کا سارا لباس۔ اور یوں بھی عورتوں کی پوشاک عموماً عمدہ اور بیش قیمت ہوتی ہے بہ نسبت مردوں کے۔ بڑی رقم ہے زیور۔ عورتوں کو سونے کی کان میں قبر کھود کر گاڑ دو، تب بھی بس نہیں۔ مرد بے چارے، جو ثقہ اور وضع دار ہیں، چاندی کا چھلا تک بھی نہیں پہنتے۔ اس پر بھی عورتیں عبادت میں کمی کریں تو ان کی وہی کہاوت ہے، کھانے کو جچّا اور کام کو ننھا بچہ۔"

نعیمہ : "تم تو اچھی میری قسمت کی سچ مچ مولوی صاحب بن کر آئیں۔"

ضالحہ : "مولویوں کے درجے مولویوں کے ساتھ ہیں۔ میں بے چاری کس لائق ہوں۔ مولویوں کی جوتیوں کی برابری بھی نہیں کرسکتی۔"

نعیمہ : "افسوس ہے کہ تم ہماری اماں کے یہاں پیدا نہ ہوئیں۔"

صالحہ : ''افسوس کی کیا بات ہے؟ بلکہ میں تو سمجھتی ہوں شکر کا مقام ہے ۔''

نعیمہ : ''کیوں ؟''

صالحہ : ''تم بتاؤ کہ تم نے کیا سمجھ کر افسوس کیا ۔''

نعیمہ : ''میں نے تو یہ سمجھ کر افسوس کیا کہ تم ہماری اماں کے یہاں ہوئی ہوتیں تو دونوں کو اچھا تھا ۔ ہماری اماں تمھی جیسی بیٹی ڈھونڈھتی ہیں اور تم بھی امیر گھر پاتیں تو کھانا ، کپڑا ، زیور ، نوکر ، سبھی طرح کی خوشی تھی ۔''

صالحہ : ''اگر اس خوشی کا یہی نتیجہ ہے کہ آدمی خدا کو بھول جائے تو میرے نزدیک یہ تمام فراغت ، دنیا کا جنجال اور آخرت کا وبال ہے ۔ کون چار دن کی خوشی کے واسطے ہمیشہ ہمیشہ کی مصیبت مول لے ۔ مجھ کو خدا کے فضل سے پیٹ بھر روٹی اور تن بدن ڈھانک لینے کو کپڑا ، رہنے کو مکان ، لیٹنے کو چارپائی ، پینے کو پانی ، دم لینے کو ہوا ، سب کچھ میسر ہے ۔ میں نہیں جانتی کہ مجھ کو دنیا میں کوئی اور چیز بھی درکار ہے ۔ سوائے اس کے کہ تم نے پتھر یعنی سونا چاندی مجھ سے زیادہ اپنے اوپر لاد لیے ہیں اور بوجھ کے صدمے سے کان تمھارے کٹے پڑتے ہیں ، ناک تمھاری چھے گئی ہے ، اور تو کوئی فرق میں تم میں اور اپنے میں نہیں پاتی ۔ میں یہ نہیں کہتی کہ خدا نہ خواستہ تم کو کھانے کی تکلیف ہے ، مگر صورت تمھاری یہ ہے کہ بدن پر بوٹی نہیں ، ہاتھ پاؤں میں جان نہیں ، ہرسال جلاب ، ہر مہینے فصد ،

آئے دن دوا ۔ مجھ کو دیکھو کہ خدا کے فضل سے تم سے دونی نہیں تو ڈیوڑھی میں شک بھی نہیں ۔ ایک ہاتھ سے تمھارے دونوں ہاتھ پکڑ لوں تو بیوی صاحب سے ہلا بھی نہ جائے ۔''

نعیمہ : ''بیماری بھی امیری کا تمغہ ہے ۔ نگوڑے بھوکے ، جن کے پیٹ کو روٹی میسر نہیں ، وہ کیا بیمار پڑیں گے''

صالحہ : ''یہاں تمغے اور خلعت کا مذکور نہیں ہے ، تکلیف اور آرام میں گفتگو ہے ۔''

نعیمہ : ''جی تو خوش کرلو ۔ لومڑی کو جب انگور نہیں ملتے تو وہ اُن کو کھٹا کہا کرتی ہے ۔''

صالحہ : ''اپنی اپنی سمجھ ہی تو ہے ۔ تم میرے تئیں جانتی ہو کہ یہ تکلیف میں ہے اور میں کہتی ہوں کہ تم ایسے عذاب میں مبتلا ہو کہ خدا دشمن کو بھی نصیب نہ کرے ۔ کھانے پینے کے عیش آرام جو تم کو میسر ہیں ، ان کا نتیجہ تو یہ ہے کہ تم سدا کی دکھیا اور ہمیشہ کی روگی بن رہی ہو ۔ رہا کپڑا ، کچھ تم ہی اس کو پہن کر اپنے جی میں خوش ہوتی ہوگی ۔ ابھی خالو جان یا بڑے بھائی آجائیں تو سوائے اس کے کہ تم ان کے سامنے سے ہٹ بیٹھو اور کیا تدبیر ہے ۔ رہا زیور جس کی زکوٰۃ نہ خیرات ؛ اس سے بیڑیاں بہتر ، طوق اور ہتکڑی اچھی ۔ بڑی خوشی محبت اور میل ملاپ کی ہوتی ہے ۔ اس کا یہ حال ہے کہ تم ماں سے بری ، حمیدہ کی دشمن ، ساس سسروں سے بگاڑ ، میاں سے ناموافقت ، نوکر شاکی ، لونڈیاں نالاں ۔ اسی پر تم اپنے تئیں

سمجھتی ہو کہ میں خوش ہوں ۔ ابھی تم پڑی رو رہی تھیں یا ہنس رہی تھیں ؟''

نعیمہ : ''سبحان اللہ آپ کیا آدمی ہیں ۔ کیا گھروں میں کبھی لڑائی نہیں ہوا کرتی ؟ چار برتن پاس رکھ دیتے ہیں تو وہ بھی کبھی نہ کبھی کھڑکھڑا اٹھتے ہیں ۔''

صالحہ : ''اگر ایسا ہی سمجھتیں تو اتنی بات کا بتنگڑ نہ بناتیں ۔''

نعیمہ : ''میں نے کیا بات کا بتنگڑ بنایا ؟''

صالحہ : ''تمھی اپنے دل میں سوچو ۔ ماں کے ہاتھ لگانے پر یہ آفت ۔ صبح سے اب تک آپ بھوکی مریں ، سارے گھر کو بھوکا مارا ۔ شاباش بوا ، شاباش ! لڑو ماں سے ، روٹھو خدا سے ۔''

نعیمہ : ''ہر پھر کر تم کو خدا کا تذکرہ کرنا ضرور ۔ بھلا میں کب خدا سے روٹھی ؟''

صالحہ : ''رزق خدا کا یا ماں باپ کا ؟''

نعیمہ : ''اللہ ری علامہ[٦] ! دیکھو تو ، کیسی ایچ پیچ کی باتیں کرنی آتی ہیں ۔''

---

٦ ۔ اردو محاورے میں یہ لفظ بے باک اور شوخ چشم عورت کے لیے بولا جاتا ہے ۔

صالحہ : ''تم کو پیچ و تاب[۷] کی باتیں آتی ھیں تو مجھ کو ایچ پیچ کی ۔''

نعیمہ : ''غصہ ھی تو ھے ۔''

صالحہ : ''اچھا غصہ ھے، باؤلا غیظ، دیوانہ غضب، ادھر بے جان پر اور ادھر بے زبان پر ۔''

نعیمہ : ''بے جان اور بے زبان کیا ؟''

صالحہ : ''کھانا بے جان اور بے زبان تمھارا بچہ نادان ۔ میں نے سنا ھے کہ تم نے اس کا بھی خوب کچلا کیا ۔''

نعیمہ : ''کیا تو کسی کو کیا ؟ اپنا بچہ شوق سے مارا، خوشی سے کچلا کیا ۔''

صالحہ : ''تم اپنے بچے کو شوق سے مارو اور خوشی سے کچلا کرو، پھر خالہ جان نے تم کو ایک تھپڑ ھو لے سے مارا تو کیا غضب ھوا ؟ جیسی تم اپنے بچے کی ماں، وہ تمھاری ماں ۔''

نعیمہ : ''ماں ماں برابر لیکن بچہ بچہ برابر نہیں ۔''

صالحہ : ''لیکن تم دونوں میں زیادہ تر واجب الرعایت کون ھے ؟''

---

۷ - صالحہ ایک مخلص، دین دار، ذھین اور طرار لڑکی ھے - نعیمہ کو سمجھانے کے لیے کبھی وہ دلیلوں اور مثالوں سے کام لیتی ھے، کبھی شگفتہ باتوں کے جادو سے اس کے غصے کا بھوت آتارتی ھے - یہاں اس کے مکالموں میں اس کی حاضر جوابی اور بذلہ سنجی، لفظی کھیل کی صورت میں نمایاں ھے ۔

نعیمہ : ''مَیں ''

صالحہ : ''مَیں کے گلے پر چھری ۔ کیسہ واجب الرعایت نکلی ، مَیں ۔ ذرا منہ تو دھو رکھو ۔''

نعمیہ : ''دیکھو بڑوں کے ساتھ بے ادبی ۔''

صالحہ : ''بڑوں نے کی تو چھوٹوں نے سیکھی ۔''

نعمیہ : ''اجی وہ کچھ بھی رعایت میرے ساتھ نہ کریں ۔ اللہ مالک ہے ۔''

صالحہ : ''کیوں جھوٹ بولتی ہو ۔''

نعمیہ ۔ ''بس سب کچھ کہنا ، جھوٹی نہ کہنا ۔ اس کی مجھ کو بڑی چڑ ہے ۔ جو کوئی مجھ کو جھوٹی کہتا ہے تو میرے تن بدن میں آگ ہی تو پھک جاتی ہے ۔''

صالحہ : ''بھلا پھر تم اللہ کو مالک سمجھتی ہو جو کہتی ہو ؟''

نعیمہ : ''کوئی ایسا بھی بندہ بشر ہے جو اللہ کو مالک نہیں سمجھتا ؟''

صالحہ : ''اللہ کو مالک سمجھتیں تو ایسی بے جا بات بول آٹھتیں جس پر خالہ جان خفا ہوئیں اور بجا خفا ہوئیں ۔''

نعیمہ : ''کیا میں نے جان بوجھ کر تھوڑی ہی کہی تھی ۔ منہ سے نکل گئی ۔''

صالحہ : ''لیکن کبھی خالو جان کی شان میں تو ایسی بات تمھارے منہ سے نہیں نکلتی - بلکہ خالو جان تو خیر، شاید بڑے بھائی جان کو بھی ایسا سخت کلمہ کہو تو ان کو کتنا برا لگے گا - کیا خدا کو برا نہ لگا ہوگا ؟''

یہ سن کر نعیمہ کسی قدر ڈری اور اس نے ہولے ہولے اپنے کلوں پر طانچے مارے اور منہ سے بھی توبہ توبہ کہا -

صالحہ : ''بس سمجھ لو کہ ایسا ہی ایک طانچہ خالہ جان نے مارا سہی -''

نعیمہ : ''تو میں کیا کچھ کہتی ہوں یا میں نے کچھ کہا ؟''

صالحہ : ''اے کاش تم سب کچھ کہہ لیتیں اور یہ ستم نہ کرتیں -''

نعیمہ : ''کیا ؟''

صالحہ : ''سارے دن گھر بھر کو بھوکا مارا - بچہ تمام دن دودھ کو پھڑکا - بیدارا بے چاری، وہ سہ درے میں پڑی پڑی ہائے ہائے کر رہی ہے - نہیں معلوم کہاں اس کے بے موقع لات لگی ہے کہ اب تک اس کا سانس[8] پیٹ میں نہیں سمایا - اور پھر کہتی ہو کیا کیا -''

نعیمہ : ''خیر اب تو جو کچھ ہونا تھا ہو چکا -''

صالحہ : ''ہو تو نہیں چکا، ہو رہا ہے - لوگ

---

۸ - سانس کو مذکر بھی بولتے ہیں اور مونث بھی - دونوں طرح جائز ہے -

بھوکے بیٹھے ہیں ۔ بچہ پھڑکے چلا جاتا ہے ۔''

نعیمہ : ''اچھی ، کچھ یہ بھی زبردستی ہے ۔ ماروں اور رونے نہ دوں ۔''

صالحہ : ''تم کو اتنی بڑی ہو کر رونے کا نام لیتے ہوئے شرم نہیں آتی ؟''

نعیمہ : ''جب مار کھانے کی غیرت نہ ہوئی تو رونے میں کیا شرم تھی ۔''

صالحہ : ''ماں ہوئی ، استانی ہوئی ، اگر ان کی مار کھانا بے عزتی ہے تو دنیا بے عزت ہے ۔''

نعیمہ : ''تم کو مار پڑی ہوتی تو جانتیں کہ عزت کی بات ہے یا بے عزتی کی ۔''

صالحہ : ''استانی جی کی مار کی تو کوئی گنتی ہی نہیں ۔ اماں جان نے بھی مجھ کو کوئی بیسیوں ہی دفعہ مارا ہوگا ۔''

نعیمہ : ''اب بڑے ہوئے پر ؟''

صالحہ : ''اب میں کوئی بات ہی ایسی نہیں کرتی کہ ان کے خلاف مزاج ہو ۔''

نعیمہ : ''میں نے بھی تو یہ سمجھ کر نہیں کہا تھا کہ اماں جان کو اتنا برا لگے گا اور نہ کبھی پہلے اماں جان کو نماز روزے کا ایسا خیال ہوا جیسا کہ اب ہے ۔''

صالحہ : ''لیکن جب تم کو خالہ جان کئی مرتبہ

روک چکی تھیں تو تم کو ان کی ممانعت کے خلاف پھر وهی بات نہیں کہنی چاهیے تھی ۔"

نعیمه : "کیوں جی ، خدا کو میری بات بری لگتی تو جو کچھ هونا تھا اسی وقت هو نه چکتا ؟"

صالحه : "پہلے یه تو بتاؤ که بات بے جا اور بری تھی یا نہیں ؟"

نعیمه : "خیر بری هی سہی ۔"

صالحه : "سہی کیا معنی ، شدت سے بری اور بے جا تھی که تم اپنے بھائی تک کو ایسا کلمه نہیں کہه سکتیں ۔ ایسی هی باتوں کا نام کفر اور شرک ھے ۔ مگر اس سے که تم کو فوراً سزا نہیں ملی ، خوش نہیں هونا چاهیے ۔ خدا کی لاٹھی میں آواز نہیں ۔ عجب کیا ھے که ایسی هی باتوں کا وبال تم کو گھر میں بسنے نہیں دیتا ۔"

نعیمه : "اماں مجھ کو تنہائی میں مار لیتیں تو مجھ کو اتنا رنج نه هوتا ۔"

صالحه : "سبحان الله ۔ خطا به بازار و سزا در پس دیوار[۹] ۔"

نعیمه : "اچھا پھر اب تمھاری مرضی کیا ھے ؟"

صالحه : "مرضی یه ھے که چل کر خاله جان کے روبرو هاتھ جوڑو ۔ ان کے پاؤں پڑو ۔ اپنا قصور معاف

۹ - خطا سرِ بازار هو اور سزا دیوار کی آڑ میں (یعنی اگر خطا اعلانیه کی جائے تو اس کی سزا بھی علانیه ملنی چاهیے) ۔

کراؤ ۔ کھانا آپ کھاؤ ، دوسروں کو کھانے دو ۔ بچے کو دودھ پلاؤ ۔ حمیدہ کو بلا کر گلے لگاؤ ۔ بیدارا کی دلدھی اور تشفی کرو ۔''

نعیمہ : ''لو اور سنو ۔ اُلٹا چور کوتوال کو ڈانٹے۔ میں ھی پٹوں اور میں ھی ھاتھ بھی جوڑوں ۔ اور اگر میرا قصور ھوتا بھی تاھم ھاتھ تو بندی نے نہ آج تک کسی کے آگے جوڑے اور نہ اب مجھ سے جوڑے جائیں ۔ رھی حمیدہ ، تم کہتی ھو گلے لگاؤ اور میرا بس چلے تو اُس کو جیتا نہ چھوڑوں ۔ اور کھانے کی جو تم نے کہی تو مجھ کو اب اس گھر کا نمک تک چکھنا حرام ھے ۔ غرض جتنی باتیں تم نے کہیں ، سوچ کر ایسی ھی کہیں کہ ایک بھی مجھ سے شدنی نہیں ۔ خیر، تمھاری خاطر سے ننھے کو دودھ پلاؤں گی ۔ جاؤ کہیں سے لے آؤ ۔ ورنہ ارادہ تو یہی تھا کہ اس کا اور اپنا دونوں کا خون کردوں ۔''

صالحہ : ''اللہ اکبر بی آپا ، میں نہیں جانتی تھی کہ تمھارا غصہ اس قدر غضب کا بجھا ھوا ھے ۔''

نعیمہ : ''میرا مزاج تو سدا سے اسی طرح کا ھے ۔ مجھ سے کسی کی بات کی برداشت نہیں ھوتی ۔''

صالحہ : ''اب تم سے زیادہ کہنا لاحاصل ھے ۔ بس معلوم ھو گیا کہ تم اپنی خوشی کی ھو ۔''

نعیمہ : ''جو بات کرنے کی تھی وہ تو میں نے پہلے ھی کہہ دی کہ ننھے کو دودھ پلا دوں گی ۔''

صالحہ : ''تمام دن تو تم کو بے آب و دانہ گزر گیا

اور عمر بھر کے بدلے کا تم نے ایسا لمبا روزہ رکھا ہے کہ
پھر رات گزری مگر افطار ہونے نہیں آیا ۔ اور نہ ابھی کچھ
اس کے افطار ہونے کی امید ہے ۔ تو وہ دودھ رہا کہاں
ہوگا کہ تم ننھے کو پلاؤگی ۔''

نعیمہ : ''رہے یا نہ رہے مگر میں اس گھر کا کھانا
کھاؤں تو حرام کھاؤں ، مردار کھاؤں ۔''

صالحہ : ''پھر آخر کروگی کیا ؟ یہ تو ممکن نہیں
کہ بے کھائے گزر ہو ۔ ایک ھی وقت میں ، دیکھو ، تمھارا
کیا حال ھو گیا ہے ۔ اب رات کو خالی پیٹ نیند بھی نہیں
آئے گی ۔''

نعیمہ : ''میں تو جانے کو تیار بیٹھی ہوں ۔ تم نہ
آجاتیں تو اب تک کبھی کی چلی بھی گئی ہوتی ۔''

صالحہ : ''کہاں ، سسرال ؟''

نعیمہ : ''اگر میں سسرال جاؤں تو گڑھے سے نکلوں اور
کنوئیں میں گروں ۔''

صالحہ : ''پھر کہاں ؟''

نعیمہ : ''جہاں سینگ سمائیں ۔''

صالحہ : ''باؤلی ہوئی ہو ۔ کیسی باتیں کرتی ہو ۔
اگر خالو جان یہ بات سن پائیں ، نہیں معلوم کیا آفت برپا
کریں ۔ اور گھر سے باھر قدم نکالنا تو بڑی بات ہے ۔''

نعیمہ : ''تم کیا سمجھیں ؟ میں اس ھمسائی کے یہاں

جانے کو کہہ رہی ہوں ۔ کیا یوں ہر روز میں ہمسائی کے گھر نہیں جاتی ہوں ؟''

صالحہ : ''وہ جانا اور ہے اور گھر سے لڑ کر بے حکم پاؤں باہر نکالنا دوسری بات ہے ۔ خبردار ، ایسا بھول کر بھی منہ سے مت نکالنا ؛ نہیں معلوم کیا سے کیا ہو جائے گا ۔ اور خود ہمسائی ، جن کے برتے پر بھولی ہو ، تم کو اپنے دروازے کے اندر قدم تو رکھنے دینے ہی کی نہیں ؛ چاہو جا دیکھو ۔ اور فرض کیا کہ تم یہاں سے نکلنے پائیں ، اور ہمسائی کی بھی ایسی ہی شامت آئی ہے ، اور انھوں نے تم کو گھر میں آنے دیا تو ان کو خود دو دو وقت کھانا میسر نہیں آتا ، تم کو کہاں سے کھلائیں گی ؟''

نعیمہ : ''نوج میں ان کے یہاں کیوں کھانے لگی ۔ کیا میرے پاس زیور نہیں ؟ ابھی تو پٹاری میں کچھ نہ ہوگا تو نقد چالیس پچاس روپے پڑے ہوں گے ۔''

صالحہ : ''گڑ کھاؤں گلگلوں سے پرہیز ۔ جن کا کھانا انھیں کا بنوایا ہوا زیور ، انھیں کے دیے ہوئے روپے ۔ آن تو جب جانیں کہ ان کی چیز بھی صرف نہ کرو ۔ اور ہمسائی ، اول تو میں حیران ہوں ، تم کو بٹھاتیں تو کہاں بٹھاتیں ۔ کلھیا جتنا گھر ؛ اس میں بھی ایک آپ ، ایک میاں ، تین بیٹے ، بہویں ، ان کے بچے ، دو بیٹیاں مہمان آئی ہوئی ہیں وہ ۔ ان کے گھر میں تل رکھنے کی جگہ تو ہے ہی نہیں ۔ بے چاری آپ تو ڈیوڑھی میں چارپائی بچھا کر سوتی ہیں ؛ تم کو رات کے وقت کہاں لٹاتیں اور کہاں سلاتیں ؟ اور تم کو غیر مردوں میں جاتے ہوئے شرم نہ

آتی ؟ اور پھر همسائی تم کو پناہ دیتیں بھی تو خالہ جان هی کا پاس کر کے ۔ غرض قربان جائیے تمھاری عقل کے ! تدبیر بھی سوچی تو اوندھی ، علاج بھی تجویز کیا تو اُلٹا ۔ اس سے بہتر تھا کہ تم سسرال چلی جاتیں ۔''

نعیمه : ''نه سسرال جاؤں ، نه یہاں کھاؤں ۔''

صالحه : ''تم کو اختیار هے ، جو چاهو سو کرو ۔ لیکن کیا لڑائی تمھارے کھانے پر هوئی هے ؟''

نعیمه : ''کھانے پر تو لڑائی نہیں هوئی لیکن میں اف کے گھر پر یوں نه پڑی هوتی تو مجال تھی که کوئی مجھ کو هاتھ لگا لیتا ۔''

صالحه : ''کرتیں کیا ؟''

نعیمه : ''برابر سے میں بھی مارتی ۔''

صالحه : ''برا مت ماننا ، یہی نیت هے تو تم گھر میں بس چکیں ۔ ماں کا یه وقر ، یه ادب ! مجھ کو تو اگر میری اماں جان بے خطا ، بے قصور ، جوتیوں پر جوتیاں مار لیں تو ان شاءالله آنکھ بھی ان کے سامنے نه کروں ۔ اور دنیا جہان کی بیٹیوں کا یہی قاعدہ ، یہی دستور هے ۔ تم ان کی بیٹی ، وہ تمھاری ماں ، کسی کو تمھارے معاملے میں کیا دخل ۔ مگر آپا جان ، دین تو گیا هی گزرا هوا ، یه لچھن دنیا میں بھی خوش اور آباد رهنے کے نہیں ۔ اور خدا تم کو اتنی سمجھ دے که تم انھی باتوں کو اپنی خانه ویرانی کا سبب سمجھو۔ مجھ کو حیرت هے که کیوں کر یه بات تمھارے دل نے

تسلیم کی کہ خالہ جان کو تمھارا رھنا ناگوار ھے اور انھوں نے اس وجہ سے تمھارے ساتھ سختی کی کہ وہ تم کو اپنے پاس دیکھ نہیں سکتیں ۔ بھلا دنیا میں کوئی ماں بھی اس طرح کی ھوگی ؟ تمھاری خانہ ویرانی کا رنج تم سے زیادہ ان کو ھے ۔ ذرا اس کا مذکور آ جاتا ھے تو ان کے آنسو نکل پڑتے ھیں اور حاضر غائب دعا کیا کرتی ھیں کہ الٰھی میری نعیمہ کو اس کے گھر آباد کر ۔ بھلا تم ھی انصاف کرو کہ سوائے اس بات کے ، تم نے ان کی کسی بات سے بھی ان کا رخ بدلا ھوا پایا ۔ کھانے میں ان کو یہ اھتمام رھتا ھے کہ پہلے تم اور پیچھے وہ ۔ اور میں نے ھفتوں رہ کر دیکھا ھے ، خالو جان اور بڑے بھائی تک کو سادی چپاتیاں ملتی ھیں اور تمھارے دو پراٹھے انھوں نے ناغہ نہیں ھونے دیے ۔ چار پیسے روز کا سودا جو تمھارا سدا کا معمول ھے ، تمھی بتاؤ ، کبھی نہیں بھی دیا ؟ ایک دن حمیدہ نے ضد کی تھی اور کہا تھا کہ میں بھی چار پیسے لوں گی ، تو جھڑک دیا کہ ھاں اب تو بڑی بہن کی برابری کرے گی ۔ آٹھویں دن کی مہندی ، مہینے کے مہینے چوڑیاں ، تم ھی بولو ، یہ دستور کبھی قضا ھوا ھے ؟ کپڑے لوگ ایسے جہیز میں بھی نہیں دیتے جو وہ تم کو گھر میں پہناتی ھیں ۔ بھلا بے گوٹے کا دوپٹہ بے پیمک کا پائجامہ ، کبھی تم کو پہننا یاد ھے ؟ تیل ، عطر ، پان ، پھول ، مہندی ، سرمہ ، مسی ، لاکھا ، مجنٹن ، اور اُبٹنا ، یہی عورتوں کی ضرورت کی چیزیں ھیں ۔ سچ کہنا ، تم کو کبھی ان میں سے کسی چیز کے مانگنے کی ضرورت ھوتی ھے ؟ خدمت کو لونڈی جدا ، لڑکے کی کھلائی الگ ۔ بلکہ سچ پوچھو تو کنوار پنے سے کہیں زیادہ قدر

ہوتی ہے ۔ خالہ جان ایک دن تمہارے دوپٹے میں بیٹھی توئی ٹانک رہی تھیں ۔ خالو جان کی قبا میں بند ٹانکنے تھے ۔ کچہری جانے کو دیر ہوتی تھی ۔ اس پر خالو جان نے کہا بھی کہ لڑکی کا دوپٹہ رہنے دو، پھر ہو رہے گا ، پہلے میری قبا میں بند ٹانک دو ۔

خالہ جان : ''واہ ، لڑکی سر کھولے بیٹھی ہے ، تم کو ایسی کیا جلدی ہے ۔ ابھی تو دھوپ بھی چبوترے سے نہیں اتری ۔''

خالو جان : ''کیا سادہ دوپٹہ اوڑھنا منع ہے ؟''

خالہ جان : ''وہ بے چاری کیا کچھ کہتی ہے ۔''

خالو جان : ''تو تم اپنی ہی طرف سے خیرخواہی کے اہتمام میں لگی رہتی ہو ۔''

خالہ جان : ''میں ہوں کس قابل ، مگر خیر جو کچھ ہو سکتا ہے کیے جاتی ہوں ۔ مجھ کو ہر وقت اس بات کا خیال لگا رہتا ہے کہ اس کا دل ہے غم زدہ ، ایسا نہ ہو کہ کسی چیز کو اس کی طبیعت چاہے اور یہ لحاظ کے مارے منہ سے نہ کہہ سکے اور ارمان جی کا جی ہی میں رہ جائے ۔''

اگر خالہ جان کو تمہارے ساتھ عداوت تھی تو خود کھانا کھا لیتیں ۔ دشمن کا یہی کام ہے کہ فاقے میں ساتھ دے اور شریک مصیبت ہو ؟ وہ حمیدہ ، جس کو تم کہتی ہو کہ پاؤں تو مار مار کر پرزے اڑاؤں ، آج دن بھر اس

کو تمھارے واسطے روتے گزرا ہے ۔ یہ عمر اور اتنا صبر کہ صبح سے اب تک دانہ اس کے منہ میں نہیں گیا ۔ نگوڑی ایسی بے سدھ پڑی ہے کہ گویا جان نہیں ۔ ان لوگوں کا وہ حال اور تمھاری یہ کیفیت ۔ ایک ذرا سی بات میں تمھارا دل اس قدر بھر گیا کہ ساری نیکی برباد ، کل سلوک اکارت ، تمام احسان غارت ۔ پھر بھلا تم سے کوئی کیا توقع رکھے اور کس امید پر تم سے ملے ؟"

نعیمہ : "بھائی یہ بات تو تمھاری واجبی ہے کہ ہمیشہ سے اماں جان مجھ کو بہت چاہتی ہیں لیکن خدا جانے کہ ان کو کیا ہو گیا تھا کہ بے تحاشا مار بیٹھیں ۔"

صالحہ : "اچھا پھر یوں ہی سمجھو کہ آدمی ہی تو ہیں ، انھی سے زیادتی ہو گئی سہی ۔ لیکن کیا انصاف ہے کہ اس ایک زیادتی کی وجہ سے ان کی عمر بھر کی مہربانی اور شفقت اور عنایت اور رعایت اور دل سوزی اور ہمدردی اور خیرخواہی اور پرورش اور نفع رسانی ، ایک دم سے سب پر پانی پھیر دیا جائے ۔"

نعیمہ : "مجھ کو رہ رہ کر ان کا تھپڑ کم بخت یاد آتا ہے ۔"

صالحہ : "اس واسطے کہ تم نے ان کے حقوق بھلا رکھے ہیں ۔"

نعیمہ : "کیا اماں جان نے تم سے کہا ہے کہ سمجھا بجھا کر نعیمہ کو خطا معاف کرانے کے لیے بلوا لاؤ ۔"

صالحہ : "ہرگز نہیں ۔ ان کو تمھاری خطا معاف کرنے

کی کیا ضرورت ہے۔ نقصان تمہارا ہے یا ان کا؟ اور شاید ان کے دل میں یہ بات آئی بھی ہو تو تمہارے مزاج کو دیکھ کر بھلا ان کو یہ توقع ہو سکتی ہے کہ تم خطا کا اقرار اور معافی کی درخواست کروگی؟''

نعیمہ : ''بھلا اور جو میں گئی اور اماں جان منہ سے نہ بولیں تو مجھ کو اور شرمندگی ہوگی۔''

صالحہ : ممکن ہے نہ بولیں، کیوں کہ تمہاری خطا معمولی طور کی خطا نہیں ہے۔ مگر پھر وہ ماں ہیں اور ماں بھی کیسی ماں، بچوں پر اور خصوصاً تم پر دل سے فدا، جان سے قربان۔ شاید تم کو کوٹھری سے نکلتا ہوا دیکھ، عجب نہیں کہ دوڑ کر خود لپٹ جائیں اور تم کو منہ سے کہنے کی بھی نوبت نہ آئے۔''

نعیمہ : ''جی تو چاہتا ہے کہ جاؤں چلی بھی جاؤں مگر شرم آتی ہے۔ بھلا کل پر رکھیں تو کیسا؟''

صالحہ : تم کو خدا کا ترس نہیں آتا کہ سارا گھر فاقے سے ہے۔ رات بھر میں تمہارا اور ان سب کا کیا حال ہوگا۔''

نعیمہ : ''بھائی ہاتھ جوڑنے کو تو رہنے دو؛ کھانا اپنے نام سے منگوا بھیجو۔''

صالحہ : ''اجی مجھ سے کہو تو میں کھانے کو بھی رہنے دوں۔ بھوکی مروگی تم یا تمہاری ماں بہنیں۔ مگر بے صفائی کھانے کا لطف نہیں۔ ادھر تم افسردہ، ادھر وہ

آزردہ؛ کھانا کیا خاک کھایا جائے گا - بس اتنی دیر کی بات ہے کہ تم کوٹھری کے باہر تک چلو -''

نعیمہ : ''بھائی بس ، زیادہ ہم کو دق مت کرو - کھانا منگواؤ ، میں کھالوں گی -''

صالحہ : ''ہو تم اپنی ضد کی - کھانا کھاؤگی تو کس پر احسان کروگی - کوٹھری کے باہر تک چلو تو البتہ میں جانوں کہ تم کو میری خاطر عزیز تھی -''

نعیمہ : ''چلو بس ، مجھ کو بچوں کی طرح مت پھسلاؤ- یہ بھی تمھاری خاطر ہے کہ میں من گئی - ورنہ نعیمہ بندی ، ادھر کی دنیا اُدھر ہو جاتی ، ایک کی تو سنتی ہی نہیں -''

صالحہ : ''خاک مَن گئیں ، پتھر مَن گئیں - میں اس کو مَننا مَنانا نہیں سمجھتی - کیا کروں ، رات زیادہ گزر گئی اور لوگ بھوک سے بد حواس ہیں ورنہ تم کو یہ دعویٰ ہے کہ میں کسی کی نہیں سنتی اور میرا یہ عقیدہ ہے کہ بات واجبی ہو تو کیا معنی کہ سننے والا اس کو تسلیم نہ کرے - اور دیکھو ، میری اس وقت کی بات یاد رکھنا کہ تم کو خالہ جان کے آگے ہاتھ جوڑنے پڑیں گے -''

نعیمہ : ''خیر جب پڑیں گے تب جوڑ بھی لیں گے -''

اس کے بعد صالحہ کوٹھری سے نکل دوسرے قطعے میں خالہ کے پاس گئی - بہت سے لوگ سو گئے تھے ، کچھ اونگھ رہے تھے - فہمیدہ اکیلی بیٹھی ہوئی دل ہی دل میں نہیں معلوم کیا باتیں کر رہی تھی کہ صالحہ جاتے

کے ساتھ ھی بولی : ''خالہ جان، مبارک۔ میرا اور آپا جان کا کھانا دیجیے۔''

فہمیدہ سنتے کے ساتھ چونک سی پڑی اور کہنے لگی سچ کہو !''

بھانجی : ''آپ خود ان کو کھاتے ہوئے دیکھ لیں تب تو سہی۔''

خالہ : ''بھائی، تم نے تو کمال ھی کیا۔ کیوں کر منایا، کس طرح سمجھایا ؟ مجھ کو تو امید نہ تھی کہ وہ کسی ڈھب سے سیدھی ھوگی۔ اس کا غصہ ھے، خدا کی پناہ، جیسے کسی کو جن چڑھتا ھے۔ نہیں معلوم تم نے کیا سحر کیا کہ ایسے بھوت کو اتارا۔ ھم سب لوگ تو دن بھر ھلاک ھوئے، کوئی حکمت نہ چلی، کوئی تدبیر پیش رفت نہ ھوئی۔''

صالحہ : ''میں تو ان کو یہاں آپ کے پاس لاتی اور آپ کے پاؤں پر ان کا سر رکھوا دیتی، لیکن کیا کروں رات زیادہ گئی اور لوگ بھوک سے بے تاب ھیں۔ خیر، ان شاءاللہ بشرط خیریت پھر دیکھا جائے گا۔ لائیے کھانا نکالیے۔ اور جاؤں حمیدہ کو بھی جگاؤں، ھشیار کروں، کہ اس کا تو اور بھی برا حال ھوا ھوگا۔''

خالہ نے کھانا نکالا اور صالحہ نے جا حمیدہ کو اٹھا بٹھایا۔ حمیدہ سوتی کیا تھی، ضعف و ناتوانی کی غفلت میں پڑی ھاتھ پاؤں توڑ رھی تھی۔ صالحہ کی آواز سنتے ھی آنکھ کھولنے سے پہلے کھڑی ھو گئی اور بڑی بہن کو سلام

کیا ۔ صالحہ نے پیار سے گلے لگا گودی میں لے لیا اور کہا : ''حمیدہ ، اس قدر سویرے تم سو رہا کرتی ہو ؟''

حمیدہ : ''اماں جان سے پوچھ لیتی ہوں اور جب وہ کہہ دیتی ہیں کہ ہاں وقت آگیا تو نماز عشاء پڑھ کر سو رہتی ہوں ۔''

صالحہ : ''تم نے کچھ کھانے کو بھی کھایا ؟''

حمیدہ شرمندہ ہو کر چپ ہو رہی ۔

صالحہ : ''بھوک لگی ہے ؟''

حمیدہ نے اس کا بھی کچھ جواب نہ دیا ۔

صالحہ : ''چلو ہم تم کھانا کھائیں ۔''

حمیدہ : ''ہماری اماں جان نے کھانا کھایا ؟''

صالحہ : ''اماں جان بھی تمہارے ساتھ کھائیں گی ۔''

حمیدہ : ''اور ہماری آپا جان ؟''

صالحہ : ''تم کو دنیا جہان سے کیا مطلب ۔ جس کو بھوک لگی ہوگی آپ کھائے گا ۔

حمیدہ : ''ہے ہے ، آپا جان نہ کھائیں اور میں کھالوں ؟ اچھی ! خدا کے لیے تم کسی طرح آپا جان کو سمجھاؤ ۔ آج انہوں نے تمام دن کچھ نہیں کھایا ۔ ننھا دودھ کے لیے پھڑک پھڑک کر آخر سو گیا ۔'' یہ کہہ کر حمیدہ رونے لگی تو صالحہ نے اس کو تشفی کی کہ حمیدہ روؤ مت ،

آپا بھی کھائیں گی ۔

غرض کوئی ڈیڑھ پہر رات گئے سب نے کھانا کھایا؛ صالحہ اور نعیمہ نے ایک ساتھ کوٹھری میں اور باقی سب لوگوں نے اپنے اپنے دستور کے مطابق ۔ کھانا کھانے کے بعد سو سلا رہے ۔ مگر صالحہ اور نعیمہ میں کچھ گفتگو کھانے کے بعد بھی ہوئی ۔ خود ہی نعیمہ بولی : ''کیوں صاحب ! اب تو آپ خوش ہوئیں ۔ جو کچھ تم نے کہا، میں نے کیا ۔''

صالحہ : ''خوش تو میں تب ہوتی کہ جب صفائی ہو گئی ہوتی ۔''

نعیمہ : ''اچھی ، اب بھی صفائی میں کچھ باقی رہ گیا ۔ رفتہ رفتہ دس پانچ دن میں بول چال بھی ہونے لگے گی ۔''

صالحہ : ''دس پانچ دن ؟''

نعیمہ : ''اور کیا کل ؟''

صالحہ : ''ابھی تھوڑی دیر ہوئی کہ تم نے خود کہا تھا کہ کل پر رکھو ۔''

نعیمہ : ''میں نے تو یہ نہیں کہا تھا کہ میں کل بولنے بھی لگوں گی ۔''

صالحہ : ''تو خاک بھی صفائی نہیں ہوئی ۔''

نعیمہ : ''کھانا میں نے کھایا ، اماں جان نے کھایا ، حمیدہ نے کھایا ۔ ننھا دیکھو دودھ پی رہا ہے ۔ اس سے بڑھ کر صفائی کیا ہوگی ؟''

صالحہ : ''خیر ، میری زبردستی سے تم سب نے ایک ایک دو دو نوالے کھا لیے ۔ میں اس کو کھانا نہیں سمجھتی۔ دودھ پلانے والی عورت ، بھلا کچھ نہ کھائے تب بھی چار چپاتیاں تو کھائے ۔ تم نے پاؤ ٹکڑا بھی نہیں کھایا ، چاولوں کو ہاتھ نہیں لگایا ۔ تمھارے سبب میں بھی بھوکی اٹھ کھڑی ہوئی ۔ سمجھتی تھی کہ خیر صبح کو اس کی کسر نکل جائے گی ، سو تم نے ابھی سے امید توڑ دی ۔''

نعیمہ : ''سچ تو یہ ہے کہ اب اس گھر میں مجھ کو اپنا گزر ہوتا ہوا معلوم نہیں ہوتا اور اب میرا جی لگنا بھی مشکل ہے ۔''

صالحہ : ''کیوں ؟''

نعیمہ : ''میں نے تم سے کہا نہیں کہ یہاں تو ایک مہینے پہلے سے ابا کا مزاج ، اماں کے تیور ، گھر کا رنگ ڈھنگ ، سب کچھ بدلا ہوا ہے ۔ گو مجھ سے ابھی تک نماز روزے کا تذکرہ نہیں کیا لیکن بکرے کی ماں کب تک خیر منائے گی ۔ جب بڑے بھائی تک نوبت پہنچ گئی تو بھلا میں بے چاری کس گنتی میں ہوں ۔ وہ ، اللہ رکھے ، اول تو مرد ، دوسرے سب میں بڑے ، تیسرے خدا کے فضل سے چنداں ان کے محتاج و دست نگر بھی نہیں ۔ آج الگ ہو جائیں تو ان کی پلاؤ کی رکابی کہیں نہیں گئی ۔ جس رجواڑے میں جا کھڑے ہوں گے ، اپنی شاعری کے ہنر سے مصاحب یا ناظم یا چکلہ دار ہو جائیں گے ۔ میں بدنصیب ایک تو پردے میں بیٹھنے والی ، دوسرے ایسا کوئی ہنر نہیں آتا کہ چار پیسے کا سہارا ہو ۔ اس روز بد کی کیا خبر

تھی ورنہ آنکھوں دیکھتے دیکھتے ساتھ والی لڑکیاں کیسے کیسے کام سیکھ گئیں، کہ ہنر کی بدولت گھر بیٹھے بادشاہت کر رہی ہیں ۔ مجھ کو کہیں اپنا ٹھکانا نظر نہیں آتا ۔ ماں باپ کے گھر ایسی پڑی ہوں جیسے گلی میں کتا ۔ خدا واسطے کو کسی نے ٹکڑا ڈال دیا تو کھا لیا ورنہ میرا کیا زور اور کون دعویٰ ۔ ابا جان تو پہلے ہی سے کچھ واسطہ و سروکار نہیں رکھتے ۔ لڑکیوں سے بولنے اور بات کرنے کی ان کی عادت نہیں ۔ اماں جان کا ایک سہارا تھا ، سو انھوں نے ایسی دست درازی شروع کی کہ اب خدا ہی ان کے ہاتھ کو روکے گا تو رکے گا ، ورنہ چھوٹنا تو ہے ہی ۔''

صالحہ : ''آپا ، تم اس قدر بے دل کیوں ہوتی ہو ۔ کیا نماز کچھ ایسا بڑا مشکل کام ہے کہ اس کی وجہ سے یہ تمام دقتیں تم کو پیش آتی ہوئی معلوم ہوتی ہیں ؟''

نعیمہ : ''بوا ، میں تو ہنسی دل لگی کی آدمی ہوں ؛ بھلا مجھ سے یہ اونگھتی ، اداس زندگی کاہے کو نبھے گی ۔ لڑائی تو خیر آج ہوئی ہے ، میرا تو کئی دن سے جی گھبرا رہا تھا ۔''

صالحہ : ''پھر آخر تم نے تدبیر کیا سوچی ہے ؟''

نعیمہ : ''ایک بات میری سمجھ میں آتی ہے ، وہ یہ کہ میں تمھارے یہاں چلی جاؤں ۔''

صالحہ یہ سن کر چپکی ہوئی اور دیر تک چپ رہی ، تو نعیمہ بولی : ''تم تو سن کر ایسا دم بہ خود ہوئیں کہ گویا میں سچ مچ تمھارے گھر جا رہی ہوں ۔ ڈرو مت ۔

میں نے تو تمھاری محبت آزمانے کے لیے ایک بات کہی ، ورنہ میں کہیں آؤں نہ جاؤں ۔ یہ تو کیا اس سے بھی زیادہ مصیبت ہو تو میں دوسروں کا احسان نہ اٹھاؤں ۔"

صالحہ : "یہ تو تم نے کوئی نرالی ادا سیکھی ہے : چھیڑ چھیڑ کر لڑنا ۔ گھر جیسے میرا ، ویسے تمھارا ۔ جن کا گھر ہے میں ان کی بیٹی اور تم بیٹیوں سے بڑھ کر ۔ جاؤگی تو اپنی خالہ کے گھر جاؤگی اور احسان اٹھاؤگی تو اپنی خالہ کا اٹھاؤگی ۔ میں تم کو لے جانے والی کون اور منع کرنے والی کون ؟"

نعیمہ : "اچھا تو میں پوچھتی ہوں ، اگر میں چلی جاؤں تو خالہ جان کیا کہیں گی ؟"

صالحہ : "جو میں کہتی ہوں ، جو تمھاری اماں کہتی ہیں ، وہی تمھاری خالہ جان کہیں گی ، وہی ہر شخص کہے گا جو سنے گا ۔ کیا خالہ جان دنیا جہان سے باہر یا انوکھی ہیں ؟"

نعیمہ : "اجی گھر سے تو نہ نکال دیں گی ؟"

صالحہ : "یہاں تم کو گھر سے کوئی نکال رہا ہے جو وہاں سے خدا نہ خواستہ نکال دے گا ۔ آپا ، نہیں معلوم تم اب کیسی باتیں کرنے لگی ہو ۔ ایک اماں سے کیا لڑیں ، سارے کنبے کو دشمن ٹھہرا لیا ۔"

نعیمہ : "لیکن خالہ جان بے چاری غریب آدمی ہیں ؛ کہاں سے میرا خرچ اٹھائیں گی ؟"

صالحہ : ''اب ایسی بھی گئی گزری ہوئی نہیں ہیں کہ مہینے بیس دن تم کو نہیں رکھ سکتیں ۔''

نعیمہ : ''مہینہ بیس دن کیسا ، میں تو ساری عمر کے لیے جاتی ہوں ۔''

صالحہ : ''خدا نہ کرے کہ ساری عمر خالہ کے یہاں پڑی رہو ۔ اللہ تم کو اپنے گھر آباد کرے اور تمھاری ماں کا کلیجہ تم سے ٹھنڈا ہو ۔''

نعیمہ : ''میں بھی یہی سوچ کر جاتی ہوں کہ چند روز وہاں رہوں گی تو اماں جان کو بھی لڑائی جھگڑے کی باتیں بھول بسر جائیں گی ۔ پھر بلوا بھیجیں گی تو چلی آؤں گی ۔''

صالحہ : ''میرے نزدیک بھی جانے میں کچھ قباحت کی بات نہیں مگر اپنی اماں جان سے اجازت لے لو ۔''

نعیمہ : ''کیوں کر پوچھوں ؟''

صالحہ : ''یہ بھی کوئی بڑا کام ہے ۔ ابھی ان کے پاس چلی جاؤ اور جا کر کہو کہ میں خالہ جان کے یہاں جاتی ہوں ۔ وہ کہہ دیں گی 'اچھا' ۔''

نعیمہ : ''سچ کہنا ، کہیں چلی نہ جاؤں ۔ اتنا کام تم نہیں کر دیتیں ؟''

صالحہ : ''نہیں ، میں نہیں کرتی ۔''

نعیمہ : ''ہماری بہن نہیں ؟''

صالحہ : ''نہیں ، میں بہن نہیں بنتی - بیوی صاحب[۱۰] کو اتنا سمجھایا ، خاک بھی اثر نہ ہوا -''

نعیمہ : ''نوج کوئی ایسا بے مروت ہو -''

صالحہ : تم سے بھی بڑھ کر -''

نعیمہ : ''اچھی میری بہن !''

صالحہ : ''خیر میں پوچھ دوں گی - لیکن کیا تم خالہ جان سے رخصت ہو کر نہ چلو گی اور چلتے وقت ان سے نہ ملو گی ؟''

نعیمہ : ''اس وقت جیسی ہوگی ، دیکھی جائے گی -''

صالحہ : ''سنو بوا ، اگر تمہارے دل میں دغا ہو تو پہلے سے کہہ دو - ایسا نہ ہو ، میں پوچھنے جاؤں اور تم بے ملے چل دو تو ناحق مجھ کو شرمندگی ہو -''

نعیمہ : ''نہیں ، میں نے تمہارے چھیڑنے کو کہا تھا - بھلا ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ چلتے وقت میں اماں جان سے نہ ملوں - تو جاؤ پوچھ آؤ -''

صالحہ : ''اس وقت رات زیادہ ہو گئی ہے - آخر صبح کی نماز میں خالہ جان کے ساتھ پڑھوں گی ، اسی وقت پوچھ دوں گی -''

نعیمہ : ''اچھا پھر ڈولیوں کو تو اڈے پر اسی وقت

---

۱۰ - بیگم صاحب کی طرح ، معزز خواتین کے لیے ایک عام لقب ہے - لیکن یہاں طنزاً استعمال کیا گیا ہے -

کہلا بھیجو ورنہ شاید وقت پر نہ ملیں۔"

صالحہ : "نہ ملیں گی تو ہمارے محلے سے آ جائیں گی۔"

نعیمہ : "اس میں دیر ہوگی۔"

صالحہ : "کیا شادی میں جا رہے ہیں کہ دیر ہوگی تو دلہن رخصت ہو جائے گی ؟"

نعیمہ : "نہیں ، چلنا ہے تو بس منہ اندھیرے چل دیں۔ ننھا ڈولی میں ڈرتا ہے۔"

صالحہ : "خیر اسی وقت کہلا دیا جائے گا۔"

اس کے بعد نعیمہ اور صالحہ دونوں سو رہیں۔ ابھی تارے چھٹکے ہوئے تھے کہ صالحہ اپنے معمول پر نماز صبح کے واسطے اٹھی اور نعیمہ اس وقت غفلت کی نیند میں پڑی سو رہی تھی۔ نماز سے فارغ ہو کر صالحہ خالہ کے پاس جا کر کھڑی ہوئی اور کہا : "بس خالہ جان ، اب میں جاؤں گی۔"

خالہ : "ایں! ایسی جلدی ؟ ع۔
تم آگ لینے آئی تھیں ؟ کیا آئیں کیا چلیں۔"

صالحہ : "دس پندرہ دن بعد پھر آ جاؤں گی۔"

خالہ : "ذرا نعیمہ کے مزاج کو ٹھکانے لگنے دیا ہوتا۔"

صالحہ : "وہ بھی تو میرے ساتھ جانے کو کہتی ہیں۔"

خالہ : "سچ کہو۔"

صالحہ : ”مجھ سے کہہ بھی دیا ہے کہ تم پوچھ لو۔“

خالہ : ”اسی کی مرضی ہے یا تم نے صلاح دی ہے؟“

صالحہ : ”خود انھی کی مرضی ہے۔“

خالہ : ”بھلا کچھ یہ بھی کہتی تھیں ، کتنے دن کے واسطے؟“

صالحہ : ”دنوں کی تعیین تو مجھ سے نہیں بیان کی۔“

خالہ : ”خیر اس نے دنوں کی تعیین نہیں کی تو میں تم سے کہے دیتی ہوں کہ آٹھ دن سے زیادہ مت رکھنا۔ ہماری بہن بےچاری غریب آدمی ہیں؛ ان کو تکلیف ہوگی۔“

صالحہ : ”اب تو جب تک ان کا جی چاہے۔“

خالہ : ”تم لیے تو جاتی ہو مگر اتنا تو کرنا کہ اس کو بھی نیک ہدایت دینا۔“

صالحہ : ”جہاں تک مجھ سے ہو سکے گا سمجھاؤں گی اور ان کو مولویوں کے وعظ سنواؤں گی۔ خدا کی ذات سے امید تو ہے کہ ضرور اثر ہوگا۔“

اس کے بعد صالحہ نے گھر کے نوکر سے پوچھا کہ ڈولیوں کے واسطے رات کو جو کہلا بھیجا تھا ، آئیں یا نہیں؟ معلوم ہوا کہ ڈولیاں توپ سے پہلے کی دروازے پر لگی ہوئی ہیں۔ تب صالحہ کوٹھری کی طرف چلی ، اس غرض سے کہ نعیمہ کو جگائے اور اجازت کی خوش خبری سنائے۔ دیکھا تو نعیمہ پلنگ پر نہیں۔ سمجھی کہ دوسرے قطعے میں بچے

کا ہاتھ منہ دھلاتی ہوں گی ۔ مگر وہاں بھی نعیمہ کو نہ پایا ۔ معلوم ہوا کہ جب صالحہ خالہ کے ساتھ باتیں کر رہی تھی ، نعیمہ چپکے سے اٹھ بچے کو لے کھڑکی کی راہ ہو کر ڈیوڑھی میں جا سوار ہو ، بے رخصت ہوئے چل دیں ۔ اب یہ کیا موقع تھا کہ ڈولی واپس منگائی جائے ۔ نا چار صالحہ اکیلی ، خالہ کو سلام رخصت کرنے گئی تو خالہ نے کہا :
''اے لڑکی ، ایسی کیا بھاگڑ مچی ہے ۔ نعیمہ کو اٹھنے دو ، ناشتہ کھا پی لو ، تب جانا ۔''

صالحہ : ''آپا تو گئیں بھی ۔''

خالہ : ''یہ کب ؟''

صالحہ : ''جس وقت میں بعد نماز آپ سے باتیں کر رہی تھی ، اسی وقت وہ سوار ہو گئیں ۔''

خالہ : ''کیسی چپکے سے نکل گئی کہ میں نے اسے جاتے کو بھی نہ دیکھا ۔''

صالحہ : ''کھڑکی کی راہ سے گئیں ۔''

خالہ : ''تبھی ۔ مگر صالحہ تم نے دیکھا اس کا غصہ ! کتنا تم نے اس کے ساتھ سر مارا ۔ میں باہر کھڑی ہوئی تمھاری ساری باتیں سنتی تھی ۔ لیکن اس کا یہ اثر ہوا کہ بے ملے چل دیں ۔ بھلا کہیں ایسا بھی غضب ہوا ہے کہ بیٹی ماں کے گھر سے یوں چلی جائے ۔ اگر میں اس کی باتوں پر جاؤں تو جیتے جی صورت نہ دیکھوں ۔ لیکن کیا کروں ، یہ دل کم بخت مانتا نہیں ۔ اس مزاج کی بدولت ان حالوں کو تو یہ پہنچ گئی مگر ذرا اس کو خیال نہیں ،

مطلق اس کو پرواہ نہیں ۔ دیکھیے کیا اس کی تقدیر میں لکھا ہے ، کیا اس کے نصیب میں بدا ہے ۔ اس کے غم نے مجھ کو تو کھا لیا اور میں اس کے سوچ میں تمام ہو گئی ۔''

صالحہ : ''آپ رنج نہ کیجیے اور دل کو سنبھالیے ۔ اب آپ نے ان باتوں کا خیال کیا ہے تو ان شاءاللہ رفتہ رفتہ سب درست ہو جائیں گے ۔ یہی ہے کہ کوئی اویر کوئی سویر ۔''

اب ہم نعیمہ کو اسی جگہ چھوڑتے ہیں ۔ جو اس کو پیش آیا اور جیسا اس کا انجام ہوا ، پھر بیان کریں گے ۔

فصل نہم

کلیم باپ سے ناخوش ہو کر گھر سے نکل گیا۔ نصوح نے کلیم کا تکلف خانہ اور بیہودہ کتاب خانہ جلا دیا

نعیمہ تو صبح ہوتے گئی مگر کلیم رات ہی کو گھر سے نکل کھڑا ہوا۔ جب صالحہ ڈولی سے اتری، لوگ تو اس سے ملنے ملانے میں مصروف ہوئے؛ کلیم، آنکھ بچی تو دروازہ کھول باہر۔ اتنا بھی تو نہ کیا کہ رات کا وقت ہے، لاؤ کسی سے دروازے کے واسطے کہتا جاؤں۔ جب نعیمہ کو کھانا جا لیا، سب گھر والے کھا پی کر فارغ ہو گئے اور فہمیدہ سونے کے ارادے سے مکان میں آئی، تو دیکھا کہ باہر کا دروازہ چوپٹ کھلا پڑا ہے۔ کلیم کو ادھر دیکھا ادھر دیکھا، کہیں پتا نہیں۔ سمجھی کہ موقع پا کر چل دیا۔ لیکن اس وقت نہ تو کلیم اس ارادے سے گیا تھا کہ پھر نہ آئے، اور نہ فہمیدہ کو ایسا گمان ہوا۔ رات گئی تھی زیادہ، بات کا چرچا کرنا مناسب نہ جان کر سب لوگ سو ملا رہے۔ نصوح نماز صبح پڑھ کر مسجد سے واپس آ رہا

تھا کہ اس کو گلی کی نکڑ پر نعیمہ کی اوز ڈیوڑھی سے نکلتی ہوئی صالحہ کی ڈولی ملی - کلیم کی نافرمانیوں پر غصہ تو اسے رات ہی بہتیرا کچھ آیا اور بار بار اس کے دل نے چاہا کہ اسی وقت ادھر یا اُدھر جو کچھ ہو فیصلہ کر دے - لیکن چند در چند باتوں کے لحاظ سے وہ زہر کا سا گھونٹ پی کر چپ ہو رہا اور مشکل سے اپنی طبیعت کو اس بات پر رضامند کیا کہ پیام زبانی کا اثر اور تحریر کا نتیجہ تو معلوم ہوا ، ایک مرتبہ اور رُو در رُو کہہ کر بھی دیکھ لو - اس پر بھی نہ سمجھے تو اپنا سر کھائے - اس ارادے سے وہ پہلے مردانے مکان میں آ کر ٹھہرا اور جب کلیم اس کو نظر نہ آیا ، اس نے نوکروں سے پوچھا مگر کسی نے صاف جواب نہ دیا - تب وہ نوکروں پر خفا ہوا کہ تم لوگ کیسے نالائق ہو کہ مجھ کو اس بدبخت کا ٹھیک پتا نہیں دیتے - تم اپنے پندار میں اس کے حق میں خیر خواہی کر رہے ہو ، مگر میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ تمھاری راز داری نہ صرف اس کم نصیب کے حق میں زبوں ہے بلکہ تمھارے حق میں بھی اس کا نتیجہ اچھا نہیں - میں جانتا ہوں کہ اس کی عادت اس قدر سویرے اٹھنے کی نہیں ہے - ضرور ہے کہ تم نے اس کو جگا کر کہیں ٹال دیا ہے - میں نے تم کو اپنی آسائش کے لیے خاص خاص خدمتوں پر مامور کر رکھا ہے - اگر تمھاری وجہ سے میرے انتظام خانہ داری میں خلل واقع ہو تو تم میرے نوکر نہیں ہو ، بلکہ دشمن ہو ؛ ملازم نہیں ہو بلکہ بدخواہ ہو - اگر میں اس ناشدنی کو فرزندی سے عاق کروں گا تو تم سب کو بھی اس کے ساتھ نوکری سے برطرف -

نصوح کا یہ کلام سن کر اعلیٰ ادنیٰ سب نوکر تھرّا اٹھے اور جو ان میں سب سے زیادہ سلیقہ مند تھا ، دست بستہ ہو کر بولا کہ حضور[1] کا عتاب غلاموں کے سر و چشم پر۔ مگر شب کو مکان زنانہ رہا اور خانہ زادوں کو اجازت ہوئی کہ اپنے گھر جا کر سوئیں ۔ اس وقت صاحب زادے گھر میں تشریف رکھتے تھے ۔ نمک خواروں نے صبح کو آ کر ان کا حال نہیں دیکھا ۔ جناب بیگم صاحب سے حضور اس کا حال دریافت فرمائیں ۔ خانہ زادوں سے ایسی کور نمکی نہ ہوگی کہ حضور سے کوئی بات مخفی رکھیں ۔

یہ سن کر نصوح اندر گیا اور حسبِ عادت سب لوگ سلامِ صبح کرنے کے واسطے جمع ہو گئے ۔ فہمیدہ اس وقت تک تلاوت میں مصروف تھی مگر تھوڑی دیر میں فارغ ہو گئی تو نصوح نے کہا : ”کیوں صاحب ، بی صالحہ گئیں؟“

فہمیدہ : ”کبھی کی گئیں ۔ اب تک تو وہ گھر بھی پہنچ گئی ہوں گی ۔“

نصوح : ”اور دوسری ڈولی کس کی تھی ؟“

فہمیدہ : ”تمھاری بڑی صاحب زادی کی ۔“

نصوح : ”مَن کر گئیں یا بگڑ کر ۔“

فہمیدہ : ”کچھ مَن کر کچھ بگڑ کر ۔“

نصوح : ” یہ کیا؟“

---

۱ ۔ قدیم تہذیب کا ایک نمونہ ۔ ایک مہذب نوکر آقا سے کس طرح مخاطب ہوتا ہے ۔

فہمیدہ : "صالحہ نے ، خدا اس کو جزائے خیر دے ، بہت کچھ سمجھایا اور آدھی رات تک اپنا سر خالی کیا ۔ بارے اس کے کہنے سے اُنھوں نے اپنا قہری روزہ تو افطار کیا ، لڑکے کو بھی دودھ پلایا ؛ یہ تو ان کا منانا تھا ۔ بگڑنا یہ کہ صبح کو بے ملے ، بے رخصت ہوئے ، ڈولی میں بیٹھ چل دیں ۔ میں صالحہ سے باتیں کرتی رہی ۔ میں نے اس کو جاتے کو بھی نہ دیکھا ۔"

نصوح : "خیر ، ان سے تو خدا نے سبک دوش کیا ۔ اب صاحب زادے صاحب کی کہو ، وہ کہاں ہیں ؟"

سب چھوٹے بڑوں نے کانوں پر ہاتھ رکھے کہ ہم کو مطلق خبر نہیں ۔

نصوح : "کب سے غائب ہیں ؟"

فہمیدہ : "مغرب کے بعد سے برابر میرے پاس بیٹھا تھا، میں اُس کو سمجھاتی رہی ۔ تمھارا خط آیا ، اس کو پڑھا ۔ اتنے میں صالحہ کی ڈولی آ پہنچی ، میں اُس سے باتیں کرنے لگی ۔ پھر لوگوں کو کھانا دیا دلایا ۔ اس میں کوئی پہر ڈیڑھ پہر رات چلی گئی ۔ سونے کو جو گئی تو دیکھا کہ مکان خالی پڑا ہے ۔"

نصوح : "الحمدللہ ، خس کم جہاں پاک ۔ لیکن میں تم سے پوچھتا ہوں کہ اس میں کس کی خطا ہے ، میری یا اُس کی ؟"

فہمیدہ : "خطا صریح اُسی کی ہے ۔ میں خواہ مخواہ بھی

تمھاری خطا بتادوں ۔ تم نے اس کو ایک دفعہ چھوڑ دو دفعہ بلایا ، خط لکھا ، بس حد ہو گئی ۔ علیم نے بہتیرا سمجھایا ، میں نے بہت کچھ کہا سنا ۔ وہ اپنی شاعری کے آگے کس کی سنتا ہے ؟ تم تک جانے ہی کی اس نے ہامی نہ بھری ۔ میں نے کہا تھا کہ کھانے پینے سے فراغت پا کر پھر اس کے ساتھ سر ماروں گی ۔ اسی غرض سے مردانے مکان میں پردہ کرایا ، مگر وہ پہلے ہی سے نکل گیا ۔ کوئی کیا کرے، اپنی اپنی قسمت ، اپنی اپنی تقدیر ۔''

نصوح : ''جس طرح یہ نالائق میرے ساتھ پیش آیا ، نعیمہ نے تمھارے ساتھ اس کا دسواں حصہ بھی نہیں کیا ۔''

اس کے بعد نصوح نے منجھلے بیٹے علیم سے کہا : ''بھلا تم نے اس کے بچھونے یا کتابوں میں تو دیکھا ہوتا ، شاید وہ کچھ لکھ کر رکھ گیا ہو ۔ افسوس ہے کہ اس کے نفسِ سرکش نے اس کو مجھ تک نہ آنے دیا ، ورنہ میں تو ہرطرح اس کے عذرات کو سننے اور اس کے وجوہات پر لحاظ کرنے اور معقولیت کے ساتھ اس کو سمجھانے کے لیے موجود تھا ۔''

علیم : ''یہ بات میرے ذہن میں نہیں گزری ، مگر میں اب ان کی چیزوں میں دیکھے لیتا ہوں ، اگرچہ مجھ کو اب بھی ایسی امید نہیں ہے کہ وہ کچھ لکھ کر گئے ہوں ۔ کیوں کہ اگر لکھنا ہی منظور ہوتا تو وہ آپ کے خط کا جواب ہی نہ دیتے ۔ دوسرے ، ان کو اتنی فرصت کہاں ملی ۔ کل شام کو اس بات کا چرچا شروع ہوا اور میں جانتا ہوں کہ صالحہ کے آتے ہی وہ تشریف لے گئے ۔ اس اثنا میں

برابر میں ان کے پاس تھا اور میرے چلے جانے کے بعد اماں جان ۔''

نصوح : ''پھر بھی میں اس کو داخلِ اتمامِ حجت سمجھ کر چاھتا ھوں کہ احتیاطاً اس کی چیزوں میں دیکھ لیا جائے۔ چلو میں بھی تمھارا شریک رھوں گا ۔''

ھر چند علیم کو منظور نہ تھا کہ بھائی کی چیزوں پر باپ کی نظر پڑے مگر باپ کو منع بھی نہ کر سکتا تھا ۔ آخر باھر مردانے میں آ کر نصوح نے نوکروں سے پوچھا کہ کلیم کا اسباب کس جگہ رھتا ھے ؟

نوکر : ''حضور ، صاحب زادے صاحب نے دو کمرے لے رکھے ھیں ۔ اس دکھن والے کمرے کا نام انھوں نے (بچے ھی تو ھیں) 'عشرت منزل' رکھ چھوڑا ھے ۔ جب ان کے ھم جولی آتے ھیں تو سب اسی کمرے میں بیٹھ کر کھیلا اور باتیں کیا کرتے ھیں ۔ اُتّر والے کمرے کو 'خلوت خانہ' فرمایا کرتے ھیں ۔ اس میں ان کے پڑھنے لکھنے کی کتابیں وغیرہ ھیں ۔''

نصوح 'عشرت منزل' اور 'خُلوت خانہ' کا نام سن کر چوکنّا ھوا اور اس نے نوکروں سے کہا کہ اچھا پہلے اس عشرت منزل کو کھولو ۔ چناں چہ عشرت منزل کھولا گیا تو ایک تکلف خانہ تھا ۔ کمرے کے بیچ میں چوکیوں کا فرش ، اس پر دری ، اس پر

سفید چاندنی[۲] اس خوش سلیقگی کے ساتھ تنی ہوئی کہ کہیں دھبے یا سلوٹ کا نام نہیں ۔ صدر کی جانب گجرات کا نفیس قالین بچھا ہوا ، گاؤ تکیہ لگا ہوا ۔ سامنے اگال دان ، لبِ قالین پیچوان ۔ چوکیوں کے گردا گرد کرسیاں ؛ تھیں تو لکڑی کی لیکن آئینے کی طرح صاف اور چمکتی ہوئی ۔ چھت میں پٹاپٹی کی گوٹ کا پنکھا لٹکا ہوا ، ہلانے کے واسطے نہیں ، بلکہ دکھانے کے لیے ۔ اس کے پہلوؤں میں جھاڑ ۔ جھاڑوں کے بیچ بیچ میں رنگ بہ رنگ کی ہانڈیاں ۔ چھت کیا تھی بلا مبالغہ آسمان کا نمونہ تھا جس میں پنکھا بجائے کہکشاں کے تھا ، جھاڑ بہ منزلۂ آفتاب اور ماہتاب ، اور ہانڈیاں ہو بہو جیسے ستارے ۔ چھت کے مناسبِ حالت ، دیواریں ، تصویروں اور قطعات اور دیوارگیریوں سے آراستہ تھیں ۔''

نصوح اس ساز و سامان کو تھوڑی دیر ایک سکتے کے عالم میں کھڑا دیکھتا رہا ۔ اس کے بعد ایک آہ کھینچ کر بولا کہ افسوس کتنی دولتِ خدا داد اس بیہودہ نمائش اور تکلف اور آرائش میں ضائع کی گئی ہے ۔ کیا اچھا ہوتا کہ یہ روپیہ محتاجوں کی امداد اور غریبوں کی کار برآری میں صرف کیا جاتا ۔

اس کے بعد اس کی نگاہ مقابلِ صدر جا پڑی ۔ کیا دیکھتا

---

۲ - چاندنی : سفید رنگ کا فرش ۔ صدر کی جانب : کمرے کے وسط میں ، اوپر کی طرف ۔ پیچوان : طویل اور پیچ دار نے کا حقہ ۔ پٹاپٹی کی گوٹ : رنگین پٹیوں کی جھالر ۔ جھاڑ : بلور ، آب گینے یا دھات کا فانوس ، بہ شکلِ درخت (شاخ در شاخ) جو روشنی اور آرائش کے لیے لٹکایا جاتا ہے ۔ دیوارگیری : دیوار میں لگانے کا لیمپ؛ نیز وہ کپڑا جو دیواروں پر آرائش کے لیے لگاتے ہیں ۔

ہے کہ آمنے سامنے دو میزیں لگی ہیں ۔ ایک پر گنجفہ ، شطرنج ، چوسر ، تاش ، کھیل کی چیزیں اور ارگن باجے رکھے تھے ۔ دوسری پر گل دان اور عطر دان وغیرہ کے علاوہ ایک نہایت عمدہ طلائی جلد کی موٹی سی کتاب ۔ نصوح نے نہایت شوق سے اس کتاب کو کھولا تو وہ تصویروں کا البم تھا ۔ مگر تصویریں کسی عالم ، حافظ اور درویش خداپرست کی نہیں ؛ مکھوا پکھاوجی ، تان سین خاں گویّا ، میر ناصر احمد بین نواز ، صمد خاں پہلوان ، کھلونا بھانڈ ، حیدر علی قوال ، نتھو ہیجڑا ، قاری علی محمد پھکڑ ، عدّو جواری ، اس قسم کے لوگوں کی ـــ شیشہ آلات کی وجہ سے نصوح نے دیوار والی تصویروں کو بہ غور نہیں دیکھا تھا ۔ اب البم کو دیکھ کر اسے خیال آیا ۔ آنکھ اٹھا کر دیکھتا ہے تو وہ تصویریں اور بھی بے ہودہ تھیں ۔ قطعے اور طغرے ، اگرچہ ان کا سواد خط پاکیزہ تھا مگر مضمون و مطلب دین کے خلاف ، مذہب کے برعکس ۔ نصوح نے وہیں سے ایک میر فرش[۳] اٹھا کر ان سب کی خبر لینی شروع کی اور بات کی بات میں کل چیزوں کو توڑ پھوڑ برابر کیا ۔ اور جو کچھ باقی رہا اس کو صحن میں رکھ آگ لگا دی اور نوکروں کو حکم دیا کہ اچھا اب خلوت خانہ کھولو ۔

اس میں تکلف کے معمولی ساز و سامان کے علاوہ کتابوں کی الماری تھی ۔ دیکھنے میں تو اتنی جلدیں تھیں کہ انسان ان کی فہرست لکھنی چاہے تو سارے دن میں بھی تمام نہ ہو

---

۳ ۔ وہ گول گول بھاری پتھر جو فرش دبانے کے لیے چاروں کونوں پر رکھے جاتے ہیں ۔ سنگ قالین (کنایۃً وہ شخص جو اپنی جگہ سے حرکت نہ کرے) ۔

لیکن کیا اُردو کیا فارسی سب کی سب کچھ ایک ہی طرح کی تھیں : جھوٹے قصے ، بے ہودہ باتیں ، فحش مطالب ، لُچّے مضمون ، اخلاق سے بعید ، حیا سے دور ۔ نصوح ان کتابوں کی جلد کی عمدگی ، خط کی پاکیزگی ، کاغذ کی صفائی ، عبارت کی خوبی ، طرز ادا کی برجستگی پر نظر کرتا تھا تو کلیم کا کتاب خانہ اس کو ذخیرۂ بے بہا معلوم ہوتا تھا ۔ مگر معنی و مطالب کے اعتبار سے ہر ایک جلد سوختنی اور دریدنی تھی ۔ اسی تردد میں اس کو دوپہر ہو گئی ۔ کئی مرتبہ کھانے کے لیے گھر سے اس کی طلب ہوئی مگر اس کو فرصت نہ تھی ۔ بار بار کتابوں کو اُلٹ اُلٹ کر دیکھتا تھا اور رکھ دیتا تھا ۔ آخر کار یہی رائے قرار پائی کہ ان کا جلا دینا ہی بہتر ہے ۔ چناں چہ بھری الماری کتابیں ، لکڑی کنڈے کی طرح اوپر تلے رکھ آگ لگا دی ۔

نصوح کا یہ برتاؤ دیکھ اندر سے باہر تک تہلکہ اور زلزلہ پڑ گیا ۔ علیم دوڑا دوڑا جا ، اپنا کلیات آتش اور دیوان شرر اُٹھا لایا اور باپ سے کہا کہ جناب میرے پاس بھی یہ دو کتابیں اسی طرح کی ہیں ۔ نصوح نے ان کتابوں کو بھی دو چار جگہ سے کھول کر دیکھا اور کہا کہ واقع میں ان کے مضامین بھی جہاں تک میں دیکھتا ہوں برے اور بے ہودہ ہیں لیکن تمھاری نسبت مجھ کو خدا کے فضل سے اطمینان ہے ۔ چاہو تو اپنی کتابوں کو رہنے دو ۔ اگرچہ ان کا مطالعہ میرے نزدیک خالی از معصیت نہیں ہے ۔

علیم : ”کتاب جب کہ دیکھنے اور پڑھنے کے لائق نہیں تو اس کا رکھنا بے سود بلکہ خطرناک ہے ۔ بہتر ہوگا کہ ان کو بھی جلا دیا جائے ۔“

نصوح : ''شاید تم میری خاطر سے کہہ رہے ہو اور تم کو پیچھے تاسف ہو ۔''

علیم : ''مجھ کو ہرگز تاسف نہ ہوگا بلکہ خوشی ہوگی۔ جلائی جائے وہ عمدہ نصیحت کی کتاب جو مجھ کو پادری صاحب نے دی تھی اور رہیں یہ خرافات ! میں جانتا ہوں کہ بھائی جان کی کتابوں پر یہ اسی پادری صاحب والی کتاب کا وبال پڑا ۔ ڈرنے کا مقام اور عبرت کی جگہ ہے ۔''

نصوح : ''لیکن کیا ضرور ہے کہ تمھاری کتابیں بھی اس وبال میں داخل ہوں ؟''

علیم : ''ان کے نام بھی جلنا جلنا پکارتے ہیں ۔ ارشاد ہو تو جھونک دوں ۔''

نصوح : ''تمھاری یہی مرضی ہے تو بسم اللہ ۔''

علیم نے 'آتش' کو دھکتی آگ اور 'شرر' کو جلتے انگاروں میں پھینک دیا ۔ علیم کی دیکھا دیکھی میاں سلیم نے بھی 'واسوخت امانت' لا باپ کے حوالے کی اور کہا کہ ایک دن کوئی کتاب فروش کتابیں بیچنے لایا تھا ۔ بڑے بھائی صاحب نے فسانۂ عجائب ، قصۂ گل بکاؤلی ، آرائش محفل ، مثنوی میر حسن ، مضحکاتِ نعمت خان عالی ، منتخب غزلیات چرکین، ہزلیاتِ جعفر زٹلی ، قصائدِ ہجویہ مرزا رفیع السودا ، دیوان جان صاحب ، بہار دانش باتصویر ، اِندر سبھا ، دریائے لطافت میر انشاءاللہ خاں ، کلیاتِ رند وغیرہ بہت سی کتابیں اس سے لی تھیں ۔ میں بھی بیٹھا تھا ۔ مجھ کو دیکھ کر بولے : ''کیوں سلیم ، تم بھی کوئی کتاب لوگے ؟''

مَیں : ''جو آپ تجویز فرمائیں ۔''

بھائی جان : ''کون سی کتاب تم کو لے دوں ؟ یہ کتابیں جو میں نے لی ھیں ، اول تو میرے شوق کی ھیں ؛ دوسرے تم کو ان کا مزا نہیں ملے گا ۔''

کتاب والے کی ساری گٹھری میں سے یہ 'واسوخت' اور دیوان نظیر اکبر آبادی ، دو کتابیں انھوں نے میرے لیے نکالیں اور کہا کہ 'واسوخت' تو خیر مگر یہ دیوان بڑی عمدہ کتاب ھے ۔ میاں ھد ھد کے اشعار آج تک کسی نے جمع نہیں کیے تھے ، اس کے حاشیے پر وہ بھی ھیں ۔

چوں کہ بھائی جان نے دیوان کی بہت تعریف کی تھی ، میں نے اس کو نہایت شوق سے کھولا تو پہلے ھی چوھوں کا اچار نکلا ۔ اس کے مضمون سے میری طبیعت کچھ ایسی کھٹی ھوئی کہ میں نے دونوں کتابیں پھیر دیں ۔ مگر بھائی جان نے یہ 'واسوخت' زبردستی میرے سر مڑھی ۔ ایک دن اتفاق سے حضرت بی کے بڑے نواسے نے اس کو میرے جزدان میں دیکھ کر پوچھا کہ آھا میاں سلیم ، تم تو بڑے چھپے رستم نکلے ۔

مَیں : ''کیوں ؟''

حضرت بی صاحب کا نواسہ : ''تم کو ایسی کتابوں کا بھی شوق ھے ؟''

مَیں : ''مجھ کو بھائی جان نے لے دی ھے ۔ کیوں ، کیا یہ کتاب اچھی نہیں ؟''

حضرت بی صاحب کا نواسہ : ''اچھی بری تو میں

نہیں جانتا لیکن اگر نانی اماں دیکھ پائیں گی تو شاید ہم لوگوں کو تمہارے پاس اٹھنے بیٹھنے کی ممانعت کریں۔ بھلا کوئی ایسی گندی باتوں کی کتاب بھی پڑھتا ہے۔''

تب سے میں نے اس کتاب کو لا کر ردی میں ڈال دیا تھا۔ آج مجھ کو یاد آ گئی تو میں نے کہا یہ بھی اپنی مراد کو پہنچ جائے۔

جب کلیم کا خرمن عیش و عشرت جل بھن کر خاک سیاہ ہو لیا تو نصوح گھر میں گیا اور بیوی نے اس سے پوچھا: ''کیوں، جس پرچے کی جستجو تھی ملا؟''

نصوح: ''نہیں۔ پرچہ تو نہیں ملا لیکن میرا مطلب حاصل ہو گیا۔''

فہمیدہ: ''وہ کیا؟''

نصوح: ''مجھ کو اس بات کی تلاش تھی کہ کلیم کے دلی خیالات معلوم کر لوں، کہ آخر اس کو جو اس قدر گریز ہے کہ میرے پاس آنے تک سے بھی اس نے انکار کیا تو اس کی وجہ کیا ہے؟''

فہمیدہ: ''پھر تم نے کیا وجہ دریافت کی؟''

نصوح: ''وجہ کیا دریافت کی، اس کی ساری حقیقت معلوم ہو گئی۔ بلکہ شاید رو در رو گفتگو کرنے سے بھی یہ بات پیدا نہ ہوتی جو مجھ کو اب حاصل ہے۔''

فہمیدہ: ''آخر کچھ میں بھی تو سنوں۔''

نصوح: ''میں نے اس کے 'عشرت منزل'، اور

'خلوت خانے' کو دیکھا اور اس کے کتاب خانے کی سیر کی ۔''

فہمیدہ : '' 'عشرت منزل' اور 'خلوت خانہ' کیسا ؟''

نصوح : ''تم تو کچھ مجھ سے بھی زیادہ بے خبر ہو ۔ آج تک تم کو یہ بھی معلوم نہیں کہ صاحب زادۂ بلند اقبال نے دو کمرے اپنے واسطے خاص کر رکھے ہیں ۔ ایک کا نام 'عشرت منزل' رکھ چھوڑا ہے اور دوسرے کا 'خلوت خانہ ۔' جس کمرے میں ان کے شیاطین‌الانس جمع ہوتے ہیں وہ 'عشرت منزل' ہے اور جہاں استراحت فرماتے ہیں وہ 'خلوت خانہ' اور اسی خلوت خانے میں کتاب خانہ بھی ہے ۔''

فہمیدہ : ''اتنی بات تو میں بھی جانتی ہوں کہ کلیم نے دو کمرے لے رکھے ہیں مگر 'عشرت منزل' اور 'خلوت خانہ' میں نے آج ہی سنا ہے ۔''

نصوح : ''تم نے ان کمروں کو اندر سے بھی دیکھا ؟''

فہمیدہ : ''نہیں ۔ مردانے میں کبھی کاہے کو جانے کا اتفاق ہوتا ہے ۔ کل رات البتہ علیم کے اصرار سے پردہ کروا کے گئی تھی ۔''

نصوح : ''خوب ہوا کہ تم نے ان کمروں کو نہ دیکھا ۔''

فہمیدہ : ''کیوں ؟''

نصوح : ''اب میں ان کمروں کی تمام تر تفضیح تم سے

گیا بیان کروں ۔ بس مولانا روم قدس اللہ سرہ العزیز کا شعر :

از بروں چوں گورِ کافر پُر حلل
اندروں قہر خدائے عزّ و جل[۳]

گویا انہیں کمروں کی شان میں ہے ۔ ظاہر آباد ، باطن خراب ۔"

فہمیدہ : "کوئی کہتا تھا کہ تم نے غصے میں آ کر دیوان خانے میں آگ لگا دی ۔"

نصوح : "اگرچہ وہ مکان جس میں وحشیوں کے سے کام ہوتے ہیں اسی قابل ہے ، مگر میں نے مکان میں تو آگ نہیں لگائی ۔"

فہمیدہ : "کچھ دھواں سا تو مردانے میں ضرور اٹھ رہا تھا ۔"

نصوح : "وہ تو چند کتابیں تھیں جن کو میں نے بے ہودہ سمجھ کر جلا دیا ۔"

فہمیدہ : "ایسے غصے سے بھی خدا پناہ میں رکھے ۔"

نصوح : "غصے کی تو اس میں کوئی بات نہ تھی ۔"

فہمیدہ : "کتاب کا جلانا غصے کی بات نہیں تو عقل کی بات ہے ؟ میں نے تو سنا ہے کہ کاغذ کا جلانا بڑا گناہ ہے نہ کہ کتاب ۔ لوگ کہیں ذرا سا پرزہ پڑا پاتے ہیں تو اٹھا کر آنکھوں سے لگاتے ہیں ۔ کتاب کو بھولے سے ٹھوکر

---

۳ - جیسے کافر کی قبر ہو کہ باہر سے آراستہ و پیراستہ ہے اور اندر خدائے بزرگ و برتر کا قہر و غضب نازل ہو رہا ہے

لگ جاتی ہے تو توبہ توبہ کر کے چومتے اور ماتھے چڑھاتے ہیں۔"

نصوح: "تم سچ کہتی ہو مگر یہ لوگوں کی زیادتی ہے۔ کاغذ بھی کپڑے کی طرح ایک بے جان چیز ہے۔ کتاب کے عمدہ مضامین، جن میں دین داری اور خدا پرستی اور نیکوکاری کا بیان ہوتا ہے، وہ البتہ قابل ادب ہیں۔"

فہمیدہ: "خیر کچھ ہی سہی مگر کتاب ہے تو ادب کی چیز۔ پھر تم نے جلائی کیوں؟"

نصوح: "جن کتابوں کو میں نے جلایا، اُن کے مضامین کفر اور شرک اور بے دینی اور بے حیائی اور فحش اور بدگوئی اور جھوٹ سے بھرے ہوئے تھے۔"

فہمیدہ: "کتابوں میں ایسی بری بری باتیں بھی ہوتی ہیں؟"

نصوح: "کتابیں بھی آدمی بناتے ہیں اور آدمی ایسا مخلوق سرکش ہے کہ اس نے تمام دنیا میں بدی اور نافرمانی پھیلا رکھی ہے۔ کیا تم شعر اور شاعری کے نام سے واقف نہیں ہو؟"

فہمیدہ: "واقف کیوں نہیں۔ کتابوں میں اکثر شعر ہوتے ہیں، مگر ان میں تو کوئی بری بات دیکھنے میں نہیں آئی۔ سنتی ہوں کہ کلیم کو شعر بنانے[۴] کا بڑا شوق ہے اور

۴۔ شعر بنانا محاورہ نہیں؛ صحیح محاورہ شعر کہنا ہے۔ یہاں اس کا استعمال، شعر و شاعری سے فہمیدہ کی ناواقفیت ظاہر کرنے کے لیے، عمداً کیا گیا ہے۔

مردوں میں یہ بڑی تعریف کی بات گنی جاتی ہے ۔''

نصوح : شاعری اپنی ذات سے بری نہیں بلکہ اس اعتبار سے کہ زباں دانی کی عمدہ لیاقت کا نام شاعری ہے ، ضرور تعریف کی بات ہے ۔ لیکن لوگوں نے ایک عام دستور قرار دے رکھا ہے کہ اس لیاقت کو ہمیشہ برے اور بے ہودہ خیالات میں صرف کرتے ہیں ۔ اس وجہ سے دین داروں کی نظر میں شاعری عیب و گناہ ہے ۔ اب شاعری اسی کا نام ہے کہ کسی کی ہجو کہیے کہ وہ داخل غیبت ہے ؛ یا مدح بے جا لکھیے کہ وہ کذب و بطالت ہے ؛ یا عشق و عیاشی کے ناپاک خیالات میں کوئی مضمون سوچیے کہ وہ خلاف شریعت ہے ؛ یا مسائل دین اور اہل دین کے ساتھ تمسخر و استہزاء کیجیے کہ وہ کفر و معصیت ہے ۔''

فہمیدہ : ''یہ مجھ کو آج معلوم ہوا کہ پڑھنے لکھنے کی چیزوں میں بھی لوگوں نے خرابیاں پیدا کی ہیں ۔''

نصوح : ''کیا تم کو اپنا 'گلستاں' پڑھنا یاد نہیں ؟''

فہمیدہ : ''یاد کیوں نہیں ۔ جس دن حمیدہ کا دودھ چھڑایا ہے ، اس کے اگلے دن میں نے 'گلستاں' شروع کی تھی ۔''

نصوح : ''بھلا تم کو یہ بھی یاد ہے کہ میں تمھارے سبق سے آگے آگے جا بجا سطروں کی سطروں پر سیاہی پھیر دیا کرتا تھا ؟ بلکہ بعض دفعہ صفحے کے صفحے ایسے آ پڑے ہیں کہ مجھ کو اوپر سے سادہ کاغذ لگا کر ان کو چھپانے کی ضرورت ہوئی ۔''

فہمیدہ : ''خوب اچھی طرح یاد ہے ۔ چوتھائی کتاب

سے کم نہ کٹی ہوگی ۔''

نصوح : ''تم پڑھتی تھیں تب چوتھائی بھی کٹی ، اگر کوئی دوسری عورت یا لڑکی پڑھتی ہوتی تو میں آدھی کی خبر لیتا ۔ وہ تمام بے ہودہ باتیں تھیں جن کو میں کاٹتا اور چھپاتا پھرتا تھا ۔''

فہمیدہ : 'سچ کہو ۔ لو میں تو سمجھی مشکل جان کر چھڑوا دیتے ہیں ۔''

نصوح : ''بڑی مشکل یہ تھی کہ میں ان واہیات اور فحش باتوں کو تمھارے رو بہ رو بیان نہیں کر سکتا تھا' ۔ پھر یہ اس کتاب کا حال ہے جو پند و اخلاق میں ہے اور تصنیف بھی ایسے بزرگ کی ہے کہ کوئی مسلمان ایسا کمتر نکلے گا کہ ان کا نام لے اور شروع میں حضرت اور آخر میں رحمۃاللہعلیہ یا قدس‌اللہ سرہ‌العزیز نہ کہے ؛ یعنی ان کا اعتداد اولیاءاللہ میں ہے ۔ اور جو کتابیں میں نے جلائیں ، کتابیں کاہے کو تھیں ، پھکڑ ، گالی ، ہزلیات ، بڑ ، بکواس ، ہذیان ، خرافات ، میں نہیں جانتا کہ ان میں سے کون سا نام ان کے لیے زیادہ زیبا ہے ۔''

فہمیدہ : ''مگر جلانا کیا ضرور تھا ؛ پڑی رہنے دی ہوتیں یا بِک بکا جاتیں ۔ آخر داموں کی چیز تھی ۔''

نصوح : ''شاید اگلی گرمیوں کا ذکر ہے کہ بدر رو میں سانپ نکلا تھا اور اس کو دیکھ کر چھوٹے بڑے سب ایسے خوف زدہ ہو گئے تھے کہ صحن میں نکلنا بیٹھنا چھوڑ دیا تھا اور کیسا کچھ تقاضا تھا کہ جس طرح ہو سکے

سانپ کو پکڑوا کر مار ڈالنا چاہیے ۔ سانپ کی نسبت تم نے ہرگز نہیں کہا کہ پڑا بھی رہنے دو ، شاید کوئی سپیرا دو چار ٹکے پیسے دے کر مول لے جائے گا ۔ میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ یہ کتابیں اس سانپ سے زیادہ موذی اور اس سے کہیں زیادہ خطرناک تھیں اور ان کی قیمت چوری اور ٹھگی کے مال سے بڑھ کر حرام ۔ کلیم کو اور پھٹکار کیا ہے؟ اسی سانپ کا زہر اس کو چڑھا ہوا ہے ، اور شیطان نے یہی منتر اس پر پڑھ کر پھونک دیا ہے ۔''

فہمیدہ : ''پھر آخر اس زہر کا تریاق اور اس منتر کا توڑ بھی کچھ ہے یا نہیں ؟''

نصوح : ''کیوں نہیں ، دین و اخلاق کی کتابیں ۔ مگر کوئی ان کو دیکھنے والا بھی تو ہو ۔ نہ یہ کہ ہر روز نئے سانپ سے کٹواتے جاؤ اور تریاق سے بھاگو اور نفرت رکھو تو انجام کیا ہوگا ، ہلاکت ۔''

فصل دہم

کلیم کا پہلے اپنے دوست مرزا ظاہر دار بیگ، اور پھر اپنے ایک قرابت دار، فطرت کے یہاں جا کر رہنا، اور دونوں مرتبہ زک اُٹھانا اور قید ہونا، اور آخرکار باپ ہی کی سفارش سے رہائی پانا۔

اب ہم کو کلیم اور نعیمہ، دونوں بھائی بہنوں کا حال بیان کرنا چاہیے کہ باپ کے گھر سے نکل کر ان پر کیا بیتی۔ سو، چوں کہ کلیم پہلے نکلا، پہلے اسی کا حال بیان کرتے ہیں۔

کئی بار اس کو باپ نے بلوایا، یہاں تک کہ ہار کر رقعہ لکھا۔ ماں نے بہتیرا سمجھایا، بھائی نے بہت کچھ کہا سنا لیکن وہ رو بہ راہ نہ ہوا۔ اور جب دیکھا کہ فہمیدہ، صالحہ کے اُتروانے میں مصروف ہے، آنکھ بچا، بے پوچھے، بے کہے گھر سے اس طرح نکل کھڑا ہوا کہ گویا اس کو کچھ تعلق ہی نہ تھا۔ شاید اس کے ذہن میں بھی یہ بات اس وقت نہ گزری ہوگی کہ وہ عمر بھر کے واسطے گھر سے جا رہا ہے

اور عزیز و اقارب جن سے وہ ایسے سرسری طور پر جدا ہوتا ہے ، جیتے جی ان کو نہ دیکھ سکے گا ۔ یہ نکلنا اس کا کچھ نیا نکلنا نہ تھا بلکہ معمولی عادت اور ہمیشہ کی خصلت تھی ۔ گھر سے نکل جانے کی اس نے یہاں تک مشق بہم پہنچائی تھی کہ ذرا ذرا سی ادعائی ناخوشی پر وہ آئے دن بھاگا کرتا تھا۔ مگر ادھر اس کا نکلنا معلوم ہوا اور ادھر نوکروں کے جاسوس اس کی جستجو میں دوڑنے شروع ہوئے ۔ شروع شروع میں تو نوکروں ہی کے بلانے سے چلا آتا تھا ۔ پھر چندے یہ معمول رہا کہ خود میاں نصوح جاتے تو صاحب زادۂ بلند اقبال کو منا لاتے ۔ اب تھوڑے دنوں سے نصوح کے عمل میں بھی تاثیر گھٹ گئی تھی تو بی فہمیدہ کی ڈولی در بدر پھرا کرتی تھی ۔

اس دفعہ بھی وہ ضرور یہ توقع جی میں لے کر نکلا کہ گلی سے نکلتے نکلتے نوکر اس کے پیچھے دوڑیں گے اور اس امید میں اس نے اپنے دوست مرزا ظاہر دار بیگ کے گھر پہنچتے پہنچتے کوئی سیکڑوں ہی مرتبہ پیچھے پھر پھر کر دیکھا ۔ مگر واقع میں یہ اس کی غلط فہمی تھی ۔ اب کلیم کے سوا ، بہ قول نعیمہ کے ، گھر کا باوا آدم بدلا ہوا تھا ۔ نہ پہلی سی ماں ، نہ اگلا سا باپ ؛ نوکر ڈھونڈھیں تو کیوں اور دوڑیں تو کس لیے ؟ پھر بھی کلیم اس سے بے خبر نہ تھا کہ اس مرتبہ ایک خاص طرح کا بگاڑ ہے ۔ وہ جانتا تھا کہ دین داری کا چرچا گھر میں ہو رہا ہے ۔ خلاف توقع نعیمہ ایک تھپڑ کھا چکی ہے ۔ سلیم اور حمیدہ جو گھر میں چھوٹے ہونے کی وجہ سے کلیم اور نعیمہ کے تختۂ مشق تھے ، اب سب سے زیادہ باپ اور ماں دونوں کے چہیتے ہو رہے ہیں ۔

یعنی جن کی لمبی چوڑی عزت تھی ، وہ ذلیل ھیں اور جو بے وقعت تھے ، آن کا طوطی بول رہا ہے ۔ پہلے جب کبھی کلیم گھر سے ناخوش ہو کر نکلا تو کھانے کپڑے ، روپے پیسے کے لین دین پر ، ماں یا بھائی بہنوں سے لڑائی جھگڑے کے سبب ۔ لیکن اس دفعہ دین کی بحث تھی ، نہ لین دین کی ؛ باپ سے لڑائی تھی ، نہ بھائی بہنوں سے ۔ ذرا سی عقل معاملہ فہم بھی کلیم کو ہوتی تو وہ ایسی حالت میں گھر سے نکلنے پر دلیری نہ کرتا ۔ لیکن ، جیسا کہ نصوح نے تجویز کیا تھا ، اس پر شاعری کی پھٹکار تھی اور سر پر شامتِ اعمال سوار ۔ اور واقع میں جب انسان شبانہ روز داد و تحسین کی فکر میں منہمک رہے گا تو ضرور ہے کہ خود پسندی ، خود بینی ، خود ستائی کے عیوب اس کی طبیعت میں راسخ ہوں ۔

شعر و سخن کے اعتبار سے ہم بھی کلیم کو شاباش دیتے ہیں ، کیوں کہ ہم دیکھتے ہیں کہ وہ معاملہ[1] اچھا باندھتا ہے ، تضمین میں گرہ خوب لگاتا ہے ، بندش بھی

۱ ۔ معاملہ باندھنا : غزل کے اشعار میں محبوب سے چھیڑ چھاڑ کی یا راز و نیاز کی باتیں بیان کرنا جسے اصطلاح میں معاملہ بندی کہتے ہیں ۔ تضمین : کسی شاعر کے مشہور شعر کو اپنے کلام میں ملانا یا اس کے مصرعے یا شعر میں اپنے مصرعے جوڑنا ۔ اس کی مختلف صورتیں ہوتی ہیں ۔ بندش : کلام میں لفظوں کی نشست و ترتیب ۔ قصیدہ : وہ صنفِ نظم جس میں کسی کی مدح یا ہجو بیان کی جائے ۔ ہیئت میں غزل سے مشابہ ۔ مثنوی : وہ صنفِ نظم جس میں کوئی قصہ یا واقعہ یا کوئی مسلسل مضمون ادا کیا جائے ۔ اس کا ہر شعر قافیہ و ردیف میں جداگانہ ہوتا ہے ۔ (بقیہ ص ۲۶۶ پر)

خاصی ہوتی ہے ، قصیدہ بھی برا نہیں ، طبیعت مضمون آفرینی پر بھی مائل ہے ۔ مثنوی تو خیر ، مگر رباعی اس کی لاجواب ہوتی ہے ۔ مقطع میں تخلص کا نباہ یا تو متاخرین میں مومن مرحوم میں دیکھا یا اب ماشاءاللہ میاں کلیم میں ۔ صنائع لفظی کے اتنے التزام پر بے ساختگی کی ادا قابل آفریں ہے ۔ اب قصیدے کی تشبیب بعد چندے سودا کے لگ بھگ ہونے والی ہے ۔ چشم بد دور ، چھ برس کی مشق میں دو دیوانوں کا مرتب ہو جانا کچھ تھوڑی بات نہیں ۔ شہر میں بھلا کچھ نہیں تو سو دو سو غزلیں لوگوں کے زبان زد ہوں گی ۔ سچ ہے ، قبول سخن خدا داد بات ہے ۔ الغرض شاعری میں کلیم کی لن ترانیاں چنداں بے جا نہ تھیں ۔ لیکن دنیا کے معاملات میں ازبس کہ اس کو غور اور خوض کرنے کی عادت نہ تھی،

(بقیہ نوٹ ص ۲۶۵) مثنوی صرف چند چھوٹی بحروں میں کہی جاتی ہے ۔ رباعی : چار مصرعوں کی نظم جو ایک خاص بحر میں کہی جاتی ہے ۔ مقطع : قصیدہ یا غزل کا آخری شعر جس میں شاعر اپنا تخلص لاتا ہے ۔ تخلص نباہنا: مقطع میں اپنا تخلص اس خوبی سے باندھنا کہ اس میں اور شعر کے دیگر الفاظ میں ایک معنوی ربط پیدا ہوجائے۔ مومن کے مقطعوں میں یہ خوبی سب سے زیادہ پائی جاتی ہے۔ متاخرین : دور آخر کے شعراء۔ صنائع لفظی : وہ شعری صنعتیں جن کا تعلق ، (معنوی صنعتوں کے بر خلاف) لفظی خوبیوں سے ہوتا ہے ۔ بے ساختگی کی ادا : یہ بہت بڑا فنی کمال ہے کہ صنعتوں کے التزام (یا پابندی) کے باوجود کلام میں تصنع و تکلف کے بجائے برجستگی اور بے تکلفی پائی جائے ۔ تشبیب : قصیدے کا تمہیدی حصہ ۔ لن ترانیاں : مجازاً ڈینگیں مارنا ۔ ''لن ترانی'' کا لفظی ترجمہ ہے : 'تو مجھے ہرگز نہ دیکھ سکے گا'۔ یہ وہ ندائے غیبی ہے جو حضرت موسیٰ کو کوہِ طور پر ''رَبِّ اَرِنی''(اے خدا تو مجھے اپنا جلوہ دکھا) کے جواب میں سنائی دی ۔

اسی وجہ سے اکثر اس کی رائے غلطی پر ہوتی تھی ۔

وہ گھر سے نکل کر ایسا بے تکلف مرزا ظاہر دار بیگ کی طرف کو مڑا ، جیسے مطلق العنان گھوڑا تھان کی طرف رخ کرتا ہے ۔ مرزا کی ظاہر داری نے اس کو اس قدر دھوکا دے رکھا تھا کہ وہ ان کو ماں ، باپ ، بھائی ، بہن ، خویش و اقارب ، سب سے بڑھ کر اپنا خیر خواہ ، سب سے زیادہ اپنا دوست سمجھتا تھا ۔ اور بے امتحان ، بے آزمائش ، اس کو مرزا پر ایسا تکیہ و اعتماد تھا کہ شاید دانش مند آدمی کو ، متواتر تجربوں کے بعد بھی ، کسی دوست پر نہیں ہو سکتا ۔ بات اصل یہ ہے کہ مردم شناسی کی جو ایک صفت ہے ، کلیم میں مطلق نہ تھی ۔ مرزا سے زیادہ اس کو اپنی نسبت مغالطہ تھا ۔ اور اس نے اپنے تئیں ایسا عزیزالوجود[۲] فرض کر رکھا تھا کہ ایک سے ایک لائق نوکری کی جستجو میں مارے مارے پھرتے ہیں اور نہیں ملتی ، اور کلیم کے ذہن میں ازخود یہ خناس سمایا ہوا تھا کہ گویا تمام ہندوستانی سرکاریں اس کے قدوم میمنت لزوم کی متمنی اور منتظر ہیں اور جس طرف کو چل کھڑا ہوگا ، وہاں کا والی ملک اس کی تشریف آوری کو بس غنیمت سمجھے گا ۔ گھر سے نکلا تو محض تہی دست ، لیکن اس خیال

۲ ۔ عزیزالوجود : قابل قدر ہستی ، معزز شخصیت ۔ خناس: شیطان ، مراد شیطانی وسوسے ۔ سرکاریں : رجواڑے ، ریاستیں ۔ قدوم میمنت لزوم : بابرکت تشریف آوری ۔ کوئی دم جاتا ہے : تھوڑے ہی عرصے میں ۔ خزائن الارض : زمین (دنیا بھر) کے خزانے ۔ جوتیاں چٹخاتا ہوا : پا پیادہ ۔ فیل کوہ پیکر : پہاڑ جیسا گرانڈیل ہاتھی ۔ ہودج زر : سنہری ساز، کجاوہ یا ہودا ۔ خلعت ہفت پارچہ: وہ خلعت جو سات کپڑوں پر مشتمل ہو ۔

میں مگن کہ اب کوئی دم جاتا ہے کہ مالک خزائن الارض بننے والا ہوں ۔ چلا جوتیاں چٹخاتا ہوا مگر اس تصور میں مست کے فیلِ کوہ پیکر مع ہودج زر اس کی سواری کے لیے آ رہا ہے ۔ باوجودے کہ شب خوابی کے کپڑوں کے سوا بدن پر کچھ نہ تھا ، تاہم خلعتِ ہفت پارچہ کی امید میں :

نظر اس کی نخوت کے زینے پہ تھی
کہ شانوں سے آتری تو سینے پہ تھی

قصہ کوتاہ ، کلیم شیخ چلی کے سے منصوبے سوچتا ہوا اپنے دوست مرزا کے مکان پر پہنچا ۔ ہر چند ابھی کچھ ایسی بہت رات نہیں گئی تھی لیکن مرزا جیسے نکمے ، بے فکرے کبھی کی لمبی تان کر سو چکے تھے ۔ کلیم نے دروازے پر دستک دی تو جواب ندارد ۔ اس مقام پر مرزا کا تھوڑا سا حال لکھ دینا مناسب معلوم ہوتا ہے ۔ اس شخص کی کیفیت یہ تھی کہ شاید اس کا نانا ، وہ بھی حقیقی نہیں ، ابتدائے عمل داریِ سرِکار[3] میں صاحب رزیڈنٹ کی اردلی کا جمعدار[4] تھا ۔ اول تو ایسی عالی جاہ سرکار ، دوسرے باعتبار منصب اردلی کا جمعدار[4] ، تیسرے ان دنوں کی بے عنوانی ، اس پر خود اس کی رشوت ستانی ؛ بہت کچھ کمایا ۔ یہاں تک کہ اس کا اعتداد دلی کی ووداروں میں ہو گیا ۔ مرزا کی ماں اوائلِ عمر

۳ ۔ سرکار کمپنی بہادر (یعنی ایسٹ انڈیا کمپنی) کی حکومت کا ابتدائی زمانہ جب دھلی اور شمالی ھند کے علاقے پہلے پہل انگریزوں کے تسلط میں آئے تھے اور دھلی میں کمپنی کی طرف سے انگریز ریزیڈنٹ حکومت کرتا تھا ۔

۴ ۔ پہلے یہ لفظ اپنی اصل صورت میں ''جامعہ دار'' لکھا جاتا تھا ۔ اس کتاب کے ابتدائی نسخوں میں اسی طرح لکھا ہوا ہے ۔

میں بیوہ ہو گئی ۔ جمعدار نے ، باوجودیکہ دور کی قرابت تھی ، حسبةً للہ ، اس کا تکفّل اپنے ذمے لیا ۔ جمعدار اپنی حیات میں تو اتنا سلوک کرتا رہا کہ مرزا کو یتیمی اور اس کی ماں کو بیوگی بھول کر بھی یاد نہ آئی ہوگی لیکن جمعدار کے مرنے پر اس کے بیٹے ، پوتے ، نواسے کثرت سے تھے ، انھوں نے بے اعتنائی کی ۔ اور اگرچہ جمعدار بہت کچھ وصیت کر مرے تھے مگر ان کے ورثا نے بہ ہزار دقّت ، محل سرا کے پہلو میں ایک بہت چھوٹا سا قطعہ ان کے رہنے کو دیا ، اور سات روپے مہینے کے کرائے کی دوکانیں مرزا کے نام کرادیں ۔ یہ تو حال تھا کہ مرزا ، مرزا کی ماں، مرزا کی بیوی ، تین تین آدمی اور سات روپے کی کل کائنات؛ اس پر مرزا کی شیخی اور نمود ۔ یہ مسخرہ اس ہستی پر چاہتا تھا کہ جمعدار کے بیٹوں کی برابری کرے ، جن کو صدہا روپے ماہوار کی مستقل آمدنی تھی ۔ اگرچہ جمعدار والے اس کو منہ نہیں لگاتے تھے مگر یہ بےغیرت زبردستی ان میں گھستا تھا ۔ کسی کو ماموں جان ، کسی کو بھائی جان ، کسی کو خالو جان بناتا اور وہ لوگ اس کے ادعائی رشتوں ناتوں سے جلتے اور دق ہوتے ۔ اونچی حیثیت کے لوگوں میں بیٹھنا اس کے حق میں اور بھی زبوں تھا ۔ ان کی دیکھا دیکھی اس نے تمام عادتیں امیرزادوں کی سی اختیار کر رکھی تھیں ، مگر امیرزادگی نہ تھی تو کیسے نبھے ۔ دوکانیں گروی ہوتی جاتی تھیں ۔ ماں بےچاری بہتیرا بکتی مگر کون سنتا تھا ۔

مرزا کو جب دیکھو، پاؤں میں ڈیڑھ حاشیے کی جوتی[۵] ،

---

۵ - ایسا جوتا جس میں ، بہ نسبت عام جوتوں کے ، زری کے کام کا حاشیہ ڈیوڑھا چوڑا ہو ۔

سر پر دھری بیل کی بھاری کام‌دار ٹوپی، بدن میں ایک چھوڑ دو دو انگرکھے : اوپر شبنم یا ہلکی سی تن زیب، نیچے کوئی طرح دار سا ڈھاکے کا نینو[۶]۔ جاڑا ہوا تو بانات مگر سات روپے گز سے کم کی نہیں۔ خیر، یہ تو صبح و شام، اور تیسرے پہر کاشانی مخمل کی آصف خانی جس میں حریر کی سنجاف کے علاوہ گنگا جمنی کم‌خواب کی عمدہ بیل ٹنکی ہوئی۔ سرخ نیفہ۔ پائجامہ اگر ڈھیلے پائچوں کا ہوا تو کلی‌دار اور اس قدر نیچا کہ ٹھوکر کے اشارے سے دو دو قدم آگے، اور اگر تنگ مُہری کا ہوا تو نصف ساق تک چوڑیاں، اور اوپر جلد بدن کی طرح منڈھا ہوا۔ ریشمی ازاربند، گھٹنوں میں لٹکتا ہوا۔ اس میں بے قفل کی کنجیوں کا گچھا۔ غرض دیکھا تو مرزا صاحب اس ہیئت کذائی سے چھیلا بنے ہوئے، سر بازار، چھم چھم کرتے چلے جا رہے ہیں۔

کلیم سے اور مرزا سے محفل مشاعرہ میں تعارف پیدا ہوا۔ شدہ شدہ مرزا صاحب کلیم کے مکان پر تشریف لانے لگے۔ یہاں تک کہ اب چند روز سے تو دونوں میں ایسی گاڑھی چھننے لگی تھی کہ گویا یک جان و دو قالب تھے۔ کلیم کو تو مرزا کے مکان پر جانے کا کبھی بھی اتفاق نہیں ہوا مگر مرزا، شام کو تو کبھی کبھی، لیکن صبح کو بلا ناغہ آتے اور تمام تمام دن کلیم کے پاس رہتے۔ مرزا نے اپنا حالِ اصلی کلیم پر ظاہر نہیں ہونے دیا۔ کلیم یہی جانتا تھا کہ جمعدار

۶۔ ڈھاکے کا مشہور ململ۔ آصف خانی : نیم آستین، صدری۔ حریر کی سنجاف : ریشم کی گوٹ۔ کم خواب : بھاری کام دار کپڑا جو سنہری روپہلی بیل بوٹوں سے لپا ہوا ہوتا ہے۔ گنگا جمنی : نقرئی و طلائی یا سنہری اور روپہلی۔

کا تمام ترکہ مرزا کو ملا ، اور وہ جمعدار کی محل سرا کو مرزا کی محل سرا اور جمعدار کے دیوان خانے کو مرزا کا دیوان خانہ اور جمعدار کے بیٹے پوتوں کے نوکروں کو مرزا کے نوکر سمجھتا تھا ۔ اور اسی غلط فہمی میں وہ گھر سے نکلا تو سیدھا جمعدار کی محل سرا کی ڈیوڑھی پر جا موجود ہوا ۔ بار بار کے پکارنے اور کنڈی کھڑکھڑانے سے دو لونڈیاں چراغ لیے ہوئے اندر سے نکلیں ، اور ان میں سے ایک نے پوچھا : ”کون صاحب ہیں اور اتنی رات گئے کیا کام ہے ؟“

کلیم : ”جاؤ مرزا کو بھیج دو ۔“

لونڈی : ”کون مرزا ؟“

کلیم : ”مرزا ظاہر دار بیگ جن کا مکان ہے اور کون مرزا ۔“

لونڈی : ”یہاں کوئی ظاہردار بیگ نہیں ہے ۔“

اتنا کہہ کر قریب تھا کہ لونڈی پھر کواڑ بند کرلے کہ کلیم نے کہا : ”کیوں جی کیا یہ جمعدار صاحب کی محل سرا نہیں ہے ؟“

لونڈی : ”ہے کیوں نہیں ۔“

کلیم : ”پھر تم نے یہ کیا کہا کہ یہاں کوئی ظاہردار بیگ نہیں ۔ کیا ظاہردار بیگ جمعدار کے وارث اور جانشین نہیں ہیں ؟“

لونڈی : ”جمعدار کے وارثوں کو خدا سلامت رکھے ،

موا ظاہردار بیگ جمعدار کا وارث بننے والا کون ہوتا ہے۔"

دوسری لونڈی : "اری کم بخت ! یہ کہیں مرزا بانکے کے بیٹے کو نہ پوچھتے ہوں ۔ وہ ہر جگہ اپنے تئیں جمعدار کا بیٹا بنایا کرتا ہے ۔" (کلیم سے مخاطب ہو کر) "کیوں میاں! وہی ظاہردار بیگ نا ، جن کی رنگت زرد زرد ہے ، آنکھیں کرنجی ، چھوٹا قد ، دبلا ڈیل ، اپنے تئیں بہت بنائے سنوارے رہا کرتے ہیں ۔"

کلیم : "ہاں ہاں ، وہی ظاہردار بیگ ۔"

لونڈی : "تو میاں ، اس مکان کے پچھواڑے ، اُپلوں کی ٹال کے برابر ایک چھوٹا سا کچا مکان ہے ، وہ اس میں رہتے ہیں ۔"

کلیم نے وہاں جا آواز دی تو کچھ دیر بعد مرزاصاحب ننگ دھڑنگ ، جانگھیہ پہنے ہوئے باہر تشریف لائے اور کلیم کو دیکھ کر شرمائے اور بولے : "آہا! آپ ہیں ۔ معاف کیجیے گا ، میں نے سمجھا کوئی اور صاحب ہیں ۔ بندے کو کپڑا پہن کر سونے کی عادت نہیں ۔ میں ذرا کپڑے پہن آؤں تو آپ کے ہم رکاب چلوں ۔"

کلیم : "چلیے گا کہاں؟ میں آپ ہی کے پاس تک آیا تھا۔"

مرزا : "پھر اگر کچھ دیر تشریف رکھنا منظور ہو تو میں اندر پردہ کرادوں ۔"

کلیم : "میں آج شب کو آپ ہی کے یہاں رہنے کی نیت سے آیا ہوں ۔"

مرزا : ''بسم‌اللہ ، تو چلیے اسی مسجد میں تشریف رکھیے ؛ بڑی فضا کی جگہ ہے ۔ میں ابھی آیا ۔''

کلیم نے جو مسجد میں آکر دیکھا تو معلوم ہوا کہ ایک نہایت پرانی چھوٹی سی مسجد ہے ، وہ بھی مسجد ضرارہ[7] کی طرح ویران ، وحشت ناک ؛ نہ کوئی حافظ ہے نہ مُلا ، نہ طالب علم ، نہ مسافر ۔ ہزارہا چمگاڈریں اس میں رہتی ہیں کہ ان کی تسبیح بے ہنگام سے کان کے پردے پھٹے جاتے ہیں ۔ فرش پر اس قدر بیٹ پڑی ہے کہ بجائے خود کھرنجے کا فرش بن گیا ہے ۔

مرزا کے انتظار میں کلیم کو چار و ناچار اسی مسجد میں ٹھہرنا پڑا ۔ مرزا آئے بھی تو اتنی دیر کے بعد کہ کلیم مایوس ہو چکا تھا ۔ قبل اس کے کہ کلیم شکایت کرے ، مرزا صاحب ، بطور دفع دخل مقدر[8] ، فرمانے لگے کہ بندے کے گھر میں کئی دن سے طبیعت علیل ہے ؛ خفقان کا عارضہ، اختلاجِ قلب کا روگ ہے ۔ اب جو میں آپ کے پاس سے گیا تو ان کو غشی میں پایا ، اس وجہ سے دیر ہوئی ۔ پہلے یہ تو فرمائیے کہ اس وقت بندہ نوازی فرمانے کی کیا وجہ ہے؟''

کلیم نے باپ کی طلب ، اپنا انکار ، بھائی کی التجا ، ماں کا اصرار ، تمام ماجرا کہہ سنایا ۔

مرزا : ''پھر اب ارادہ کیا ہے ؟''

---

۷ ۔ وہ مسجد جسے منافقین نے مسلمانوں کو ضرر پہنچانے کے لیے (ضراراً) تعمیر کیا تھا ۔ اللہ تعالیٰ نے اس سازش سے آگاہ فرما دیا (سورۂ ۹ آیت ۱۰۷) اور یہ مسجد ڈھا دی گئی ۔

۸ ۔ پیش بندی کرتے ہوئے شکایت سے پہلے عذر کرنا ۔

کلیم : ''سوائے اس کے کہ اب گھر لوٹ کر جانے کا ارادہ تو نہیں ہے ، اور جو آپ کی صلاح ہو ۔''

مرزا : ''خیر ، نیت شب حرام ، صبح تو ہو ۔ آپ بے تکلف استراحت فرمائیے ۔ میں جا کر بچھونا وغیرہ بھیجے دیتا ہوں اور مجھ کو مریضہ کی تیمارداری کے لیے اجازت دیجیے کہ آج اس کی علالت میں اشتداد ہے ۔''

کلیم : ''یہ کیا ماجرا ہے ؟ تم تو کہا کرتے تھے کہ ہمارے یہاں دھری محل سرائیں ، متعدد دیوان خانے ، کئی پائیں باغ ہیں ۔ حوض اور حمام اور کٹرے اور گنج اور دوکانیں اور سرائیں ، میں تو جانتا ہوں کہ عمارت کی قسم سے کوئی چیز ایسی نہ ہوگی جس کو تم نے اپنی ملک نہ بتایا ہو؛ یا یہ حال ہے کہ ایک متنفس کے واسطے ایک شب کے لیے تم کو جگہ میسر نہیں ۔ جو جو حالات تم نے اپنی زبان سے بیان کیے ، ان سے یہ ثابت ہوتا تھا کہ جمعدار کے تمام ترکے پر تم قابض اور متصرف ہو ۔ لیکن میں اس تمام جاہ و حشمت کا ایک شمّہ بھی نہیں دیکھتا ۔''

مرزا : ''آپ کو میری نسبت سخن سازی کا احتمال ہونا سخت تعجب کی بات ہے ۔ اتنی مدت مجھ سے آپ سے صحبت رہی ، مگر افسوس ہے آپ نے میری طبیعت اور میری عادت کو نہ پہچانا ۔ یہ اختلافِ حالت جو آپ دیکھتے ہیں ، اس کی ایک وجہ ہے ۔ بندے کو جمعدار صاحب مرحوم و مغفور نے متبنٰی کیا تھا اور اپنا جانشین کر مرے تھے ۔ شہر کے کل رؤسا اس سے واقف اور آگاہ ہیں ۔ ان کے انتقال کے بعد لوگوں نے اس میں رخنہ اندازیاں کیں ۔ بندے کو

آپ جانتے ہیں کہ بکھیڑے سے کوسوں دور بھاگتا ہے ۔
صحبتِ نا ملائم دیکھ کر کنارہ کش ہو گیا ۔ لیکن کسی
کو انتظام کا سلیقہ ، بندوبست کا حوصلہ نہیں ۔ اسی روز سے
اندر باہر واویلا مچی ہوئی ہے ، اور اس بات کے مشورے
ہو رہے ہیں کہ بندے کو منا لے جائیں ۔''

کلیم : ''لیکن آپ نے اس کا تذکرہ کبھی نہیں کیا ۔''

مرزا : ''اگر میں آپ سے یا کسی سے تذکرہ کرتا تو
استقلال مزاج سے بے بہرہ اور غیرت و حمیت سے بے نصیب
ٹھہرتا ۔ اب آپ کو کھڑے رہنے میں تکلیف ہوتی ہے؛ اجازت
دیجیے کہ میں جا کر بچھونا بھجوا دوں اور مریضہ کی
تیمارداری کروں ۔

کلیم : ''خیر ، مقام مجبوری ہے ۔ لیکن پہلے ایک چراغ
تو بھیج دیجیے ؛ تاریکی کی وجہ سے طبیعت اور بھی
گھبراتی ہے ۔''

مرزا : ''چراغ کیا میں نے تو لمپ روشن کرانے کا
ارادہ کیا تھا لیکن گرمی کے دن ہیں ، پروانے بہت جمع
ہو جائیں گے اور آپ زیادہ پریشان ہوجیے گا ۔ اور اس مکان
میں ابابیلوں کی کثرت ہے ؛ روشنی دیکھ کر گرنے شروع
ہوں گے اور آپ کا بیٹھنا دشوار کر دیں گے ۔ تھوڑی دیر
صبر کیجیے کہ ماھتاب نکلا آتا ہے ۔''

کلیم جب گھر سے نکلا تو کھانا تیار تھا لیکن وہ اس
قدر طیش میں تھا کہ اس نے کھانے کی مطلق پروا نہ کی
اور بے کھائے نکل کھڑا ہوا ۔ مرزا سے ملنے کے بعد وہ

منتظر تھا کہ آخر مرزا خود پوچھیں ہی گے تو کہہ دوں گا۔ مرزا کو ہر چند کھانے کی نسبت پوچھنا ضرور تھا، کیوں کہ اول تو کچھ ایسی رات زیادہ نہیں گئی تھی؛ دوسرے یہ اس کو معلوم ہو چکا تھا کہ کلیم گھر سے اڑ کر نکلا ہے؛ تیسرے دونوں میں بے تکلفی غایت درجے کی تھی۔ لیکن مرزا قصداً اس بات سے متعرض نہ ہوا، اور کلیم بے چارے کا بھوک کے مارے یہ حال کہ مسجد میں آنے سے پہلے اس کی انتڑیوں نے قل ھو اللہ پڑھنی شروع کر دی تھی۔ جب اس نے دیکھا کہ مرزا کسی طرح اس پہلو پر نہیں آتا اور عن قریب تمام شب کے واسطے رخصت ہوا چاہتا ہے، تو بے چارے نے بے غیرت بن کر خود کہا کہ سنو یار، میں نے کھانا بھی نہیں کھایا۔

مرزا: ”سچ کہو! نہیں جھوٹ، بہکاتے ہو۔“

کلیم: ”تمھارے سر کی قسم، میں بھوکا ہوں۔“

مرزا: ”تو مردِ خدا، آتے ہی کیوں نہیں کہا؟ اب اتنی رات گئے کیا ہو سکتا ہے۔ دوکانیں سب بند ہوگئیں اور جو دو ایک کھلی بھی ہیں تو باسی چیزیں رہ گئی ہوں گی، جن کے کھانے سے فاقہ بہتر ہے۔ گھر میں آج آگ تک نہیں سلگی۔ مگر ظاہرا تم سے بھوک کی سہار ہونی مشکل معلوم ہوتی ہے۔ دیوِ اشتہا کو زیر کرنا بڑی ہمت والوں کا کام ہے۔ ایک تدبیر سمجھ میں آتی ہے کہ جاؤں چھدامی بھڑبھونجے کے یہاں سے گرما گرم خستہ چنے کی دال بنوا لاؤں۔ بس ایک دھیلے کی مجھ کو تم کو دونوں کو کافی ہوگی؛ رات کا وقت ہے۔“

ابھی کلیم کچھ کہنے بھی نہیں پایا تھا کہ مرزا جلدی سے اٹھ باہر گئے اور چشم زدن میں چنے بھنوا لائے ۔ مگر دھیلے کے کہہ کر گئے تھے ، یا تو کم کے لائے یا راہ میں دو چار پھنکے لگا لیے ، اس واسطے کہ کلیم کے روبرو دو تین مٹھی چنے سے زیادہ نہ تھے ۔

مرزا : ''یار ، ھو تم بڑے خوش قسمت کہ اس وقت بھاڑ مل گیا ۔ ذرا، واللہ ھاتھ تو لگاؤ ، دیکھو تو کیسے بھلس رھے ھیں ، اور سوندھی سوندھی خوش بو بھی عجب ھی دل فریب ھے کہ بس بیان نہیں ھو سکتا ۔ تعجب ھے کہ لوگوں نے خس اور مٹی کا عطر نکالا مگر بھنے ھوئے چنوں کی طرف کسی کا ذھن منتقل نہیں ھوا ۔ کوئی فن ھو ، کمال بھی کیا چیز ھے ۔ دیکھیے ، اتنی تو رات گئی ھے مگر چھدامی کی دکان پر بھیڑ لگی ھوئی ھے ۔ بندے نے تحقیق سنا ھے کہ حضور والا کے خاصے میں چھدامی کی دوکان کا چنا بلاناغہ لگ کر جاتا ھے[۹] ۔ اور واقع میں آپ ذرا غور سے دیکھیے ، کیا کمال کرتا ھے کہ بھوننے میں چنوں کو سڈول بنا دیتا ھے ۔ بھئی تمھیں میرے سر کی قسم سچ کہنا ، ایسے خوب صورت ، خوش قطع ، سڈول چنے تم نے پہلے بھی کبھی دیکھے تھے ؟ دال بنانے میں اس کو یہ کمال حاصل ھے کہ

۹ ۔ مختلف اندرونی شواھد کی بنا پر قیاس کیا جاتا ھے کہ اس قصے کا زمانہ انقلاب ۱۸۵۷ء کے بعد کا دور ھے ۔ لیکن یہاں ''حضور والا'' اور ''خاصے'' کے الفاظ سے واضح اشارہ بہادر شاہ ظفر کی طرف ھے ۔ اگر اسے صحیح مانا جائے تو ناول کا سارا تاریخی و معاشرتی پس منظر غلط ٹھہرے گا ۔ گمان غالب یہ ھے کہ مصنف نے ''جاتا ھے'' کے بجائے ''جاتا تھا'' لکھا ھوگا مگر سہو کتابت کی اصلاح نہ ھو سکی ۔

کسی دانے پر خراش تک نہیں، ڈوٹنے پھوٹنے کا کیا مذکور۔ اور دانوں کی رنگت دیکھیے۔ کوئی بسنتی ہے، کوئی پستئی، غرض دونوں رنگ خوش نما۔ یوں تو صدھا قسم کے غلے اور پھل زمین سے آگتے ہیں لیکن چنے کی لذت کو کوئی نہیں پاتا۔ آپ نے وہ ایک ظریف کی حکایت سنی ہے؟''

کلیم : ''فرمائیے۔''

مرزا : ''چنا ایک مرتبہ حضرت میکائیل کی خدمت میں جن کو ارزاق عباد کا اہتمام سپرد ہے فریاد لے کر گیا کہ یا حضرت میں نے ایسا کیا قصور کیا ہے کہ جوں میں نے سر زمین سے نکالا تیر ستم چلنے لگا۔ ماکولات اور بھی ہیں، مگر جیسے جیسے ظلم مجھ پر ہوتے ہیں کسی اور پر نہیں ہوتے۔ نشو و نما کے ساتھ تو میری قطع و برید ہونے لگتی ہے۔ میری کوپلوں کو توڑ کر آدمی ساگ بناتے اور مجھے کچے کو کھا جاتے ہیں۔ جب ذرا بارور ہوا تو خدا جھوٹ نہ بلوائے، آدمی بکری بن کر لاکھوں من بونٹ چر جاتے ہیں۔ اس سے نجات ملی تو ہولے کرنے شروع کیے۔ پکا تو شاخ و برگ، بھس بن کر بیلوں اور بھینسوں کے دوزخِ شکم کا ایندھن ہوا۔ رہا دانہ، اس کو چکی میں دلیں، گھوڑوں کو کھلائیں، بھاڑ میں بھونیں، بیسن بنائیں، کھولتے ہوئے پانی میں آبالیں، گھنگھنیاں پسائیں۔ غرض شروع سے آخر تک مجھ پر طرح طرح کی آفتیں نازل رہتی ہیں۔ چنے کا حضرت میکائیل کے دربار میں اس طرح پر بےبیاکانہ چٹر پٹر بولنا سن کر حاضرین دربار اس قدر ناخوش ہوئے کہ ہر شخص اسے کھانے کو دوڑا۔ چناں چہ یہ ماجرا

دیکھ کر بے انتظارِ حکم اخیر رخصت ہوا ۔ سوحضرت ، یہ چنے ایسے لذت کے بنے ہیں کہ فرشتوں کے دندانِ آز بھی ان پر تیز ہیں ۔ افسوس ہے کہ اس وقت نمک مرچ بہم نہیں پہنچ سکتا ، ورنہ میر مدو کے کبابوں میں یہ خستگی اور یہ سوندھا پن کہاں ؟''

غرض ، مرزا نے اپنی چرب زبانی سے چنوں کو گھی کی تلی دال بنا کر اپنے دوست کلیم کو کھلایا ۔ کلیم بھوکا تو تھا ہی ، اس کو بھی ہمیشہ سے کچھ زیادہ مزے دار معلوم ہوئے ۔ مرزا نے گھرجا کر ایک میلی دری اور ایک کثیف سا تکیہ بھیج دیا ۔ دو ہی گھڑی میں کلیم کی حالت کا اس قدر متغیر ہونا عبرت کا مقام ہے ۔ یا تو خلوت خانہ اور عشرت منزل میں تھا یا اب ایک مسجد میں آ کر پڑا اور مسجد بھی ایسی جس کا تھوڑا سا حال ہم نے اوپر بیان کیا ۔ گھر کے الوانِ نعمت کو لات مار کر نکلا تھا تو پہلے ہی وقت چنے چبانے پڑے ۔ نہ چراغ نہ چار پائی ، نہ بہن نہ بھائی ، نہ مونس نہ غم خوار ، نہ نوکر نہ خدمت گار ۔ مسجد میں اکیلا ایسا بیٹھا تھا جیسے قید خانے میں حاکم کا گنہ گار ، یا قفس میں مرغ نو گرفتار ۔ اور کوئی ہوتا تو اس حالت پر نظر کر کے تنبیہ پکڑتا ، اپنی حرکت سے توبہ اور اپنے افعال سے استغفار کرتا ، اور اسی وقت نہیں تو سویرے گجردم باپ کے ساتھ نماز صبح میں جا شریک ہوتا ۔ لیکن کلیم کو اور بہت سے مضمون سوچنے کو تھے ۔ اس نے رات بھر میں ایک قصیدہ تو مسجد کی ہجو میں تیار کیا اور ایک مثنوی مرزا کی شان میں ۔

صبح ہوتے آنکھ لگ گئی ، تو نہیں معلوم مرزا یا محلے کا کوئی اور عیار ، ٹوپی ، جوتی ، رومال ، چھڑی ، تکیہ ، دری ، یعنی جو چیز کلیم کے بدن سے منفک اور اس کے جسم سے جدا تھی ، لے کر چمپت ہوا ۔ یوں بھی کلیم بہت دیر کو سو کے اٹھتا تھا اور آج تو ایک وجہ خاص تھی ۔ کوئی پہر سوا پہر دن چڑھے جاگا تو دیکھتا کیا ہے کہ فرش مسجد پر پڑا ہے ، اور نیند کی حالت میں جو کروٹیں لی ہیں تو سیروں گرد کا بھبھوت اور چمگاڈروں کی بیٹ کا ضماد بدن پر تھپا ہوا ہے ۔ حیران ہوا کہ قلب ماہیت ہو کر میں کہیں بھتنا تو نہیں بن گیا ۔ مرزا کو ادھر دیکھا آدھر دیکھا ، کہیں پتا نہیں ۔ مسجد تھی ویران ، اس میں پانی کہاں ۔ صبر کر کے بیٹھ رہا کہ کوئی اللہ کا بندہ ادھر کو آ نکلے تو اس کے ہاتھ مرزا کو بلواؤں ، اور یا منہ ہاتھ دھو کر خود مرزا تک جاؤں ۔ اس میں دوپہر ہونے آئی ۔ بارے ایک لڑکا کھیلتا ہوا آیا ۔ جونہی زینے پر چڑھا کہ کلیم اس سے عرض مطلب کرنے کے لیے لپکا ۔ وہ لڑکا اس کی ہیئت کذائی دیکھ ڈر کر بھاگا ۔ خدا جانے اس نے اس کو بھوت سمجھا یا سڑی خیال کیا ۔ کلیم نے بہتیرا پکارا اس لڑکے نے پیٹھ پھیر کر نہ دیکھا ۔

ناچار کلیم نے بہ ہزار مصیبت دوسرے فاقے سے شام پکڑی اور جب اندھیرا ہوا تو الو کی طرح اپنے نشیمن سے نکلا ۔ سیدھا مرزا کے مکان پر گیا اور آواز دی تو یہ جواب ملا کہ وہ تو بڑے سویرے کے قطب صاحب [۱۰] سدھارے

---

۱۰ ـ مراد قصبہ مہرولی (نواح دہلی میں) جہاں 'قطب صاحب' یعنی حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کا مزار مبارک ہے ۔

ھیں - کلیم نے چاھا کہ اپنا تعارف ظاھر کرکے ممکن ھو تو منہ ھاتھ دھونے کو پانی مانگے اور مرزا کی پھٹی پرانی جوتی اور ٹوپی ، تاکہ کسی طرح گلی کوچے میں چلنے کے قابل ھو جائے - یہ سوچ کر اس نے کہا : ''کیوں حضرت ، آپ مجھ سے بھی واقف ھیں ؟''

اندر سے آواز آئی : ''ھم تمھاری آواز تو نہیں پہچانتے ، اپنا نام و نشان بتاؤ تو معلوم ھو -''

کلیم : ''میرا نام کلیم ھے ، اور مجھ سے اور مرزا ظاھرداربیگ سے بڑی دوستی ھے - بلکہ شب کو میں مرزا صاحب ھی کی وجہ سے مسجد میں تھا -''

گھر والے : ''وہ دری اور تکیہ کہاں ھے جو رات تمھارے سونے کے لیے بھیجا گیا تھا ؟''

تکیہ اور دری کا نام سن کر تو کلیم بہت چکرایا اور ابھی جواب دینے میں متامل تھا کہ اندر سے آواز آئی : ''مرزا زبردست بیگ ! دیکھنا ، یہ مردوا کہیں چل نہ دے - دوڑ کر تکیہ دری تو اس سے لو -''

کلیم یہ سن کر بھاگا - ابھی گلی کے نکڑ تک نہیں پہنچا تھا کہ زبردست نے 'چور چور' کرکے جا لیا - ھر چند کلیم نے مرزا ظاھر دار بیگ کے ساتھ اپنے حقوق معرفت ثابت کیے مگر زبردست کا ٹھینگا سر پر ، اس نے ایک نہ مانی اور پکڑ کر کوتوالی لے گیا - کوتوال نے سرسری طور پر دونوں کا بیان سنا اور کلیم سے اس کا حسب نسب پوچھا -

ھر چند ، کلیم اپنا پتا بتانے میں جھینپتا تھا مگر چار و ناچار اس کو بتانا پڑا ۔ لیکن اس کی حالت ظاھری ایسی ابتر ھو رھی تھی کہ اس کا سچ بھی جھوٹ معلوم ھوتا تھا ۔ کوتوال نے سن کر یہی کہا کہ میاں نصوح جن کو تم اپنا والد بتاتے ھو ، میں ان کو خوب جانتا ھوں اور یہ بھی مجھ کو معلوم ھے کہ ان کے بڑے بیٹے کا یہی نام ھے جو تم نے اپنا بیان کیا ھے ۔ محلے کا پتا ، گھر کا نشان بھی جو تم نے کہا ، سب ٹھیک ھے ۔ مگر کلیم تو ایک مشہور و معروف آدمی ھے ۔ آج شہر میں اس کی شاعری کی دھوم ھے ۔ تمھاری یہ حیثیت کہ ننگے سر ، ننگے پاؤں ، بدن پر کیچڑ تھپی ھوئی ۔ مجھ کو باور نہیں ھوتا ۔ اچھا ، اب رات کو کیا ھو سکتا ھے ۔ جرم سنگین ھے ۔ ان کو حوالات میں رکھو ۔ صبح ھو ، میں ان کے والد کو بلواؤں تو ان کے بیان کی تصدیق ھو ۔

کلیم یہ سن کر رو دیا اور کہا کہ میں وھی بد نصیب ھوں جس کی شعر گوئی کا شہرہ آپ نے سنا ھے ۔ آپ کو یقین نہ ھو تو میں اپنے افکار تازہ آپ کو سناؤں ۔ چناں چہ کل شب کو جو کچھ مسجد و مرزا کی شان میں کہا تھا ، سنایا ۔ اس پر کوتوال نے اتنی رعایت کی کہ دو سپاھی کلیم کے ساتھ کیے اور ان کو حکم دیا کہ ان کو میاں نصوح کے پاس لے جاؤ ۔ اگر وہ ان کو اپنا فرزند بتائیں تو چھوڑ دینا ، ورنہ واپس لا کر حوالات میں رکھنا ۔

کلیم پر اس کیفیت سے باپ کے روبرو آنا جیسا کچھ شاق گزرا ھوگا ، ظاھر ھے ، مگر کیا کر سکتا تھا ۔ سپاھی اس کو

کشاں کشاں لے ہی گئے ۔ محلے کی مسجد ، جس میں نصوح نماز پڑھا کرتا تھا ، اس کے گھر سے بہت ہی قریب تھی ۔ صحن مسجد میں ایک شاداب چمن تھا اور چمن کے بیچوں بیچ ، ایک پکا ، مرتفع چبوترا ۔ عجب تفریح کا مقام تھا ۔ نصوح ، بیش تر نماز عشا کے بعد ، خصوصاً چاندنی راتوں میں ، اس چبوترے پر بیٹھ کر پھول بوٹوں میں خدا وند تعالیٰ کی صنعت کا ملاحظہ کیا کرتا تھا ۔ اس کو بیٹھا دیکھ کر دوسرے نمازی بھی جمع ہو جاتے تھے ، اور نصوح کو وعظ پند کے طور پر ان کے ساتھ گفتگو کرنے کا موقع ملتا تھا ۔

نصوح اور اس کے مستمعین ، مسجد کے چبوترے پر جمع ہوتے جاتے تھے ، کہ کوتوالی کے سپاہی کلیم کو لیے آ پہنچے ۔ یہ اتفاق مِن جانب اللہ شاید اس وجہ سے پیش آیا کہ جو لوگ کلیم کی نظر میں صرف اس وجہ سے ذلیل تھے کہ وہ اپنے خالق کی پرستش کرتے تھے ، یا اپنے اور بال بچوں کے پیٹ بھرنے کے لیے محنت مزدوری کر کے بہ وجہ حلال روزی پیدا کرتے تھے ، اُن کے سامنے اس کی گردنِ نخوت نیچی ہو۔ اب وہ انھی قلاؤذیوں ، اور مردہ شویوں ، اور بِھک منگوں ، اور ٹُکڑ گداؤں کے روبرو اس حیثیت سے کھڑا تھا کہ منکر نکیر کی طرح دو سپاہی اس کی گردن پر سوار تھے ۔ نہ سر پر ٹوپی ، نہ پاؤں میں جوتی۔ دو وقت کے فاقے سے منہ سوکھ کر ذری سا نکل آیا تھا ، آنکھوں میں حلقے پڑ گئے تھے ، ہونٹوں پر پپڑیاں جم رہی تھیں۔ کپڑوں کا وہ حال تھا کہ ایسے لباس سے ننگا ہوتا تو بہتر تھا ۔

جوں نصوح کی نظر بیٹے پر پڑی گویا ایک تیر سا کلیجے میں لگ گیا ۔ اگر پہلا سا نصوح ہوتا تو نہیں معلوم عورتوں کی طرح ڈاڑھیں مار کر روتا ، یا سر پیٹنے لگتا ، یا دوڑ کر بیٹے کو لپٹ جاتا ، یا سپاہیوں سے بے پوچھے گچھے دست و گریبان ہو پڑتا ، یا خدا جانے اضطرابِ جاہلانہ میں کیا کرتا ۔ مگر اب اس کی جملہ حرکات و سکنات ، معلم دین داری کی مطیع ، اور مؤدب خدا پرستی کی تابع تھیں ۔ اس نے ایک دم آہ سرد بھر کر ''اِنّا لِلّٰہِ وَ اِنّا اِلَیہِ رَاجِعُون'' تو کہا اور اُف بھی نہ کی ۔ سپاہیوں نے اس سے کلیم کی نسبت پوچھا تو اس نے آنکھیں نیچی کر کے کہا کہ جب حضرت نوح[11] اپنے بیٹے کو ڈوبتے دم تک 'بیٹا بیٹا' پکارتے گئے تو میں اس کے فرزند ہونے سے کیوں کر انکار کر سکتا ہوں۔ سپاہی تو اتنا سن کر رخصت ہوئے ، اور کلیم کو رفقائے نصوح میں سے کسی نے ہاتھ پکڑ کر اپنے پہلو میں بٹھا لیا ۔ نصوح بیٹے کی طرف مخاطب ہو کر بولا : ''کیوں کلیم ، میں نے ایسا کون سا قصور کیا تھا کہ تم کو میری طلعت منحوس تک دیکھنی گوارا نہ ہوئی ؟ تم اس بات سے انکار نہیں کرسکتے کہ شفقتِ اولاد ، ماں باپ کی طینت میں مخمر اور ان کی جبلت میں داخل ہے ۔ وہ شفقت جو اس وقت مجھ کو اس بات کی محرک ہوئی کہ میں سپاہیوں کے پنجے سے تمھاری نجات کا

۱۱ - حضرت نوح کا بیٹا کنعان ، بار بار فہمائش کے باوجود ایمان نہیں لایا ۔ جب خدا کا قہر و غضب طوفان کی صورت میں نازل ہوا تو حضرت نوح نے آخری بار اسے پکارا کہ کافروں کا ساتھ چھوڑ کر کشتی میں آجائے لیکن وہ نہ مانا اور غرقاب ہو گیا ۔ قرآن مجید کی سورۂ ہود میں اس واقعے کا ذکر آیا ہے ۔ (سورہ ۱۱ ، آیات ۴۲ - ۴۱ اور ۴۶ - ۴۵)

باعث ہوا ، وہی شفقت مجھ کو اس بات پر بھی مجبور کرتی ہے اور کرے گی کہ میں تم کو ایسی راہ نہ چلنے دوں ، جو تمہاری ابدی ہلاکت کا باعث اور دائمی تباہی کا موجب ہو ۔ میں نے تم سے نہیں کہا کہ میرے لیے کمائی کرو ، میری آسائش کے واسطے اپنے اوپر تکلیف اٹھاؤ ، اور اگر میں ایسا کہتا بھی تو مجھ کو اس کا منصب اور حق تھا ۔ میں نے جس کمائی کو کہا وہ تمہارے ہی کام آئے گی ، اور جس محنت کی تم کو تکلیف دی وہ تمہی کو آرام دے گی ۔ اگر کسی بیمار کا طبیب مہربان سے پرہیز کرنا ، کسی سیاح کا بدرقۂ خیرخواہ سے گریز کرنا ، روا ہے تو بے شک تم بھی مجھ سے نفرت رکھ سکتے ہو ۔ کیوں کلیم ، کیا ہمیشہ تمہاری خوشی مجھ کو منظور ، تمہاری رضا جوئی مجھ کو ملحوظ نہیں رہی ؟ اب جو تم نے مجھ کو اپنا دشمن قرار دیا ، اپنا عدو ٹھہرایا ، تو دشمنی کا سبب ، عداوت کا موجب ؟

میں نے سنا ہے کہ تم مجھ کو دیوانہ اور مجنون اور مختل الحواس تجویز کرتے ہو ۔ سو میں تمہاری اس تشخیص صحیح اور تجویز درست اور اس فراست صائب پر جرح نہیں کرتا ۔ میں باؤلا اور سڑی اور پاگل سہی ، لیکن اگر کوئی باؤلا تمہاری راہ میں کانٹے پڑے دیکھ کر تم کو آگاہ کرے تو کیا اس کی بات کو نہ سننا ، اس کی نصیحت کو نہ ماننا ، اس کی فریاد کی طرف ملتفت نہ ہونا ، شیوۂ دانش مندی ہے؟ پھر تم کو یہ بھی سوچنا چاہیے تھا ، اور چاہیے کہ آیا میں اکیلا اس جنون میں مبتلا ہوں یا اور بندگان خدا بھی میری ہی سی رائے ، میرے ہی سے خیالات رکھتے ہیں ۔ کلیم !

میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ جتنے بزرگان دین ہو گزرے ہیں (خدا ان کی پاکیزہ اور مطہر روحوں پر رحمت کاملہ نازل کرے) اور جتنے نیک بندے اب موجود ہیں (خدا ان کی حیات میں برکت دے) کوئی اس جنون سے خالی نہیں۔ بلکہ جس کو جتنا یہ جنون زیادہ ، اسی قدر وہ برگزیدہ اور خدا رسیدہ زیادہ۔

کیا اس بات کا اقرار کرنا جنون ہے ، کہ ہم بندے ہیں ، اور اس کا بھی ہم پر کچھ حق ہے جس نے ہم کو پیدا کیا ، جوہم کو روزی دیتا ہے ، جوہم کو جِلاتا ہے اور مارتا ہے ، جو پانی برساتا اور زمین سے ہمارے لیے سرمایۂ حیات اگاتا ہے ، جس نے ہماری جانوں کی شادابی اور تازگی کے لیے آبِ شیریں و خوش گوار کے سوتے زمین میں جاری کر رکھے ہیں اور ہماری روحوں کے انبساط کے لیے ہوا کا ذخیرۂ کافی مہیا فرما دیا ہے ، جس کے حکم سے چاند سورج اپنے معمول سے نکلتے اور غروب ہوتے ہیں تاکہ کام کرنے کے لیے دن ہو اور آرام لینے کے لیے رات ، جس نے دنیا کے قوی ہیکل اور زبردست جانوروں کو ہمارا مطیع و منقاد بنا دیا ہے کہ ان سے ہم سواری لیتے ، ان پر اپنا بوجھ لادتے اور ان کے گوشت پوست اور دودھ سے مستفید ہوتے ہیں ، جس نے انسان کو گویائی و بیان کی قوت عطا کی ہے جس کے ذریعے سے وہ اپنا مافی الضمیر ابنائے جنس پر ظاہر کر سکتا ہے ، جس نے انسان ضعیف البنیان کو عقل کی قوت اور دانش کی طاقت دے کر روئے زمین کا بادشاہ اور مخلوق کا حاکم بنایا ہے ، جس نے کائنات میں سے ہر موجود

کو اس کی مناسب حالت پر خلق کیا ہے ۔ اگر دنیا کے سارے درخت قلموں میں صرف کر دیے جائیں ، اور ساتوں سمندر کا پانی سیاہی کی جگہ کام میں لایا جائے، اور پڑھے لکھے لوگ جتنے ابتدائے آفرینش سے اب تک ہو چکے اور اب موجود ہیں اور آئندہ پیدا ہونے والے ہیں ، سب کے سب مل کر اس کی تعریف ، اس کے احسانات ، اس کے انعامات ، روز قیامت تک بیٹھے لکھا کریں ، تو گھستے گھستے درخت ہو چکیں ، سمندر سوکھ جائیں ، لکھنے والے تھک کر بیٹھ رہیں ، مگر اس کے حقِ واجب کا ایک عشرِ عشیر بھی ادا نہ ہو[12] ۔

کلیم ! فنا ایک ایسی بدیہی بات ہے کہ دنیا میں کوئی اس کا منکر نہیں اور نہ اس سے انکار ممکن ہے ۔ ہیضے کی وبا کو دفع ہوئے برس نہیں گزرے ، تمھارے دیکھتے کیسے کیسے لوگ ، ہٹے کٹے ، توانا ، اچھے بچھے ، چلتے پھرتے ، امیر غریب ، عالم جاہل ، بھلے اور برے ، سبھی طرح کے صدہا ہزارہا ، ہدفِ تیرِ قضا ہو گئے ۔ سدا رہے نام اللہ کا ۔ وبا پر کیا منحصر ہے ؛ وعدے سے دم زیادہ نہ کم ، مرنا برحق ۔ اچھا ، مرے پیچھے کیا ہوگا؟ وہی عقیل ہے ، وہی فہیم ، وہی زیرک ، وہی دانش مند ، جو اس سوال کا جواب

---

۱۲ - قرآن مجید (سورۂ لقمان) میں اسی مضمون کی ایک آیت ہے جس کا ترجمہ درج ذیل ہے :

”زمین میں جتنے درخت ہیں اگر وہ سب کے سب قلم بن جائیں اور یہ جو سمندر ہیں ، ان کے علاوہ سات سمندر اور شامل کر لیے جائیں (غرض ان تمام قلموں اور سیاہیوں سے اللہ کی باتیں لکھی جائیں) تب بھی اللہ کی باتیں ختم نہ ہوں ۔ (سورہ ۳۱ آیت ۲۷)“

معقول دے ، جو اس معمے کو حل کرے ، جو یہ پہیلی بوجھے ۔

کایم ! انسان کی خاص طرح کی خلقت یعنی اس کا وجود عاقل ہونا اس بات کا مقتضی ہے کہ ضرور اس سے کوئی بڑی خدمت متعلق اور اس کے ذمے زیادہ جواب دہی ہے ۔ اگر اس کا صرف یہی کام ہوتا کہ پیٹ بھر لے اور سو رہے ، اور گرمی سردی سے اپنے تئیں بچائے ، تو اس کے لیے زیادہ عقل کی ضرورت نہ تھی ۔ جانور اپنے بڑے بڑے جثوں کی پرداخت پر بخوبی قادر ہیں ، حالاں کہ عقل سے بے بہرہ اور دانش سے بے نصیب ہیں ۔ پس اس خدمت اور اس ذمہ داری کو دریافت کرنا شرط انسانیت ہے ۔"

نصوح کا وعظ سن کر اس کے همراهیوں کے دلوں میں دین داری کے ولولے اور خدا پرستی کے جوش تازہ ہوگئے ۔ حاضرین میں کایم کے سوا کوئی متنفس نہ تھا جس پر تھوڑی یا بہت رقت طاری نہ ہوئی ہو ۔ لیکن کایم، بہ قول سعدی شیرازی :

با سیہ دل چہ سود گفتنِ وعظ
نہ رود میخِ آهنی در سنگ[۱۳]

سکوت کی حالت میں سرنگوں تھا ۔ اس کا سکوت یا تو اس وجہ سے تھا کہ نصوح کا سلسلۂ سخن بلا فصل تھا اور اس کو بیچ میں بات کہنے کا موقع نہیں ملتا تھا ، یا دوسرے دوسرے منصوبے سوچ رہا تھا ۔ اس کا سرنگوں

---

۱۳ - جس کا دل سیاہ ہو اس کے سامنے وعظ کہنے سے کیا فائدہ ۔ (جیسے) لوہے کی میخ پتھر میں نہیں گڑتی ۔

ہونا بھی کچھ گناہ کی ندامت سے نہ تھا ، بلکہ حالت کی شناعت سے ۔ جب نصوح نے دیکھا کہ وہ ہاں یا نہیں کچھ بھی نہیں کہتا ، تو اس نے ذرا گرم ہو کر اتنی بات کہی کہ بڑی دقت تمھارے معاملے میں مجھ کو یہ درپیش ہے کہ تمھارا مافی‌الضمیر مجھ پر منکشف نہیں ہوتا ۔ شروع میں تم نے میرے سامنے آنے سے گریز کیا اور اب مواجہ بھی ہوا تو بے سود ۔

ابھی تک کلیم نے کوئی لفظ منہ سے نہیں نکالا تھا ، کہ نصوح کے ہمراہی جو کلیم کے حالات سے واقف تھے اور یہ بھی جانتے تھے کہ وہ دین داری کی تاکید پر گھر سے نکل گیا ہے ، بول اٹھے کہ اے حضرت ، میاں کلیم ماشاءاللہ بڑے ذہین اور زیرک اور عاقل ہیں ؛ جو آپ نے فرمایا انھوں نے گرہ باندھا ۔ اگرچہ باقتضائے سن ، اب تک لہو و لعب کی طرف متوجہ تھے مگر اب آپ دیکھیے گا کہ انشاءاللہ ایسے جوان صالح اور متشرع اور متقی بنیں گے کہ اپنے ہم‌عمروں کے لیے نمونہ ہوں گے ۔ آپ گھر میں تشریف لے جائیے ۔ یہ بھی آپ کے ساتھ جائیں ، کپڑے بدلیں اور آپ کی نصیحت پر عمل کریں ، جس میں دنیا اور دین دونوں کا فائدہ ہے ۔"

نصوح نے پھر کلیم کی طرف مخاطب ہو کر کہا : "کیوں صاحب ، کچھ تم بھی تو اپنے دل کا ارادہ بیان کرو ۔"

کلیم : "مجھ کو آپ اتنی اجازت دیجیے کہ گھر سے اپنی ضرورت کی چند چیزیں منگوا لوں ۔"

نصوح : "سخت افسوس ہے کہ تم دنیا کی چند روزہ اور عارضی ضرورتوں کا تو اہتمام کرتے ہو اور دین کی بڑی

ضرورت سے غافل ہو۔

غم دین خور کہ غم غم دین ست
همه غم ها فرو تر از این ست[۱۴]

ضرورت کی چیزیں منگوا لینا کیا معنی، تم شوق سے گھر میں چلو۔ غالباً میری نسبت کر[۱۵] تم کو اس گھر میں زیادہ دئوں رھتا ہے، پس وہ گھر میرا کیوں فرض کر لیا گیا ہے۔ تمھاری ماں بہت بے تاب ہے۔ چھوٹے بڑے سب فکرمند ہیں۔ میرے جرم کی سزا دوسروں کو دینا شیوۂ انصاف سے بعید ہے۔''

کلیم: ''مجھ کو معلوم ہے کہ آپ چند روز سے دین داری اور خدا پرستی کے نام سے نئے نئے دستور، نئے نئے طریقے، نئے نئے قاعدے گھر میں جاری کرنے چاہتے ہیں۔ اور اس جدید انتظام میں جیسا کچھ اہتمام آپ کو منظور ہے، میں کیا گھر میں کوئی متنفس اس سے بے خبر نہیں۔ ہر شخص اس بات کو اچھی طرح سے جان چکا ہے کہ وہ اس انتظامِ جدید کی مخالفت کے ساتھ گھر میں رہ نہیں سکتا۔ پس میں نے اپنی طرف سے بہتیری کوشش کی کہ مجھ کو اپنی مخالفت آپ کے رو در رو ظاہر کرنے کی ضرورت نہ ہو، مگر آپ کے اصرار نے مجھ کو مجبور کر دیا اور اب ناچار مجھ کو کہنا پڑا کہ میں شروع سے اس انتظام کا مخالف ہوں، اور میرا گریز میری رائے ظاہر کر دینے کے لیے کافی تھا۔ میں ایک بال کے برابر اپنی طرز زندگی کو نہیں بدل سکتا اور اگر جبراً

۱۴ - دین کا غم کھاؤ کہ اصل غم یہی ہے۔ دنیا کے سارے غم و فکر اس سے کم تر ہیں۔ ۱۵ - دیکھئے حاشیہ صفحہ ۹۱

اور سخت گیری کے خوف سے میں اپنی رائے کی آزادی نہ رکھ سکوں تو تف ہے میری ہمت پر اور نفرین ہے میری غیرت پر ۔ اور میں اس میں کلام نہیں کرتا کہ آپ کو اپنے گھر میں ہر طرح کے انتظام کا اختیار حاصل ہے ، مگر اس جبری انتظام کے وہی لوگ پابند ہو سکتے ہیں جن کو اس کی واجبیت تسلیم ہو یا جو اس کی مخالفت پر قدرت نہ رکھتے ہوں ۔اور چوں کہ میں دونوں شقوں سے خارج ہوں ، میں نے اپنی عافیت اسی میں سمجھی کہ گھر سے الگ ہو جاؤں ۔ اور اگرچہ میری اس وقت کی حالت پر یہ کہنا زیب نہیں دیتا لیکن ذرا مجھ کو دھلی سے نکلنے دیجیے ، تو پھر آپ اور سب لوگ دیکھ لیں گے کہ میں کیا تھا اور کیا ہو گیا ۔ قاعدہ ہے کہ وطن میں آدمی بے قدر ہوتا ہے ، چناں چہ آپ کے نزدیک بھی یہ بات ثابت ہے کہ مجھ کو گھر سے نکلنے پر بھیک مانگی نہیں ملے گی ۔ لیکن میں کہتا ہوں کہ یہی آپ کا فرزند نالائق و نا خلف ہوگا اور کسی امیر کی مصاحبت ہو گی ، یا کسی ریاست کی مسندِ وزارت ۔ میں ایسا بھی احمق نہیں ہوں کہ آپ پر نا مہربانی کی تہمت لگاؤں ۔ آپ وہی بات فرماتے ہیں جو آپ میرے حق میں بہتر سمجھتے ہیں ۔ لیکن میری بے ادبی اور گستاخی معاف ، میں اپنے تئیں محتاجِ تعلیم و ہدایت نہیں سمجھتا ۔ رہا گھر ، سو اس میں صرف اس شرط سے چل سکتا ہوں کہ آپ میرے نیک و بد سے بحث ، میرے بھلے برے سے تعرض نہ کرنے کا قول واثق اور وعدۂ حتمی کریں ۔''

نصوح : ''اس کا مطلب یہ کہ تم نے مجھ کو منصب پدری سے معزول کیا ۔''

کلیم : "نہیں - آپ نے مجھ کو فرزندی سے عاق فرمایا -"

اس کے بعد نصوح گھر میں آنے کی نیت سے اٹھا اور اس کا ارادہ تھا کہ طوعاً و کرھاً جس طرح ممکن ہو ، کلیم کو ساتھ لوا جائے - مگر کلیم ، نہیں معلوم کیوں کر ، نصوح کے بطون کو تاڑ گیا کہ اس کو اٹھتا دیکھ چبوترے سے جست کی تو صحن میں تھا ، اور صحن سے تڑپا تو احاطے کے باہر - لوگوں نے دوڑ کر دیکھا تو وہ بازار کے پرلے سرے جا چکا تھا - یہ دیکھ کر نصوح ہکا بکا سا ہو کر رہ گیا ، اور جس طرح اس نے بیٹے کو سپاہیوں کے ہاتھوں میں گرفتار دیکھ کر "اناللہ[۱۶]" کہا تھا ، اب بیٹے سے جدا ہوتے وقت بھی وہ "اناللہ" کہہ کر چپ ہو رہا -

غرض کلیم نہ گھر گیا اور نہ گھر سے اس کو کوئی چیز لینی نصیب ہوئی - اسی طرح الٹے پاؤں پھر کر چلا گیا - نصوح کے پہنچتے پہنچتے یہ تمام ماجرا کسی نے گھر میں جا کہا اور مستورات میں بیٹھے بٹھائے ایک کہرام مچ گیا - فہمیدہ بے تاب ہو کر باولوں کی طرح دروازے میں آ کھڑی ہوئی ، اور قریب تھا کہ پردے سے باہر نکل آئے ، کہ نصوح جا پہنچا - بی بی کو دروازے میں کھڑا دیکھ کر حیران ہو کر پوچھا کہ خیر تو ہے ، کہاں کھڑی ہو؟ فہمیدہ میاں کو دیکھ کر بلک گئی اور گھبرا کر پوچھا کہ میرا کلیم کہاں ہے ؟

---

۱۶ - انا للہ و انا الیہ راجعون کا مخفف -

نصوح : ''میرا کلیم ؟ اگر تمھارا کلیم ہوتا تو تمھارے گھر میں ہوتا ۔ اور تمھارے اور باپ اور بھائی کے اتنے اصرار اور اتنے سمجھانے اور اتنی منت اور اتنی خوشامد پر ، بے پوچھے ، بے کہے ، گھر سے نہ چلا جاتا ۔''

فہمیدہ : ''اچھے ، خدا کے لیے مجھ کو اس کی صورت دکھا دو ۔ میں نے سنا ہے کہ سر سے ننگا ہے ، پاؤں میں جوتی نہیں ۔ اس نے کاہے کو کبھی زمین پر پاؤں رکھا تھا ؛ کنکر تلووں میں چبھتے ہوں گے ۔ کون سے وہ موئے سپاہی تھے ، میرے بچے کے پکڑنے والے ۔ گھورا ہو تو الہی دیدے پھوٹیں ۔ ہاتھ لگایا ہو تو خدا کرے پور پور سے کوڑھ ٹپکے ۔ وارے تھے وہ سپاہی اور قربان کیا تھا وہ کوتوال ۔ میرا بچہ اور چوری کرنے کے قابل ؟''

نصوح : ''کیسی بد عقلی کی باتیں کرتی ہو ۔ چلو گھر میں چل کر بیٹھو ۔ باہر گلی میں تمھاری آواز جاتی ہے ۔ تمھاری اس بے تابی کی محبت نے اولاد کو دنیا و دین دونوں سے تو کھو دیا ، اب دیکھیے کیا کرے گی ۔''

فہمیدہ : ''اچھا تو پھر کلیم گیا تو کہاں گیا ؟''

نصوح : ''جانے میری جوتی کہاں گیا ۔ مجھ سے پوچھ کر گیا ہو تو بتاؤں ۔ نہیں معلوم خدائی خوار کہاں تھا ، اور کیسے لوگوں میں تھا کہ جو رسوائی ہفتاد پشت سے نہ ہوئی تھی وہ اس مردک کی وجہ سے ہوئی ۔ اب مجھ کو شہر میں منہ دکھانا مشکل ہے ۔ یا تو خدا اس کو نیک ہدایت دے ، یا میں اس کو تو کیا بد دعا دوں ،

مجھ کو ایمان سے اٹھا لے کہ ان تکلیفوں سے مجھ کو نجات ہو ۔''

فہمیدہ : ''کیوں کر تمھارے دل نے صبر کیا اور کن آنکھوں سے تم نے بیٹے کو اس حالت میں دیکھا ؟''

نصوح : ''جس طرح اس کی گستاخی پر صبر کیا تھا کہ میں نے بار بار بلایا اور وہ نہ آیا ، اسی طرح میں نے اس کی وہ حالت دیکھ کر صبر کیا ، اور جن آنکھوں سے اس کے خلوت خانے ، عشرت منزل ، اور کتب خانے کی رسوائی اور خرابی اور تفضیح کو دیکھا تھا ، انھی آنکھوں سے اس کو کھلے سر ، ننگے پاؤں ، چور بنا ہوا ، سپاہیوں کی حراست میں دیکھا۔ ع :

جو کچھ خدا دکھائے سو ناچار دیکھنا''

فہمیدہ : تم سے اِتنا نہ ہو سکا کہ اس کو مجھ تک لے آتے ۔''

نصوح : ''اگر میں اس کو تم تک نہ لا سکا تو مجھ سے پہلے تم اس کو مجھ تک نہیں لا سکیں اور نہ تم اس کو جانے سے روک سکیں ۔''

فہمیدہ: ''کہاں تم مرد ، کہاں میں عورت ۔''

نصوح : ''تو کیا تمھاری مرضی تھی کہ میں اس سے کشتی لڑتا ؟ بس ایسے اخلاص سے مجھے معاف رکھیے ۔''

غرض نصوح سمجھا بجھا کر بی بی کو گھر میں لے گیا اور یہ بات اس کے ذہن نشین کر دی کہ رونے سے مطلق

فائدہ نہیں ۔ البتہ خدا سے اس کے حق میں زار نالی کے ساتھ دعا کرنی چاہیے کہ بامراد اس کو واپس لائے ۔

ادھر کلیم نے خالہ کے گھر جانے کا ارادہ کیا مگر اُس وقت تک اس کو نعیمہ کا حال معلوم نہ تھا ۔ اگر کہیں خالہ کے یہاں چلا گیا ہوتا تو سب سے بہتر بات تھی ۔ سردست اس کی ہمدردی کرنے کو نعیمہ وہاں موجود تھی اور چوں کہ اس کی خالہ کا سارا خاندان نیک اور دین دار تھا ، کلیم کو نصوح کے خیالات سے مانوس کرنے کے لیے وہاں ہر طرح کا موقع تھا ۔ لیکن عصیان خدا کا وبال اور حقوقِ والدین کی شامت ، ابھی بہت سی گردشیں اس کی تقدیر میں تھی ۔ جوں گلی کے باہر نکلا کہ میاں فطرت اس کو مل گئے ۔ یہ حضرت ، نصوح کے چچا زاد بھائیوں میں تھے ، اور ان سے اور نصوح سے موروثی عداوت تھی ، جیسی کہ دنیا دار خاندانوں میں اکثر ہوا کرتی ہے ۔ رشتہ داری کی وجہ سے ایک کے حالات دوسرے سے مخفی نہ تھے ۔ فطرت سن چکا تھا کہ نصوح کو دین داری کا نیا خبط اچھلا ہے ، جس کی وجہ سے اس کے تمام خاندان میں کھلبلی مچ رہی ہے ۔ جو دقتیں بے چارے نصوح کو اصلاحِ خاندان میں پیش آتی تھیں، فطرت کو سب کی خبر لگتی تھی اور یہاں کے تذکروں کا ایک مضحکہ ہوتا تھا ۔ کلیم کی عادت سے تو واقف تھا ہی ، فطرت اپنے یہاں خود کہا کرتا تھا کہ میاں نصوح لاکھ دین داری جتائیں مگر جب جانیں کہ بڑے بیٹے کو اپنی راہ پر لائیں ۔ کلیم کو جو ننگے سر ننگے پاؤں سر بازار جاتے ہوئے دیکھا تو فطرت نے چھیڑ کر پوچھا کہ

میاں کلیم، تم نے ابھی سے احرامِ حج[17] باندھ لیا ؟

کلیم : "احرامِ حج نہیں، احرامِ ہجرت۔"

فطرت : "وہی تو کہوں، مجھ کو تمھاری وضع داری اور دانش مندی سے شیخِ وقت کی تقلید نہایت مستبعد معلوم ہوتی تھی۔"

کلیم : "جی نہیں، شیخ کی خدمت میں جیسی ارادت شاعروں کو ہے، معلوم۔"

فطرت : "بس یہی دیکھ لو کہ بھائی نصوح کا اپنی اولاد کے ساتھ اور اولاد میں بھی تمھارے ساتھ، کہ آج ماشاءاللہ فخرِ خاندان ہو، یہ طرزِ مدارات ہے۔ ہم لوگ تو خیر کہنے کو اجنبی اور غیر ہیں، ایسی ہی بدمزاجیوں نے کنبہ والوں سے میل ملاپ چھڑایا، ورنہ انصاف شرط ہے، ہمارا ان کا کیا بانٹیے؟ اپنا کھانا، اپنا پہننا، لڑائی کس لیے اور جھگڑا کیوں ؟ اور طُرّہ یہ ہے کہ جس قدر حضرت سن رسیدہ ہوتے جاتے ہیں، مزاج جوان ہوتا جاتا ہے۔ بھائی، صد آفرین ہے تمھاری والدہ کو۔ نہیں معلوم ایسے آتش مزاج، بے مروت آدمی کے ساتھ اس نیک بخت نے کیوں کر نباہ کیا۔ مگر عورت ذات، موذی کے پنجۂ غضب میں گرفتار ہے، کرے تو کیا کرے۔ میاں کلیم، تم اس کو سچ جاننا، تم لوگوں کی مصیبت کا خیال کر کر کے، بھائی،

---

۱۷ - چوں کہ حاجی بھی احرام باندھنے کے بعد سر اور پاؤں سے برہنہ ہوتے ہیں لہذا کلیم کو اس حالت میں دیکھ کر یہ فقرہ چست کیا ہے۔ احرام، حج کے لباس کو کہتے ہیں جو صرف ایک سفید چادر یا بغیر سلے ہوئے دو سفید کپڑوں پر مشتمل ہوتا ہے، ایک تہ بند اور ایک چادر۔

ہمارا تو گھر بھر بے چین رہتا ہے ۔ یہ خون کا جوش ہے ورنہ ملنا ملانا ترک ، آنا جانا موقوف ، سلام پیام مسدود ۔ کیا کریں ، کچھ بس نہیں چلتا ۔ بھلا پھر اس حالت میں تم جاتے کہاں ہو ؟"

کلیم : "خالہ جان کے یہاں جانے کا ارادہ ہے ۔"

فطرت : " تمہارے باپ کے ڈر سے ، دیکھا ہی چاہیے کہ گھر میں گھسنے دیں ۔"

کلیم : "نہیں ، اُن سے تو ایسی توقع نہیں ہے ۔"

فطرت : "مگر ذات شریف خود نہ تشریف لے جائیں ، اس کی کیا روک ہے ؟"

کلیم : "اس کا خدشہ تو ضرور ہے ۔

دیوار پھاندنے میں دیکھو گے کام میرا
جب دھم سے آ کہوں گا حضرت سلام میرا "

فطرت : "میں کہہ تو نہیں سکتا ، لیکن سمجھو تو ہم بھی ، خدا نہ خواستہ ، کوئی تمہارے یا بھائی نصوح کے دشمن نہیں ہیں ۔ ارے میاں ، رشتہ داروں ہی میں کھٹ‌اپٹ بھی ہوا کرتی ہے ۔ شکوہ غیر کا نہیں کرتے ۔ گلہ اوپری سے نہیں ہوتا ۔ جو ہم کو تمہارا اور تم کو ہمارا درد ہوگا ، وہ خالہ خالو کو نہیں ہو سکتا ۔ بھائی نصوح ابھی جب وبا میں بیمار پڑے ، خدا شاہد ہے ، دونوں وقت میں خود محلے میں آ کر خبر لے جاتا تھا ۔ ہماری اماں جان ہمیشہ حلال خوری سے تمہارے یہاں کے حالات پوچھا کرتی ہیں ۔

مجھ سے تو یہ رسوائی گوارا نہیں ہو سکتی کہ تم اس حالت سے ، ایسے بے وقت خالہ کے یہاں جاؤ ۔ چلو شب کو ہمارے یہاں آرام کرو ۔ ایسا ہی ہوگا تو صبح کو خالہ کے یہاں بھی ہو آنا ۔ لو یہ میرا دوپٹہ تو سر کو لپیٹ لو ، لوگ آتے جاتے ہیں ۔ اور چلو پاس کے پاس اسی چھتے سے ہو کر نکل چلیں ۔"

غرض میاں فطرت للو پتو کرکے کلیم کو اپنے گھر لے گئے ، اور نصوح کی جلن سے اس کی ایسی بزرگداشت کی کہ کسی کے گھر والے بھی نہ کرتے ہوں گے ۔ کلیم نے جب سے دین داری اور اصلاح وضع کی چھیڑ چھاڑ سنی تھی ، کیا ماں ، کیا باپ ، کیا بھائی ، سب کو اپنی رائے سے برخلاف پایا ۔ اب جو فطرت نے بغرض اس کی دل جوئی اور خاطر داری کی اور اس کی ہاں میں ہاں ملائی اور نصوح کو مجنون اور بد مزاج اور سخت گیر ٹھہرایا ، یہ احمق سمجھا کہ بس فطرت اور اس کے گھر والوں سے بڑھ کر کوئی اس کا خیر خواہ نہیں ۔ اب تک وہ باپ سے صرف اختلاف رائے رکھتا تھا ، اب اس کو باپ سے ایک نفرت و عداوت پیدا ہوئی ۔ فطرت نے جلی کٹی باتیں لگا کر یہ خیال اس کے دل سے بالکل دور کر دیا کہ نصوح کو اس کے تدین نے اولاد کے ساتھ روک ٹوک کرنے پر مجبور کیا ہے ، اور چوں کہ کلیم اپنی پندار میں یہی سمجھتا تھا کہ اس وقت تک میں ہی اکیلا گھر سے نکلا ہوں ، فطرت کے بہکا دینے سے اس کو یقین ہو گیا کہ دین داری اور خدا پرستی کا حیلہ تھا ، ورنہ فی الاصل باپ کو اس کا گھر سے نکال دینا مرکوز خاطر تھا ۔

کلیم اس وقت دو مخالفوں کی کشمکش میں تھا ۔

باپ اس کو صراط مستقیم کی طرف کھینچتا تھا ، فطرت گم راہی اور ضلالت کی طرف ۔ لیکن فطرت حریف غالب تھا ، اس واسطے کہ اول تو خود کلیم کا میلان طبع اس کی جانب تھا ؛ دوسرے ، نصوح ایک نئی اور نامانوس اور دشوار گزار راہ[۱۸] پر اس کو لے جانا چاہتا تھا ، جس میں زہد و ریاضت اور اتقا اور نفس کشی اور انکسار اور فروتنی اور خوف عاقبت کی چند در چند تکلیفیں اور مصیبتیں در پیش تھیں ۔ اس راہ میں کلیم کو بدرقہ و راہ نما تو خیر ، رفیق و ہم سفر کا ملنا بھی مشکل تھا ۔ برخلاف اس کے فطرت اس کو ایک شارع عام دکھاتا تھا ، ایسا آباد کہ گویا اس سرے سے اس سرے تک بازار لگا ہے اور نہ صرف منزل بہ منزل ، بلکہ قدم بہ قدم ، تن آسانی اور عیاشی اور خود پسندی اور کبر اور بے فکری اور مطاق العنانی ، طرح طرح کی آسائشیں اور انواع و اقسام کی راحتیں موجود و مہیا تھیں ۔ اس راہ میں کلیم کو میلے کا حظ یعنی سفر میں حضر کا لطف حاصل تھا ۔

غرض کلیم ، میاں فطرت سے شیر و شکر کی طرح ملا ۔ نصوح نے جب یہ خبر سنی تو سخت افسوس کیا ، نہ اس وجہ سے کہ وہ فطرت سے عداوت رکھتا تھا کیوں کہ عداوت تو دین داری کے اعتبار سے بڑا گناہ ہے ، اور نصوح سے اس کے

۱۸ - یہاں تشبیہ وتمثیل کے پیرایے میں نیکی اور بدی کی دو جداگانہ راہوں کا بیان ہے - نیکی کی راہ کٹھن ہے ۔ اس میں بڑی پابندیوں ، آزمائشوں اور مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے ۔ لہذا اس راہ میں بہت کم ساتھی ملتے ہیں ۔ برخلاف اس کے بدی کی راہ آسان ہے ۔ اس میں نفس کی لذتیں اور ہر طرح کی آزادی حاصل ہے ۔ اس لیے یہ ایک شاہراہ ہے جس پر مسافروں کی کثرت سے میلا سا لگا رہتا ہے ۔

ارتکاب کی امید نہیں کی جا سکتی تھی لیکن اس کا یہ خدشہ کچھ بے جا نہ تھا کہ فطرت اصلاح میں کوشش نہیں کرے گا ۔ فطرت کے یہاں کلیم کو اور تو کسی طرح کی تکلیف نہ تھی، مگر اس کی مرضی کی کتابیں یہاں نہیں ملتی تھیں ۔ تب اس نے فطرت سے بیان کیا کہ دن بھر خالی بیٹھے بیٹھے طبیعت گھبرایا کرتی ہے ۔ اگرچہ میں نے اپنے حالات میں ایک مثنوی کہنی شروع کر دی ہے اور سو، سوا سو شعر بھی ہو گئے ہیں، مگر فکر سخن بے اطمینان خاطر بن نہیں پڑتا ۔ اگر آپ صلاح دیں تو میں اپنی چند کتابیں گھر سے منگوا بھیجوں ۔

فطرت : ''مجھ کو بھائی نصوح سے توقع نہیں کہ وہ اتنی رعایت بھی تمہارے حق میں جائز رکھیں ، خصوصاً اس حال میں کہ تم میرے گھر ہو ۔ میرے نزدیک تمہارا یہ جرم ان کے مذہب میں تکفیر کے لیے کافی ہے ۔ مگر ہاں ، اپنی والدہ سے کہلا بھیجو ۔ ان کا قابو چلے گا تو البتہ دریغ نہ کریں گی ۔''

کلیم تو متردد تھا کہ کس سبیل سے کتابیں منگوائے مگر فطرت ، ازبس کہ عیاری اور چالاکی کے موکل اس کے مطیع تھے ، خود بول اٹھا کہ اجی ، یہ کون سی بڑی بات ہے ؟ مجھ سے کہیے تو بھائی نصوح کی چارپائی اٹھوا منگواؤں اور ان کے فرشتوں کو خبر نہ ہو ۔

غرض فطرت نصوح کے گھر گیا اور کسی ڈھب سے اس نے سارا حال معلوم کیا ، اور وہ آگ جو نصوح نے کلیم کی کتابوں میں لگائی تھی ، فطرت نے کلیم سے جا

لگائی ۔ ایک تو خانہ ویرانی اس پر فطرت کی آتش بیانی ۔ کلیم پر اس آتش‌زنی کی خبر نے وہ اثر کیا جو حضرت موسیٰ پر آتش طور نے کیا تھا ۔ سنتے کے ساتھ ایسا بے خود ہوگیا کہ گویا بجلی گری۔ آپے میں آیا تو مزاج ایسا برافروختہ تھا کہ شاید نصوح اس وقت موجود ہوتا تو یہ مردک دست و گریباں ہوکر لپٹ جاتا ۔ کوئی ناگفتنی ، جلی کٹی بات اس نے آٹھا نہیں رکھی ۔ مگر لال پیلا ہوکر خاموش ہو رہا اور اس بات کے درپے ہوا کہ باپ سے انتقام لے ۔ کلیم نے جو طریقے انتقام کے سوچے تھے ، وہ سخت بے ہودہ تھے ۔ جب اس نے اپنی تدبیروں کو فطرت پر عرض کیا تو اس نے سب کی تحمیق کی اور کہا کہ ابھی تم نرے صاحب زادے ہو ۔ میں تم کو ایسی تدبیر بتاؤں کہ ''ہم کینہ وہم خزینہ ۱۹ ۔''

کلیم : ''وہ کیا ؟''

فطرت : ''گاؤں پر آخر تمھارا نام چڑھا ہوا ہے ، اس پر دخل کرو ۔''

کلیم : ع : ''ایں خیال است و محال است و جنوں۲۰''

ان کے متعدد کارندے اور نوکر چاکر اس پر مسلط ہیں ۔''

---

۱۹ - دشمنی بھی اور نفع (دولت یا خزانہ) بھی ۔

۲۰ - یعنی یہ محض ایک خیالی بات اور عملاً ناممکن ہے ، بلکہ ایسا سوچنا بھی پاگل پن ہے ۔

فطرت : ''گاؤں تمھارا تو نوکر اور کارندے تمھارے یا اُن کے ؟''

کلیم : ''لیکن میں صرف اسم فرضی ہوں ۔''

فطرت : ''اس کا ثبوت ؟''

کلیم : ''ثبوت ان کا قبض و دخل ، اور اُن کے روپے سے گاؤں کا خرید ہونا ۔''

فطرت : ''ان کا قبض و دخل عین تمھارا قبض و دخل اور اُن کا روپیہ عین تمھارا روپیہ ہے ۔ بائع نے تمھارے نام سے رسید دی ۔ گاؤں میں پٹہ قبولیت تمھارے نام سے ہوتا ہے ۔ خزانہ سرکاری میں مال گزاری تمھارے نام سے سیاھہ[۲۱] ہوتی ہے ۔''

کلیم : ''جب میں سرے سے اسم فرضی ہوں تو نام کا ہونا میرے حق میں کچھ بھی مفید نہیں ہو سکتا ۔''

فطرت : ''لیکن اگر اسم فرضی ہونے سے انکار کیا جائے تو اس کی تردید کچھ آسان نہیں ہے ۔''

کلیم : ''میری سمجھ میں تو نہیں آتا کہ کیوں کر ایک امر واقعی کی تکذیب ہو سکتی ہے ۔''

فطرت : ''ہاں یہ شاعری نہیں ہے ، دنیا داری ہے ۔ اس کو ایک خاص سلیقہ درکار ہے ۔''

---

۲۱ - ریکارڈ میں درج کرنے کے لیے اہل دفتر کی اصطلاح ۔
بائع : بیچنے والا : پٹہ قبولیت : پٹے کے معاہدے کو قبول کرنے کی تحریر جو کاشت کار کی طرف سے زمیندار کو پیش کی جاتی ہے ۔

کلیم : ''غرض اس تدبیر کا پیش رفت ہونا تو ممکن نہیں معلوم ہوتا ، کوئی اور بات سوچیے ۔''

فطرت : ''جب تم سے ایسے سہل کام کا سر انجام نہیں ہو سکتا تو گھر سے نکلنے کا حوصلہ تم نے ناحق کیا ۔ یہی اسم فرضی کا حق مجھ کو حاصل ہوتا تو سیر دکھاتا ۔''

کلیم : ''فرض کر لیجیے کہ آپ کو حاصل ہے ۔''

فطرت : ''کیوں کر فرض کر لوں ؟ جیسے تم اسم فرضی مالک ہو ویسا ہی ایک فرضی بیع نامہ میرے نام کر دو تو البتہ فرض کر سکتا ہوں ۔''

کلیم : ''اگر ملکیت فرضی کا بیع نامہ کچھ بکار آمد ہوسکتا ہے تو گاؤں کی کیا حقیقت ہے ، میں تو سلطنت روم کا بیع نامہ آپ کے نام لکھ دوں ۔ ع :

بخال ہندوش بخشم سمرقند و بخارا را[۲۲]

فطرت : ''بھلا گاؤں کتنے پر بیع کروگے ؟''

کلیم : ''کسی فرضی قیمت پر ۔''

فطرت : ''بھلا اس کا اندازہ بھی ؟''

فطرت : ''فرض کیجیے کہ سو روپے ۔''

کلیم : ''مجھ سے ہزار نقد لیجیے ۔''

کلیم : ''سچ ؟''

---

۲۲ - اس (محبوب) کے سیاہ تل پر سمرقند اور بخارا (کے علاقے) نثار کر دوں ۔

فطرت : ''سچ ۔''

کلیم : ''واللہ بیچا ۔''

فطرت : ''واللہ لیا ۔''

کلیم کو فطرت کی قسم پر بھی اعتبار نہ ہوتا تھا ۔ فطرت نے گھر میں جا ، ہزار روپے کا توڑا لا کر سامنے رکھ دیا ۔ ادھر روپے گنے گئے اور آدھر بیع نامہ لکھ پڑھ کر تیار ہو گیا ۔

کلیم نے سوچا کہ میں نے یہ سودا کیا کیا ، ایک غنیمت باردہ مفت ھاتھ آئی ۔ اس وقت تو بات کی پچ کر کے فطرت نے روپیہ دے دیا ، ایسا نہ ہو پھر چیند کرے ۔ بہتر ھے کہ چل دیجیے ۔ یہ سوچ، روپیہ کا توڑا بغل میں داب ، کلیم رخصت ھوا تو سیدھا چاندنی چوک میں آیا ۔ محل دار خاں کا کمرہ اسی روز خالی ھوا تھا کہ اس نے سر قفلی جادی ۔

دھلی جیسا شہر اور کلیم جیسا ناعاقبت اندیش اور مُسرف اور اس طرح کا مال مفت ؛ بات کی بات میں ، فرش و فروش ، جھاڑ فانوس ، ساز و سامان ، نوکر چاکر ، سب کچھ موجود ھو گیا ۔ یہاں تک کہ اگلے ھی دن ، پہلے مشاعرے کی محفل ، اس کے بعد ناچ کا جلسہ ٹھہر ٹھہرا ، جتنے یار آشنا تھے ، سب کے نام رقعے تقسیم ھوئے اور کلیم کے سارے شیاطین‌الانس پھر بہ دستور جمع ھوگئے ۔ حتٰی کہ وہ مرزا ظاھر دار بیگ بھی اتنے بڑے بے غیرت کہ خبر سن کر دوڑے آئے ، اور کلیم اتنا بڑا احمق کہ ایسا دھوکا کھا کر پھر آن سے صاف ھو گیا ۔

جس کیفیت سے کلیم نے دو مہینے گزارے ، ناگفتہ بہ ہے - وہ بدکرداری کا تپ کہنہ[۲۳] رکھتا تھا ، اب یہ دن گویا بحران کے تھے - ہزار روپے کی کل جمع پونجی اور ایسا بے دریغ خرچ - تیسرا مہینہ شروع نہیں ہوا تھا کہ ہزار تمام ہوئے - پہلے سے ہی بزاز ، درزی ، حلوائی ، کبابی ، نانوائی[۲۴]، میوہ فروش ، گندھی ، بساطی وغیرہ کا حساب باقی تھا ، نوکروں کا دو ماہہ چڑھ چکا تھا ، اب آٹا دال تک ادھار آنے لگا - شدہ شدہ ہر طرف سے طلب و تقاضا شروع ہوا - استعمال سے پہلے اسباب خانہ داری کے بکنے کی نوبت پہنچی تو کلیم خواب غفلت سے بیدار ہوا - لیکن اب اس کا تنبہ کچھ چنداں سود مند نہ تھا - اس کے یار دوست ، دستور کے موافق اس کے پاس آنا جانا قاطبةً ترک کر چکے تھے - نوکر چاکر بھی گھر بیٹھ رہے تھے اور جو تھے وہ تنخواہ کے نہ ملنے سے ایسے گستاخ ہو گئے تھے کہ کار خدمت تو درکنار ، رُو در رُو جواب دیتے تھے - جو چیز جس کی تحویل میں تھی ، وہ ھیکڑی سے اس کو اپنا مال سمجھتا تھا - کوئی وقت ایسا نہ تھا کہ دو چار قرض خواہ اس کے در دولت پر نہ ہوں - کلیم نے چاہا کہ چپکے سے چل دے ، مگر اس کے بغلی دشمنوں یعنی نوکروں کی وجہ سے اس کا منصوبہ فاش ہو گیا ، اور جوں پہر رات گئے وہ نوکروں کا لباس بدل کر باہر نکلا تھا کہ سرہنگانِ دیوانی کے پنجۂ غضب میں

---

۲۳ - بدکرداری کو پرانے بخار سے تشبیہہ دی ہے - اب یہ بخار اس انتہا کو پہنچ چکا تھا جب مریض پر غشی طاری ہو جاتی ہے - بحران یعنی نازک حالت ، (Crisis)

۲۴ - صحیح لفظ نان‌بائی ہے - جو نان (روٹی) اور با (شوربا) سے ماخوذ ہے -

گرفتار ہو گیا ۔ اس غفلت شعار کو اب معلوم ہوا کہ کئی ڈگریاں یک طرفہ[۲۵] اس پر جاری ہیں ۔

ان پیادوں کی حراست میں جس کیفیت سے کلیم نے رات گزاری وہ ایسی سخت و ناگوار تھی کہ اس کو بار بار ظاہردار بیگ کی مسجد کا اعتکاف شبینہ حسرت کے ساتھ یاد آتا تھا ۔ اگلے دن کچہری کے وقت پیادوں نے کلیم کو لے جا کر حاکم عدالت کے روبرو حاضر کیا ۔ احاطہ کچہری میں پہنچتے ہی پہلے نصوح سے مڈ بھیڑ ہوئی ۔ کلیم باپ کو دیکھ کر بے اختیار رو دیا ، مگر پیادوں کے خوف اور اپنی ندامت کے سبب کچھ نہ کہہ سکا ۔ نصوح کا کچہری میں آنا بھی انھی حضرت کی وجہ سے تھا ۔ فطرت نے اس بیع نامۂ فرضی کا ایک طومار بنا کھڑا کیا ، اور دو چار نمک حرام کارندوں کو گانٹھا اور چند کاشت کاروں کو بیگھ پیچھے دو دو چار چار آنے کمی کر کے استمراری پٹے کر دیے ۔ دلی شہر کے چند آبرو باختہ غنڈے ساتھ لے ، گاؤں پھر زبردستی دخل کر لیا ۔ نوبت بہ عدالت پہنچی ۔ مقدمے میں کچھ ایسے پیچ پڑتے گئے کہ دروغ کو فروغ ہو گیا ۔ کلیم نے تو اپنے نزدیک ایک کھیل کیا تھا ، نصوح بے چارے کو مفت میں پانچ چھ ہزار کا گاؤں ہارنا پڑا ۔

اسی تقریب سے نصوح حاضر کچہری تھا کہ کلیم اس کو دوسری مرتبہ سرکاری پیادوں کے ہاتھ میں گرفتار نظر

---

۲۵ ۔ جب مقدمے کا ایک فریق حاضر نہ ہو اور دوسرا فریق اس کے خلاف ڈگری حاصل کر لے تو اسے یک طرفہ ڈگری کہتے ہیں ۔ سر ہنگانِ دیوانی : عدالت مال کے سپاہی ۔

آیا ۔ گو باپ بیٹے میں بالمشافہ بات چیت تو در کنار دعا سلام کا بھی اتفاق نہیں ہوا ، لیکن ایک دوسرے کی کیفیت معلوم ہو گئی ۔ باپ نے ابھی کچہری کے احاطے سے پاؤں باہر نہیں رکھا تھا کہ بیٹا جیل خانے جا داخل ہوا ۔ کلیم نے ہر چند شاعری اور امیر زادگی کے چند در چند استحقاق ثابت کیے ، مگر مالکانِ محبس نے ایک نہ سانی اور اس کو ایسا ایسا رگیدا کہ دوسرے ہی دن چیں بول گیا ۔ اس بےکسی میں کلیم کو باپ یاد آ گیا اور اگرچہ اپنی حرکات پر نظر کرنے سے بالکل نا امیدی تھی مگر الغریق یتشبّث بالحشیش[۲۶] ، مرتا کیا نہ کرتا ، بے غیرتی کا ٹھیکرا آنکھوں پر رکھ کر باپ کو ایک خط لکھا ۔ وہ یہ تھا :

"مجھ کو حیرت ہے کہ میں کون ہوں اور کس کو یہ خط لکھتا ہوں اور یقین ہے کہ اس خط کے پہنچنے پر مجھ سے زیادہ حیرت آپ کو ہوگی ۔ اتنی گستاخی ، اتنی نافرمانی ، اتنی بے حیائی ، اتنی مخالفت پر جو مجھ نالائق ، نا بکار ، نا ہنجار ، کشتنی ، گردن زدنی ، ننگِ خاندان ، ع :

بد نام کنندۂ نکو نامے چند[۲۷]

سے سرزد ہوئی ، میں کیا کوئی نہیں کہہ سکتا کہ مجھ کو آپ کے ساتھ نسبت فرزندی باقی رہی ۔ پس نہ تو یہ خط خط ہے ، اور نہ بیٹے کی طرف سے ہے ، اور نہ باپ کے نام ہے ۔ بلکہ یہ معذرت نامہ ہے ، غرضی اعتراف ہے ، توبہ کا وثیقہ اور

۲۶ ۔ ڈوبتا ہوا آدمی تنکے کا سہارا پکڑتا ہے ۔*

۲۷ ۔ چند نیک ناموں کو بد نام کرنے والا ۔ ننگِ خاندان

استغفار کی دستاویز ، ندامت کا اقــرار اور حــاجت مندی کا اظہار ہے ، گنہگار ، روسیاہ و شرم سار ، ظــالـم ، جفا کار ، تبہ روزگار کلیم کی طرف سے ، صاحب کرم عمیم و خلق عظیم ، بـردبـار و حـلیم ، رؤف و رحیم ، محسن ولی نعمت ، مہربان سراپا شفقت ، نیکوکار ، کم آزار ، خیر خواہ بلا اشتباہ کے نام - ھــر چنــد میری رسوائی یہاں تـک پہنچی کــہ جب سے مردود ومطرود ھـوا ، طرح طرح کی خرابیوں میں مبتلا اور انواع و اقسام کی ذلتوں میں گرفتار ہوں ، لیکن یہ سمجھنا کہ میں نے جیسا کیا ویسا پایا بے جا اور غلط ہے ، کـہ کیا ہزار تو پایا ایک ، کیا من تــو بھگتا چھٹانک - بلکہ ایک اور چھٹانک بھی نہیں ، حــاشــا نہیں ، زینہار نہیں - ہر چند میں معذرت کرتا ہوں اور جو کچھ میرے دل میں ہے وہ کہیں زیادہ ہے اس سے جو عبارت میں ہے لیکن خود مجھ کو اپنی توبہ سے تشفی اور ندامت سے تسلی نہیں ، اس واسطے کہ میری توبہ درماندگی کی توبہ اور ندامت حالت ابتلا کی ندامت ہے - توطیہ برطرف ، تمہید یک سو - نہ مجھ کو توبہ پر تکیہ ، نہ ندامت پر ناز - خدا کو ، جس کا میں آپ سے بــڑھ کــر گنہگار ہوں ، اپنا شفیع قرار دیتا ہوں ، ع : اور دیکھتا ہوں تا کرم او چہا کند - وَ الْکَاظِمِیْنَ الْغَیْظَ وَ الْعَافِیْنَ عَنِ النَّاسِ وَ اللّٰہُ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْن[۲۸]

---

۲۸ - غصے کے ضبط کرنے والے اور لوگوں سے درگزر کرنے والے اور اللہ نیکو کاروں کو دوست رکھتا ہے -

قطعہ

شاہا ز کرم برمنِ درویش نگر
بر حالِ منِ خستہ و دلریش نگر
ہر چند نیَم لائقِ بخشائشِ تو
برمن منگر بر کرمِ خویش نگر[۲۹]

علیم کسی پادری سے ایک مذہبی کتاب لے آیا تھا۔ اس میں اتفاق سے ایک جملہ مجھ کو نظر پڑا اور پسند آیا۔ وہ یہ تھا کہ توبہ ربڑ ہے اور گناہ پنسل کی تحریر۔ پس جب کہ توبہ و ندامت نے مجھ کو آلودگیٔ گناہ سے پاک کر دیا تو پھر میں آپ کا برخودار ہوں اور آپ میرے والد بزرگوار؛ مجھ کو آپ سے ہر طرح کا دعویٰ اور آپ کو مجھ سے ہر قسم کی توقع۔ سات سو کے عوض میں اس وقت میری جان پر بنی ہے۔ آپ مجھ کو اگر للہ، صدقہ، زکوٰۃ، خیرات جان کر نہ دیں تو قرض حسنہ دیں۔ قیدی کے چھڑانے، غلام کے آزاد کرنے کا ثواب آپ پر مخفی نہیں ہے۔ اگر روپیہ کل تک نہیں آیا تو میری زندگی دشوار ہے۔"

کلیم شاعر تو تھا ہی باتوں کا جادو بنانے کی اس نے یہاں تک مشق بہم پہنچائی تھی کہ اس کے جھوٹے ڈھکوسلوں پر تمام مجلس کو وجد ہوتا تھا۔ باپ کے لیے اس نے توبۂ ریائی کا ایسا مضمون سوچا کہ اس کا خط گویا سات سو

۲۹۔ اے بادشاہ، تو مجھ فقیر کو کرم کی نگاہ سے دیکھ۔ میں زخمی دل اور خستہ حال ہوں، میری حالت پر نظر ڈال۔ اگرچہ میں تیری بخشش کے لائق نہیں ہوں، لیکن تو مجھے نہ دیکھ بلکہ اپنے کرم پر نگاہ کر۔

روپیہ کی درشنی ہُنڈی تھی - جانے کی دیر تھی اور روپیہ ملنے کی دیر نہ تھی - لیکن مشکل یہ درپیش تھی کہ قاصد نہیں ، نامہ بر نہیں ، خط جائے تو کیسے جائے - ہانسی حصار[۳۰] کی طرف کا ایک سپاہی کچھ حرف آشنا سا تھا ، اور جب اس کو پہرے وغیرہ سے فراغت ہوتی تو وہ قصۂ شام روم و سپاہی زادہ ، بنجارہ نامہ ، کنزالمصلی منظوم ، اس قسم کے اردو رسالے ، نثر کو پریشان[۳۱] ، نظم کو ناموزوں کرکے اپنی کرخت سنگلاخ بولی میں پڑھا کرتا تھا - کلیم کو شاعری کے ذریعے سے اس سپاہی کے ساتھ تعارف پیدا کر لینا کچھ دشوار نہ تھا - منت سماجت سے کلیم نے اس کو خط پہنچا دینے پر آمادہ کیا اور اجرت یہ ٹھہری کہ کلیم ، اس کے اور اس کے دو بیٹوں کے نام کے سجع بنادے - نام ان کم بختوں کے ، اتفاق سے ایسے ٹیڑھے تھے کہ بےچارہ کلیم بہتیرا غور کرتا تھا ، کسی ڈھب سے نہیں کھپتے تھے - اور واقع میں نتھے خاں ، جمن خاں ، بدھو خاں کے ناموں کے سجع کوئی کہے تو کیا کہے - اس پر خرابی یہ کہ نتھے خاں ، جاھل کندۂ نا تراش ، پسند کرنے والا سخن فہم - کلیم بہتر سے بہتر سجع کہہ کر

---

۳۰ - حصار ، مشرقی پنجاب (بھارت) میں ایک شہر ہے - ہانسی ، اس کے نواح میں ایک قصبہ - بوجہ قربت دونوں کے نام عموماً ایک ساتھ لیے جاتے ہیں -

۳۱ - یہاں لطف یہ ہے کہ نثر کے لغوی معنی بھی پراگندہ و پریشان کے ہیں - قصہ شاہ روم نثر میں ہے - بنجارہ نامہ نظیر اکبر آبادی کی مشہور نظم ہے - کنزالمصلی ، ایک رسالہ جس میں نماز کے مسائل نظم کیے گئے ہیں -

لے جاتا ، وہ سن کر ہنس دیتا اور کہتا کہ بھائی جی ، یہ تو ٹھیک نہیں بیٹھا ۔ بڑی بڑی خرابیوں سے کوئی چھ سات دن میں کلیم نے ننھے خاں کی فرمائش پوری کی ۔

غرض کلیم کا خط باپ تک پہنچا ۔ وہ اس طرح کی طلب نہ تھی کہ اس میں امروز و فردا کی گنجائش ہو ۔ نصوح نے خط پڑھتے کے ساتھ ، ساتوں کے ساتوں سو روپے بے عذر گن دیے ۔ کلیم اس مرتبہ بھی باپ سے نہ چوکا ۔ ضرورت تھی پانسو کی اور منگوائے سات سو ۔ پانسو دے کر تو رہائی پائی ۔ باقی بچے دو سو ، اس میں کھڑے کھڑے سامان سفر درست کر اسی وقت دولت آباد کا راستہ لیا ۔

فصل یازدہم

کلیم نوکری کی جستجو میں دولت آباد گیا اور فوج میں بھرتی ہو گیا؛ لڑائی میں زخمی ہوا اور مُردوں کی طرح چار کہاروں پر لد کر دھلی آیا

یہ ایک چھوٹی سی ہندوستانی ریاست ہے۔ البتہ کوئی پانچ چھ لاکھ روپیہ سال کا محاصل اس میں ہو سکتا تھا۔ لیکن ایک نوجوان نا تجربہ کار مسند نشین ہوا۔ خوشامدی صلاح کار، لُچّے مصاحب، موقع پا کر آ جمع ہوئے اور دولت آباد کو چھوٹا لکھنؤ بنا دیا[1]۔ جہاں جہاں اس مذاق کے لوگ تھے سب کو فری میسن[2] کی طرح ریاست

---

۱ - نوابی عہد کے لکھنؤ کی طرح اربابِ نشاط کے طائفے اور عیش و طرب کے سامان فراہم ہو گئے۔

۲ - ایک خفیہ انجمن جس کے ارکان تفریح و تعیش اور باھمی امداد کی غرض سے متحد ہوتے ہیں۔ مطلب یہ کہ جس طرح اس جماعت کے افراد ایک دوسرے کے حالات سے آگاہ ہوتے ہیں، اسی طرح جہاں کہیں عیش پسند لوگ تھے، سب یہاں کے حالات سے واقف تھے۔

دولت آباد کے حالات معلوم تھے ۔ کلیم بھی سن سن کر دولت آباد کا ایسا مشتاق تھا ، جیسے زاهد مرتاض جنت کا ۔

غرض کلیم دو منزلہ[۳] طے کرتا ہوا دولت آباد پہنچا اور قبل اس کے کہ کسی سے تعارف پیدا کرے ، اس نے اپنا سامان ظاہر درست کر پھر ایک مرتبہ سرائے میں امیری ٹھاٹھ لگا دیے ۔ مدح رئیس میں قصیدہ تو اس نے سفر هی میں کہنا شروع کر دیا تھا ۔ صرف عرض حال[۴] اور قطعہ دعائیہ باقی تھا ۔ جلدی جلدی تمام کر ، اسی قصیدے کو ذریعہ تقریب قرار دے ، در دولت پر جا کر حاضر ہوا ۔ مگر شامت اعمال اور باپ کی ناخوشی کا وبال ، اس کی کوئی تدبیر کار گر نہیں ہونے دیتا تھا ۔ اس کے دولت آباد پہنچنے سے چند روز پہلے یہاں بساط اُلٹ چکی تھی ۔ بدنظمی ریاست کی خبریں صاحب رزیڈنٹ کو پہنچیں ، اور انھوں نے بہ‌ذاتِ خاص دولت آباد پہنچ کر رئیس سے کل اختیارات منتزع کر ، امور ریاست کا اہتمام ایک کمیٹی کو تفویض کیا ، جس میں ریاست کے چند قدیم نمک خوار تھے ، کہ وہ رئیس کی بے اعتدالیاں دیکھ کر ترک خدمت کر کے گھر بیٹھ رہے تھے ۔ اور اس کمیٹی کے میر مجلس ، انتظام الدولہ[۵]

---

۳ ۔ ایک دن میں دو دو منزلیں طے کرتا ہوا ۔ منزل کی تعین میں اختلاف ہے ۔ عموماً ایک منزل کی مسافت پچیس میل ہوتی تھی ۔

۴ ۔ تشبیب ، گریز اور مدح کے بعد قصیدے کے آخری دو اجزاء ۔

۵ ۔ نذیراحمد کے ناولوں میں افراد ، مقامات بلکہ گلی کوچوں کے ناموں میں بھی کسی نہ کسی وصف خاص کی رعایت ملحوظ ہوتی ہے ۔ یہاں بھی سارے نام اور خطابات صفاتی ہیں ۔

مدبّرالملک نواب بیدار دل خاں بہادر ، والئ عافیت نگر ، قرار دیے گئے ، کہ وہ رشتے میں رئیس دولت آباد کے ماموں بھی تھے اور ان کا حسن انتظام ان اطراف میں ضرب المثل تھا ۔ اور خود صاحب رزیڈنٹ بہادر بھی بلا ناغہ ماہ بہ ماہ اپنی شرکت سے کمیٹی کی آبرو افزائی کیا کرتے تھے ۔ رئیس کو مصارفِ ضروری کے لیے کمیٹی سے دست برداشتہ[۶] کچھ روپیہ ملتا تھا ۔ نابکار مصاحب ایک ایک کرکے نکالے جا چکے تھے ۔ غرض جس چاٹ پر کلیم دوڑا آیا تھا وہ بات اب باقی نہ تھی ۔

نا واقفیت کی وجہ سے کلیم نے اطلاع کرائی تو فوراً قاصد کی طرح طلبی آئی ۔ یہ تو اس توقع سے خوشی خوشی اندر گیا کہ بانکے ٹیڑھے ، رنگیلے سجیلے ، وضع دار لوگ دیکھنے میں آئیں گے مگر جا کر دیکھتا ہے تو بڑے بڑے ریشائیل[۷] مولوی ، پگڑ اور عمامے باندھے بیٹھے ہیں ۔ کوئی درس دے رہا ہے ، کوئی کتاب دیکھ رہا ہے ، کوئی اوراد میں مصروف ہے ۔ اندر قدم رکھتے ہی کلیم نے یہ برجستہ مطلع پڑھا :

جاتے تھے جستجوئے بت خانہ و صنم میں
بھاگے تو جا کے نکلے ہم بھی کہاں حرم میں

مولویوں کی شکل دیکھ کر قریب تھا کہ کلیم اس طرح

---

۶ - ہاتھ کھینچتے ہوئے یعنی بہ کفایت ، قدرے قلیل ۔

۷ - فرشتوں کے ناموں (مثلاً عزرائیل ، اسرافیل ، میکائیل وغیرہ) کے وزن پر ازرہ تمسخر یہ لفظ تراشا گیا ہے ۔ مراد لمبی لمبی داڑھیوں والے ۔

بھاگ کھڑا ہو جیسے لاحول سے شیطان مگر اس کو خیال ہوا کہ امیروں کے کارخانے ہیں ، عجب کیا ہے کہ یہ کوئی خانقاہ ہو ۔ ع :

مسجد کے زیرِ سایہ خرابات چاہیے

چلو ذرا حال تو دریافت کریں ۔ بارے قریب جا کر اس نے ایک پیر مرد کو ''مجرا عرض کرتا ہوں[8]'' کہہ کر اپنی طرف متوجہ کیا ۔

لفظ 'مجرا' سن کر ان حضرت کے کان کھڑے ہوئے اور فوراً آنکھ سے عینک اتار سیدھے ہو کر کلیم کو دیکھنے لگے ۔ تب اس نے زائد از رکوع جھک کر ان کو سلام کیا ، یعنی اپنا مجرا دکھایا ۔ اس بزرگ نے فرمایا ۔

''وعلیکم السلام ورحمۃاللہ و برکاتہ ۔ مِنْ اَیْنَ اَنْتَ فی اَرفَالکَ اَحْسَنَ اللہُ بحالکَ[9] ۔

کلیم : ''حضرت قبلہ ، میں فہمِ عربی سے قاصر ہوں ۔''

مولوی صاحب : ''کہاں سے اتفاقِ مجی ہوا ؟''

---

۸ - لکھنؤ میں ، درباری تہذیب کے اثر سے، ایک مدت تک سلام کا یہ طریقہ رائج رہا کہ شرفاء ، السلام علیکم کہنے کے بجائے ''تسلیمات عرض ہے'' یا ''مجرا عرض کرتا ہوں'' کہتے تھے اور جھک کر تین فرشی سلام کرتے تھے - پھر مجرے کا رواج اٹھ گیا ، لیکن قدرے جھک کر تین مرتبہ ہاتھ ہلانے اور آداب یا تسلیمات عرض کرنے کا انداز اب تک باقی رہ گیا ۔

۹ - تم مٹکتے ہوئے کہاں سے آتے ہو؟ خدا تمھارے حال پر رحم کرے ۔*

کلیم : ''دھلی سے ۔''

مولوی صاحب : ''تقریب ؟''

کلیم : ''امتحانِ بخت اور آزمائشِ نصیب ۔''

مولوی صاحب : ''علم و عمل ؟''

کلیم : ''مدحت طرازیِ اربابِ دُوَل ۔''

مولوی صاحب : ''غرض و غایت ؟''

کلیم : ''تحصیلِ جاہ و ثروت ۔''

تب اس بزرگ نے مختصر طور پر کلیم کو وھاں کے حالات سے مطلع کر دیا اور کہا کہ رئیس لاشئے محض ھے ، وہ بھی لا بشرط شی[۱۰] نہیں بلکہ بشرط لاشے ۔ اور بے اجازت خاص حضرت مولانا صدر اعظم کے کسی کو اس تک پہنچنے کا امکان نہیں ۔

کلیم : ''صدر اعظم صاحب کہاں تشریف رکھتے ھیں؟''

مولوی صاحب : ''دیکھو یہیں کہیں ھوں گے ۔''

کلیم : ''ان کی شناخت ؟''

مولوی صاحب : ''سِیمَاھُمْ فِی وُجُوھِھِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُود[۱۱] ۔''

---

۱۰ - یہ اشارہ ھے منطق کے ایک مشکل مسئلے کی طرف *

۱۱ - ان کا حلیہ یہ ھے کہ پیشانی پر سجدے کے گھٹے پڑے ھیں*(قرآن مجید کی سورۂ الفتح (۴۸): آیت ۲۹ کا ایک ٹکڑا جہاں صحابۂ کرام کے اوصاف بیان کیے گئے ھیں ۔ مرتب)

کلیم : ''میں نہیں سمجھا ۔''

مولوی صاحب : ''ایک بڈھے منحنی سے آدمی ہیں۔ نیلی لنگی اوڑھے ہوئے حجرۂ شمالی کے صحن میں طلبہ کو درس دے رہے ہوں گے ، یا فصلِ خصومات[۱۲] میں مصروف ہوں گے۔''

کلیم : ''ان کو کیا خدمت سپرد ہے ؟''

مولوی صاحب : ''جیسے حرف ندالفظ اُدعوا[۱۳] کا قائم مقام ہوتا ہے ، اسی طرح مولانا صاحب ادام اللہ فیوضہم[۱۴] نائب الرئیس ہیں ۔''

کلیم : ''میں ان کی خدمت میں جا سکتا ہوں ؟''

مولوی : ''لا بأس بہ[۱۵] ۔''

غرض کلیم صدر اعظم کی خدمت میں گیا تو وہ اس کی نظر میں کچھ بھی نہ جچے ۔ یہ سمجھا تھا کہ وزیر اعظم اور نائب الرئیس ہیں تو بڑے کروفر کے ساتھ ہوں گے ۔ وہاں جا کر دیکھا کہ ولایتی نما ایک بڈھے سے مولوی ہیں ، وراثت کا ایک جھگڑا ان کے روبرو درپیش ہے اور بیٹھے اپنے ہاتھ سے حساب مناسخہ لگا رہے ہیں ۔ کلیم کو ایک اجنبی صورت دیکھ کر انھوں نے بیٹھنے کا اشارہ کیا

---

۱۲ ۔ خصومات ، خصومت کی جمع ۔ بمعنی عداوت ، دشمنی ، جھگڑا ۔ فصلِ خصومات یعنی جھگڑے یا مقدمے طے کرنا ۔

۱۳ ۔ یہ ایک علم نحو کا مسئلہ ہے ۔*

۱۴ ۔ خدا ان کے فیض کو ہمیشہ قائم رکھے۔

۱۵ ۔ کوئی مضائقہ نہیں ۔

اور کہا کہ ان لوگوں سے فارغ ہوں تو آپ سے بات کروں ۔ جب تک مقدمہ پیش رہا ، کلیم غور سے دیکھتا اور سنتا رہا ۔ مولوی صاحب بلا کی موشگافیاں کر رہے تھے ۔ تب تو کلیم نے سمجھا کہ واقع میں یہ شخص بڑی پائے گاہ کا آدمی ہے اور منصبِ وزارت کے قابل ہے ۔ بارے جب مقدمہ طے ہو چکا تو صدر اعظم صاحب کلیم کی طرف مخاطب ہوئے کہ ہاں حضرت فرمائیے ۔

کلیم : ''بندہ ایک غریب الوطن ہے ۔ رئیس کی جود و سخا کا شہرہ سن کر مدت سے مشتاق تھا ۔ یہ حال ہے ، باقی میری صورت سوال ہے ۔''

صدرِ اعظم : ''آپ کی سماعت صحیح لیکن اگرچہ جودصفتِ محمود ہے مگر اعتدال شرط ہے ۔ شامتِ اسراف سے غنٰی باقی نہ رہا ۔ فرنگیوں نے حفظِ ریاست کی نظر سے رئیس کو ممنوع التصرفات ، مسلوب الاختیارات کر رکھا ہے[16] ۔''

کلیم : ''مَیں طالبِ گنجینہ نہیں ، سائلِ خزینہ ۔

صدف کو چاہیے کیا ایک قطرہ چشمۂ یم سے
بجھا لیتا ہے اپنی پیاس کامِ غنچہ شبنم سے

۱۶ - مطلب : آپ نے جو کچھ سنا درست ہے ۔ اگرچہ سخاوت ایک پسندیدہ وصف ہے لیکن کوئی خوبی جب حد سے گزر جائے تو برائی بن جاتی ہے ۔ اس لیے ہر بات میں اعتدال قائم رکھنا ضروری ہے ۔ فضول خرچی کی نحوست سے دولت باقی نہ رہی ۔ انگریزوں نے ریاست کو محفوظ رکھنے کے خیال سے والیِ ریاست کو بے دخل کردیا اور اس کے اختیارات چھین لیے ہیں ۔

کلیم نے اس طرح کڑک کر بے دھڑک شعر پڑھا کہ تمام حاضرین اس کی یہ حرکت خارج از سیاقِ ادب دیکھ کر متعجب ہوئے۔ صدر اعظم صاحب کا منصب ، ان کا علم و فضل اور ان کی پیری اور وہ ہیبت جوان کی تہذیب کو لازم تھی ، یعنی صدر اعظم کی حالت مجموعی اور اس سے قطع نظر خود کلیم کی حالت ، اس کی مقتضی تھی کہ وہ پاسِ ادب ملحوظ رکھتا ۔ مگر وہ ایسی ہی بے باکی کو ہنرِ لسانی اور صفتِ حاضر جوابی سمجھتا تھا ۔ شعر اس کا تکیۂ کلام تھا ۔ بات کہتا تو مقفّٰی ، کلام کرتا تو موزوں ۔ گفتگوئے روزمرہ میں بھی اس کی یہی کیفیت تھی اور جو کوئی کبھی اس کو ٹوکتا تو وہ جواب دیتا کہ ع :

شاعری تو شعار ہے اپنا

کلیم کو صدر اعظم کے حضور بے باکانہ شعر پڑھتے ہوئے دیکھ کر لوگوں کو حیرت ہوئی ۔ لیکن جو امر ان کی حیرت کا موجب تھا ، وہی ان کو کلیم کے روکنے اور باز رکھنے سے بھی مانع تھا ، یعنی صدر اعظم صاحب کی ہیبت ۔ لوگوں سے زیادہ صدر اعظم صاحب کو حیرت ہوئی ہوگی مگر ان کی تہذیب اس درجے کی تھی کہ انہوں نے کلیم کو نظر بھر کر بھی تو نہیں دیکھا ، اظہار ناخوشی و ناپسندیدگی تو بڑی بات ہے ۔

صدر اعظم : "رئیس سے تو توقع عبث ہے ۔ مگر انتظامِ جدید درپیش ہے ۔ اگر میں سمجھوں کہ کوئی

خدمت آپ انجام دے سکیں گے تو ان شاء اللہ مجلس شوریٰ میں ، جس کو لوگ کمیٹی منتظم ریاست کہتے ہیں ، آپ کے استحقاق پیش کر دیے جائیں گے اور غالب ہے کہ کوئی خدمت آپ کو مفوض ہو جائے ۔ متعدد مناصب خالی ہیں ، خصوصاً انتظام فوج داری حدود ریاست میں ۔،،

کلیم : ،،چندے حضور مجھ کو اپنی خدمت خاص میں رکھیں اور اس نا لائق کی ھنر مندی اور بے ھنری حضور پر منکشف ہو جائے ، تو پھر جس خدمت کے لیے ارشاد ہوگا بسر و چشم اس کو بجا لائے گا ، اگرچہ خدمت فوج داری ھی کیوں نہ ہو ۔

طالب ہوں علم کا کہ عَلَم سے ہے ہم رقم
نیزہ سمجھ کے لیتا ہوں میں ہاتھ میں قلم،،

صدرِ اعظم : ،،فرنگیوں نے جو انتظام کیا ہے وہ ایسی تنگ ورزی کے ساتھ کیا ہے کہ اس میں بہت تھوڑی گنجائش ہے ۔ پس قبل اس کے کہ میں آپ کو اپنے پاس کی کوئی خدمت دوں، مجھ کو معلوم ہونا چاہیے کہ آپ کس کام کی انجام دھی پر قدرت رکھتے ہیں ۔،،

کلیم : ،،بقولِ غالب :

آج مجھ سا نہیں زمانے میں
شاعر نغز گو و خوش گفتار،،

صدرِ اعظم : ،،لیکن انتظامِ جدید کے مطابق ریاست میں کوئی خدمت شاعری باقی نہیں ۔،،

کلیم :
"وگر سخن گو نہیں تو خاک نہیں
سلطنت ہے عروس بے زینت"

صدر اعظم : "جو کچھ آپ سمجھیں ۔"

کلیم : "لیکن ریاست پر کیا منحصر ہے ، حضور بھی تو وزیر اعظم اور نائب الرئیس ہیں ۔ آپ کی سرکار میں کیا کمی ہے ۔ ع : بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر"

صدر اعظم : "نعوذ باللہ المنّان من آفات اللسان[۱۷] ۔ میں بے چارہ نام کا ، نائب الرئیس اور وزیر ہوں ، ورنہ فی الحقیقت ایک ذرۂ حقیر ہوں ۔"

کلیم : "یہ حضور کا کسرِ نفس ہے ۔ بقول ظہوری :

سر خدمت بر آستاں دارد
پائے رفعت بر آسماں دارد[۱۸]

میں بھی اس بلادِ دوردست اور دیارِ اجنبی میں اتفاق سے آ نکلا ہوں اور میں دیکھتا ہوں تو آپ کی سرکار با اقتدار میں ایک شاعر کی ضرورت بھی ہے ، جو آپ کے محامد اوصاف کو مشتہر کر کے خیر خواہانِ دولت کو راسخ العقیدت اور دشمنانِ روسیاہ کو مبتلائے ہیبت کرتا رہے ۔"

---

۱۷ ۔ خدا اپنے کرم سے آفاتِ زبان سے بچائے *

۱۸ ۔ اگرچہ (ایک ادنیٰ غلام کی طرح) وہ چوکھٹ پر سر جھکائے رہتا ہے (لیکن اس کا مرتبہ یہ ہے کہ) اس کا پاؤں ، بلندی سے آسمان پر ہے ۔

صدرِ اعظم : ''یہ آپ کی کریم النفسی ہے ورنہ ''من آنم کہ من دانم ۔'' مجھ کو اگر ضرورت ہے تو ایسے شخص کی ہے جو مجھ کو میرے عیوب پر مطلع کیا کرے ۔''

کلیم : ''اگر مدح و ستائش پسند نہیں ہے تو بندہ وصل و ہجر[19] و شوق و انتظار و ناز و نیاز و واسوخت و رباعی و تاریخ و سجع و چیستان و معاملہ بندی و تضمین و محاکمہ و رزم و بزم و تشبیہ و استعارات و تجنیس و تمثیلات و سراپا ، ہر طرح کے مضامین پر قادر ہے ۔ جو طرز مرغوبِ طبع ہو اُسی میں طبع آزمائی کرے گا ۔

رکھتا اگرچہ عیب تعلّی سے عار ہوں
بس مغتنم ہوں منتخب روزگار ہوں''

صدرِ اعظم : ''آپ کے ہنرمندِ بے نظیر بے مانند ہونے میں شک نہیں لیکن افسوس ہے کہ مجھ کو اس فن کی طرف رغبت نہیں ۔''

کلیم : ''حضور جیسے عالم باکمال کا ایسے فن شریف سے (ع) کہ ہم حظ نفس ست و ہم قوت روح[20] ، رغبت نہ رکھنا (ع) میری قسمت کی نارسائی ہے ۔''

صدرِ اعظم : ''اگرچہ میں اپنے نفس میں انواع و اقسام کی خباثتیں پاتا ہوں لیکن خداوند کریم کا اتنا شکرگزار ہوں کہ اب تو خیر ایسی باتوں سے محترز رہنے کی میری

---

۱۹ - یہاں شاعری کی مختلف اصناف اور موضوعات و مضامین گنائے گئے ہیں ۔

۲۰ - جو نفس کے لیے باعث لذت بھی ہے اور روح کی غذا بھی۔

عمر ہی ہے ، عنفوانِ شباب میں بھی خدا کے فضل سے میں ایسی باتوں کو نہایت نا پسند کرتا تھا ۔''

کلیم : ع ۔ ''سبب کیا وجہ کیا موجب جہت کیا ؟''

صدرِ اعظم : ''جہاں تک میں سمجھتا ہوں ایسے مضامین میں اشتغال و انہماک رکھنے سے ذہول و غفلت ، استخفافِ معصیت ، استحسانِ لہو و لعب ، اختیار مالا یعنی[۲۱] کے سوائے کچھ اور بھی حاصل ہے ؟''

کلیم : ''اب اس خصوص میں کچھ عرض کرنا سوء ادب ہے ۔ وہی خدمت فوجداری مجھ کو تفویض فرمائی جائے ۔''

صدرِ اعظم : ''مجھ کو کچھ عذر نہیں ۔ مگر آپ مجھ سے استشارہ کریں تو بہ حکم اَلْمُسْتَشَارُ مُؤْتَمَن[۲۲] ، میں صلاح نہیں دے سکتا ۔ اس واسطے کہ رئیس کے ضعفِ حکومت نے ان ٹھاکروں کو جو مستقرالریاست سے دور رہتے ہیں ، ایسا عسیرالانقیاد کر دیا ہے کہ کوئی قسط بے جنگ و جدال وصول نہیں ہوتی اور ملازمان فوجداری کو ہمیشہ ان کے ساتھ معرکہ آرائی کرنی پڑتی ہے ۔ آپ کے ذمے ریاست کے حقوق سوابق نعمت ثابت نہیں ۔ کیا ضرورت ہے کہ ابتداءً ایسی خطرناک خدمت اختیار کی جائے ۔''

کلیم : ''حالتِ اضطرار کو کیا کیا جائے ۔''

صدرِ اعظم : ''اگر اضطرار ہے تو بیس روپیہ ماہانہ

۲۱ ۔ فضول اور لغو باتوں کو اختیار کرنا ۔

۲۲ ۔ صلاح کار امانت دار ہوتا ہے *

کا جمع خرچ نویس مداخل ، ایک منصب جدید ہونے والا ہے ، چناںچہ آپ اس پر قناعت کریں ۔ میرے نزدیک کنجِ عافیت کے یہ بیس ، فوج داری کے پچاس پر ترجیح رکھتے ہیں ۔“

کلیم : ”یہ حضور کی مسافر نوازی ہے لیکن بندہ اس خدمت سے معاف رکھا جائے ۔ ع :

ہر کسے را بہر کارے ساختند[۲۳]

یہ کچھ لالہ بھائیوں[۲۴] ہی کو زیبا ہے ۔“

صدرِ اعظم : ”میں اتماماً للحجت[۲۵] پھر آپ سے کہتا ہوں کہ جس خدمت کے آپ خواستگار ہیں فی نفسہ ، خصوصاً اس وقت میں ، محل خطر ہے ۔“

کلیم : ع ،

”از خطر نیندیشد ہر کہ ہمتش عالی ست[۲۶] ۔“

صدرِ اعظم : ”اچھا تو آپ مآل کار کی نسبت تامل صحیح کر لیجیے ، پھر دیکھا جائے گا ۔“

غرض کلیم، صدراعظم سے رخصت ہو کر اپنی جگہ واپس

---

۲۳ - ہر شخص کو کسی خاص کام کے لیے پیدا کیا گیا ہے ۔

۲۴ - لالہ بھائیوں سے ہندوؤں کے دو فرقے، بنیے اور کایستھ مراد ہیں ۔ کایستھوں میں بھی بنیوں کی طرح لالہ کا لقب رائج ہے ۔ مغلوں کے زمانے سے کایستھوں کا آبائی پیشہ منشی گری (یعنی کلرکی) رہا ہے ۔

۲۵ - حجت تمام کرنے یا بحث ختم کرنے کے لیے ۔

۲۶ - جو بلند ہمت ہوتا ہے وہ خطرے کا خیال نہیں کرتا ۔

آیا ، مگر حصولِ مطلب سے مایوس ، صدرِ اعظم سے بدعقیدت۔ یہاں سرائے میں بعض لوگوں نے اس سے صدرِ اعظم کی ملاقات کی کیفیت پوچھی تو اس نے نہایت حقارت سے کہا : ''اجی بس ، شعر فہمیِ عالمِ بالا معلوم شد۔ آوازِ دُھل از دور۔ چوں دُم برداشتم مادۂ خر برآمد[۲۷]۔ کوڑ مغز ، جسدِ بے روح ، جمادِ بے حس ، افسردہ ، دل مردہ۔ ع :

سگ نشیند بجائے گیپائی[۲۸]

زمانۂ ناھنجار کے انقلاب دیکھیے ؛ ایوانِ ریاست کیا ہے ، فتح پوری کی مسجد[۲۹] ہے۔''

اگرچہ کلیم کو ایسی دل برداشتگی بہم پہنچی تھی کہ وہ کسی طرح ایسی ریاست کی نوکری پسند نہیں کرتا تھا ، مگر مجبوری یہ تھی کہ اس کے پاس اتنا خرچ نہیں تھا کہ کسی دوسری جگہ کا قصد کرے۔ حاجت اس کو صدر اعظم کے پاس جانے پر مجبور کرتی تھی ، مگر مخالفت رائے اس کو مانع ہوتی تھی۔ یہاں تک کہ اسی حیص بیص میں پورے دس دن گزر گئے اور کمیٹی منتظم ریاست کے انعقاد

---

۲۷ - یہاں فارسی کی تین امثال یکے بعد دیگرے نقل کی گئی ہیں۔ ترجمہ : عالم بالا کی حقیقت معلوم ہو گئی کہ وہاں کوئی شعر فہمی کا مذاق نہیں رکھتا۔ دور کے ڈھول سہانے۔ جب دُم اٹھایا تو گدھی نکلی۔

۲۸ - گیپا فروش کی جگہ کتا بیٹھا ہوا ہے۔ (گیپا ایک قسم کے پلاؤ کو کہتے ہیں)۔

۲۹ - دہلی میں لاہوری دروازے کے قریب ایک مسجد جہاں ایک مشہور دینی درس گاہ قائم تھی۔

کا وقت آ پہنچا ، لیکن اس بندۂ خدا نے صدر اعظم کی طرف رخ نہ کیا ۔ بارے یکایک نہیں معلوم کیا خیال اس کے دل میں آیا کہ سپاہیانہ لباس پہن ، ہتھیار لگا ، مونچھوں پر تاؤ دے ، خدمت فوج داری میں امیدوار بن کر کمیٹی کے روبرو جا کھڑا ہوا ۔ آدمی تھا ماشاءاللہ وجیہہ اور اس پر لسان ، ایک دم سے فوج میں کپتان مقرر ہو گیا ۔

شاعروں کو ایک پھٹکار یہ ہوتی ہے کہ اکثر خود پسند ہوتے ہیں ، کیوں کہ ہمیشہ تعریف و آفرین اور داد و تحسین کے امیدوار رہتے ہیں ۔ کلیم بھی اس مرض میں مبتلا تھا ۔ اب جو اس کو دفعتاً منصب کپتانی مل گیا تو اس کی نخوت کو تائید مزید پہنچی ۔ بقول میر ، ع :

سمند ناز پہ اک اور تازیانہ ہوا

جب دیکھو ، اردلی میں دس پندرہ سوار ، شہر میں گھوڑے کداتے پھر رہے ہیں ۔

چار پانچ مہینے کلیم نے بڑے چین سے گزارے ۔ اور چوں کہ باپ کو چھیڑنا منظور تھا ، دھلی میں دوست آشناؤں کے پاس کپتان صاحب کے خط پر خط چلے آتے تھے ۔ یہاں تک کہ زور آور سنگھ ، ایک ٹھاکر نے اپنے علاقے کی قسط وقت پر ادا نہ کی ۔ تنگ طلبی ہوئی تو وہ پھر بیٹھا ۔ اس کی سرکوبی کے واسطے دولت آباد سے فوج روانہ ہوئی ۔ اس میں کلیم بھی تھا ۔ جوانی کی عمر ، نئی نئی نوکری ، مزاج میں بے باکی و تہوّر ۔ پہلے ہی حملے میں میاں زخمی ہوئے کیسے سخت کہ دستم بخیر ، گھٹنے کی چپنی پر گولی بیٹھی

تو اندر ہی اندر بُنِ ران تک تیر گئی ۔ معلوم نہیں نسوق میں کس طرح کا تعلق خدا تعالیٰ نے رکھا ہے کہ ایک پاؤں کے مجروح ہونے سے سارے کا سارا دھڑ بے کار ہو گیا ۔

قاعدہ فوج کے مطابق میدان جنگ سے لوتھ کو اٹھا کر دارالشفا میں پہنچایا ۔ جراحوں نے زخم کو دیکھا تو ایسا کاری پایا کہ فوراً پاؤں کاٹنا لازم آیا ۔ اگرچہ اس وقت تک جراحوں نے پاؤں کو جان کا فدیہ تجویز کیا لیکن کلیم بے چارہ ، ناز و نعمت کا پلا ہوا تھا ، اس صدمہ کا متحمل نہ ہو سکا اور روز بہ روز اس کی حالت ردی ہوتی گئی ۔ تپ آنے لگی ، زخم بگڑا ، ناسور پڑے ۔ اتنا بڑا ڈھو جوان ، ایک ہی مہینے میں گھل گھل کر پلنگ سے لگ گیا ۔ جب پاؤں کی طرح اس کی زیست کی امید منقطع ہو گئی تو ناچار لوگوں نے اس کو دھلی میں پہنچانے کی صلاح کی ۔ اور یہ بھی خیال ہوا کہ گھر کے جانے کی مسرت اور تبدیل آب و ہوا کی فرحت سے عجب نہیں کہ اس کے دل کو تقویت پہنچے ۔ صدر اعظم صاحب حسبۃً للہ متکفل مصارف ہوئے اور دولت آباد سے دھلی تک برابر کہاروں کی ڈاک بیٹھ گئی ۔

کلیم دھلی میں پہنچا تو راہ میں آنیس بیس کا فرق اس کی حالت میں ہو گیا تھا ، مگر ناتوانی اس درجے کی تھی کہ دن رات میں سات پہر بے ہوشی میں گزرتے تھے ۔ جب کہاروں نے اس کی ڈولی نصوح کے دروازے پر جا اتاری تو اس پر غشی طاری تھی ۔ نصوح بالا خانے پر مصروف عبادت تھا ۔ پہلے زنان خانے میں خبر ہوئی ۔ فہمیدہ بے تاب ہو کر بے حجاب باہر نکل آئی ۔ جو پالکی کے پٹ کھول کر دیکھا

تو بیٹے پر مردنی چھائی ہوئی تھی ۔ اس طرح بلک کر روئی کہ سننے والوں کے کلیجے ہل گئے ۔ فہمیدہ نے اس بے قراری میں جو بَین کیے ، ان کے لکھنے سے پہلے قلم کا سینہ شق[۳۰] ہے ، اور چشمِ دوات سے اشک جاری ہیں ۔ خلاصہ یہ کہ فہمیدہ کے قلق و اضطراب نے محلے میں حشر برپا کر دیا ۔

اگرچہ نصوح گریہ و بکا کی آواز سن کر کھٹکا تھا مگر اس طرح کا مستقل مزاج ، ضابط آدمی تھا کہ اسی ترتیل کے ساتھ معمولی تلاوت کو پورا کیا ، اور اس کے بعد نیچے اتر کر پالکی کے پاس آیا ۔ فہمیدہ کا رونا سن کر اور بیٹے کی ردی حالت دیکھ کر بے اختیار اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو چلے آتے تھے اور بار بار ٹھنڈی سانسیں بھرتا تھا ، مگر کچھ بولتا تھا نہ چالتا تھا ۔ آدھ گھنٹے کامل اس کی یہی کیفیت رہی ۔ اس کے بعد اس نے اپنے آنسو پونچھے اور کہا :

اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن ۔ لَاحَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ الْعَلِیِّ الْعَظِیْمِ ۔ اِنَّمَا اَشْکُوْابَثِّی وَ حُزْنِی اِلَی اللّٰہِ ۔ اَللّٰھُمَّ اَفْرِغْ عَلَیْنَا صَبْراً وَّ ثَبِّتْ اَقْدَامَنَا ۔ اَللّٰھُمَّ ھَوِّنْ عَلَیْہِ سَکَرَاتِہٖ وَ کَفِّرْ عَنْہُ سَیِّاٰتِہٖ[۳۱] ۔

---

۳۰ ۔ قلم کے شگاف کی شاعرانہ توجیہ کی ہے کہ شدت غم سے اس کا سینہ پھٹ گیا ہے اور روشنائی کو دوات کے آنسو قرار دیا ہے گویا وہ بھی اس غم میں اشک بار ہے ۔

۳۱ ۔ ترجمہ : ہم اللہ کے ہیں اور اسی کی طرف لوٹ جانے والے ہیں ۔ گناہ سے بچنا اور نیکی پر قدرت پانا ، خدائے بزرگ و برتر کی مدد کے بغیر نہیں ہوسکتا ۔ میں تو اپنے رنج وغم کی فریاد خدا ہی سے کرتا ہوں ۔ اے خدا ہم پر صبر کا مینہ برسا اور ہم کو ثابت قدم رکھ ۔ اے خدا اس پر جان کنی آسان کر اور اس کے گناہوں کو اس سے جھاڑ ڈال ۔

اس کے بعد بی بی کی طرف مخاطب ہو کر کہا کہ میں تم کو رنج کرنے سے منع نہیں کرتا ۔ تمھارا رنج ایک اقتضائے طبیعت ہے کہ انسان اس میں مجبور ہے ۔ لیکن مجھ کو تمھارا اضطرار دیکھ کر اس بات کا خوف ہوتا ہے کہ مبادا تمھارے خیالات منجر بہ کفران[۳۲] ہو جائیں ۔ اگر مصیبت کے وقت انسان کے دل میں ، نعوذ باللہ ، بوئے نارضامندی بھی خداوند بے نیاز کی طرف سے پیدا ہو تو پھر کہیں اس کا ٹھکانا نہیں ۔ خَسِرَ الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَۃَ ۔ ذَالِکَ ھُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِیْن[۳۳] ۔

کیا ہم نئے آدمی اور یہ انوکھی مصیبت ہے؟ بزرگان دین پر اس سے کہیں زیادہ مصیبتیں نازل ہوئیں ۔ زندہ دھکتی ہوئی آگ میں جھونک دیے گئے ، سر پر آرے چلے ، سولی چڑھے ، قتل ہوئے ، قید رہے ، ماریں پڑیں ، کوڑے سہے ، گالیاں کھائیں ، بیگاریں بھگتیں ، ذلتیں اٹھائیں ، رسوائیاں جھیلیں ۔ مگر خدا ان کو جزائے خیر دے ، کیسے سچے بندے تھے کہ رضا و تسلیم کے حبل متین کو ھاتھ سے نہ دیا ۔ یہ کچھ مصیبت اور دل بہ رضا جوئی حضرت ربوبیت ۔ یہ کچھ ایذا اور زبان سپاس گزار منت ۔ شکر کا مقام ہے کہ خداوند کریم

---

۳۲ ۔ کفر کی حد تک نہ پہنچ جائیں ۔

۳۳ ۔ سورہ الحج (۲۲) کی گیارھویں آیت میں اللہ تعالیٰ اُن لوگوں کا ذکر فرماتا ہے جو اللہ کی عبادت تو کرتے ہیں لیکن اُن کے دل کی یہ کیفیت ہوتی ہے گویا وہ کفر و ایمان کی سرحد پر کھڑے ہیں ۔ جہاں آزمائشیں پڑیں وہ کفر کی طرف لڑھک گئے ۔ اسی سلسلے میں یہ ٹکڑا (خسر الدنیا...) آیا ہے جس کا ترجمہ یہ ہے : (ایسا شخص اپنے طرز عمل سے) دنیا اور آخرت دونوں کو کھو بیٹھتا ہے اور یہ کھلا ہوا نقصان یا خسارہ ہے ۔

نے ہمارے ضعف پر رحم فرما کر امتحان سخت میں مبتلا نہیں کیا ۔ اگر بندہ صرف یسرو رفاہ کی حالت میں خدا سے راضی ہے اور تکلیف و اذیت میں شاکی، تو وہ بندہ، بندۂ خدا نہیں، بلکہ بندۂ غرض اور مطلب پرست ہے ۔ اے بی بی، رنج کرو لیکن صبر کے ساتھ اور مصیبت پررؤو مگر شان عبودیت لیے ہوئے ۔ دنیا میں جتنی ایذا اور جتنی مصیبت ہے، پاداش گناہ و وبال معصیت ہے ۔ اسی واسطے توبہ و استغفار کو لکھا ہے کہ اس سے مشکلیں آسان ہوتی ہیں ۔ سب سے بہتر ہم دردی جو ہم اس شخص کی اس تباہ حالت میں کر سکتے ہیں، یہ ہے کہ ہم اس کے گناہوں کی معافی کے لیے خداوند کریم کے حضور میں بہ منت و سماجت دعا کریں ۔ یہ شخص، تم بھی اس بات کو تسلیم کرو گی، اپنے ہاتھوں اس نوبت کو پہنچا کہ جو اس کو دیکھے گا، بہ اقتضائے انسانیت تاسف کرے گا ۔ میں تم سے سچ کہتا ہوں، تمام دنیا کا رحم، خدا کی رحمت کاملہ کے آگے ہزارواں لاکھواں حصہ بھی نہیں ہے ۔ اگرچہ ہم لوگوں کے دیکھنے میں اس کی حالت ہی زبوں ہے لیکن کوئی شخص اس سے بڑھ کر خوش قسمت نہیں، اگر اس کی یہ تکلیفیں، عنداللہ، اس کے گناہوں کا کفارہ سمجھی جائیں ۔

نصوح کے وعظ کا سحر حلال[۳۴] ایسا نہ تھا کہ کوئی اس کو سنے اور متاثر نہ ہو ۔ فہمیدہ فوراً منہ پونچھ، سیدھی ہو بیٹھی ۔ اور اب میاں بی بی لگے آپس میں صلاح کرنے کہ

۳۴ ۔ جادو حرام ہے لیکن کلام میں جو جادو ہوتا ہے اسے کون حرام کہے گا ؟ وہ تو بہرحال سحر حلال ہے ۔

کیا کیا جائے ۔

نصوح : ''اس کو محلے کے شفا خانے میں پہنچا دینا چاہیے ۔ ہر وقت ڈاکٹر کے پیش نظر رہے گا ۔ مکان بہت پُر فضا ہے ، اس کی طبیعت کو بھی تفریح ہو گی ۔''

فہمیدہ : ''ہے ہے ! اور میرا دل کیوں کر صبر کرے گا ؟''

نصوح : ''تمہارا یہ کہنا بھی واجب مگر بیمار کی حالت ایسی ردی ہے کہ کسی وقت اس سے طبیب کا مفارقت کرنا مناسب نہیں ۔''

فہمیدہ : ''حکیم جی شوق سے آئیں جائیں ؛ میں سہ دری میں پردہ کیے بیٹھی رہوں گی ۔''

نصوح : ''زخموں کا علاج کچھ ڈاکٹروں ہی سے خوب بن پڑتا ہے ۔ یونانی طبیب تو اس کوچے سے محض نا بلد ہیں ۔ رہے جراح ، ان کو دو چار مرہم ضرور معلوم ہیں مگر تشریح[۳۵] سے جیسے یونانی طبیب بے خبر ، ویسے ہی جراح ناواقف ۔ بہتر ہوگا کہ اس کو نعیمہ کے گھر لے چلیں ۔ سرکاری شفاخانہ بھی قریب ہے اور میاں عیسیٰ ، کہ اس وقت ہندوستانی جراحوں میں اپنا ثانی نہیں رکھتے ، دیوار بیچ ان کا گھر ہے ۔''

فہمیدہ نے بھی اس صلاح کو پسند کیا اور کیسا سامان ، کس کی تیاری ، گھر کا گھر کلیم کی پالکی کے پیچھے پیچھے

---

۳۵ - تشریح سے مراد علم تشریح البدن ۔

ہو لیا ۔ یہاں سے کوئی چھ سات پیسے ڈولی نعیمہ کی سسرال تھی ۔ کہاروں نے پالکی اٹھائی تو کہیں کاندھا تک نہیں بدلا ، دھر نعیمہ کے گھر جا اُتاری ۔

یاد ہوگا کہ نعیمہ ماں سے لڑ کر ، بے ملے ، صالحہ کے ساتھ خالہ کے یہاں چلی گئی تھی ۔ پھر چار مہینے وہاں رہی ۔ نیک لوگوں کے ساتھ رہنے کی برکت ، خدا نے اس کو ہدایت دی اور وہ بھی نیک بن گئی :

سگِ اصحابِ کہف روزے چند
پئے نیکاں گرفت و مردم شد[۳۶]

نیک بنے پیچھے ، ممکن نہ تھا کہ ماں باپ کی ناراضمندی گوارا کرتی ۔ اُس نے ماں باپ کو شاد اور خدا نے اُس کو اپنے گھر میں آباد کیا ۔ اس کو سسرال گئے دوسرا مہینہ تھا کہ کلیم کو چار کہاروں کے کندھے پر لاد کر اس کے گھر لے گئے ۔ چوں کہ نعیمہ کے گھر آباد ہونے کا تذکرہ آ گیا ، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پہلے نعیمہ کا حال لکھا جائے اور کلیم کو ، جو دنیا میں اب مہمان چند روزہ ہے ، پیچھے دیکھ لیا جائے گا ۔

---

۳۶ ۔ اصحابِ کہف کا کتّا چند روز نیک لوگوں کے پیچھے پیچھے لگا رہا اور (اُن کی صحبت کے اثر سے) آدمی کی طرح مہذب ہو گیا ۔ سعدی کے اس شعر میں نیک صحبت کا اثر دکھایا گیا ہے ۔ مردم شد ، میں غالباً اس روایت کی طرف اشارہ ہے کہ اصحاب کہف کے کتّے کو بلعم بن بعوز کا مادی پیکر عطا ہو گیا تھا للهذا وہ جنت میں جائے گا ، اور بلعم جیسے کتّے کی شکل میں تبدیل کر دیا گیا تھا ، جنت سے محروم رہے گا ۔

فصل دوازدہم

نعیمہ خالہ کے یہاں رہ کر خود بہ خود درست ہو گئی - اس نے ماں باپ سے اپنی خطا معاف کرائی اور خدا نے اس کا مدتوں کا اُجڑا ہوا گھر پھر آباد کیا - کلیم نے بہن کے گھر وفات پائی - قصّے کا خاتمہ

نعیمہ اور کلیم، اس اعتبار سے دونوں کی کچھ ایک ھی سی کیفیت تھی، کہ زیادہ عمر ہو جانے کی وجہ سے عادتیں دونوں کی راسخ ہو چکی تھیں - بیاہے ہوئے اور صاحب اولاد دونوں تھے - کلیم کو بی بی سے کچھ اُنس نہ تھا تو نعیمہ کا شوھر سے بگاڑ تھا - نعیمہ اگرچہ کلیم کی طرح سب میں بڑی نہ تھی مگر بڑی بیٹی تھی - لیکن پھر بھی کلیم فولاد تھا تو نعیمہ اس کے مقابلے میں سیسا، بلکہ رانگا سمجھنا چاہیے - کلیم مرد تھا، قسی القلب؛ نعیمہ عورت، نرم دل - کلیم باہر کا چلنے پھرنے والا، سیکڑوں آدمیوں سے تعارف، ہزاروں سے جان پہچان - نعیمہ بےچاری پردے

کی رہنے والی - میل ملاپ سمجھو تو اور پیار اخلاص سمجھو تو ، ماں ، بہن خالہ ، نانی ، کنبے ، کی عورتوں سے ، وہ بھی گنتی کی - کلیم اور نعیمہ ، دل دونوں کے بیمار تھے - لیکن کلیم کے دل کو ذاتی روگ کے علاوہ صدہا بیماریاں اس قسم کی تھیں جو متعدی کہلاتی ہیں ، یعنی ایک سے اُڑ کر دوسرے کو لگ جاتی ہیں - پس کلیم کے مزاج میں چند در چند خرابیاں تھیں جو اس نے بری صحبتوں میں بیٹھ کر اپنے پیچھے لگا لی تھیں - نعیمہ میں، جو کچھ برائی تھی ، وہ ماں باپ کے لاڈ پیار ، علم کی ناداری اور عقل کی کوتاہی کی وجہ سے تھی - کلیم دلیر و بے باک اور عیار و چالاک تھا - نعیمہ بے وقوف ، بھولی اور ڈرپوک ، دل کی بودی - کلیم کے سر پر ایک سخت بلا مسلط تھی یعنی اس کے جلیس وہم نشیں ، اور نعیمہ اس سے بالکل محفوظ تھی - کلیم میں اس قسم کے بے ہودہ عیوب تھے جن میں آج کل کے کم بخت نوجوان شریف زادے کثرت سے مبتلا پائے جاتے ہیں ، یعنی عورتوں کی طرح درپے تزئین رہنا اور بناؤ سنگھار رکھنا - پہر دن چڑھے سو کر اُٹھے - ضرورتوں سے فارغ ہو کر آئینے کی تلاوت شروع ہوئی تو دوپہر کر دیا - اگرچہ رات کو مانگ اور پٹیوں کے لحاظ سے رومال باندھ کر اور سر کو الگ تھلگ رکھ کر سوئے تھے ، مگر آئینے میں منہ دیکھا تو زلف کی پریشانی پر اس قدر تاسف کیا کہ سر اسحاق نیوٹن صاحب[1] نے بھی اپنے اوراق کی ابتری پر اتنا افسوس نہ کیا ہوگا -

---

۱ - غالباً لفظ ''سر'' کی رعایت سے نیوٹن صاحب دھر لیے گئے - اُن کے مسودے کے ورق منتشر ہوئے ہوں گے جس کا ان بہ طور تشبیہہ ذکر کیا گیا ہے -

بارے اگر اصلاح کا دن نہ ہوا تو گھنٹوں کی محنت میں، وہ بھی اپنے اکیلے کی نہیں، بال ٹھکانے لگے اور مانگ درست ہوئی، اور اگر کہیں اصلاح کا روز منحوس ہوا تو سارا دن گزر گیا۔ ایک وضع خاص پر سر جھکائے جھکائے گردن شل ہوگئی۔ داڑھی اورمونچھوں کے ترشوانے میں منہ کو لقوہ مار گیا۔ حجام کی آنکھوں کے تلے اندھیرا آنے لگا مگر پھر بھی ان کا خط خاطر خواہ نہ بنا۔ کپڑے بدلنے کی نوبت پہنچی۔ ٹوپی قالب سے اتر کر آئی تو سر پیٹ لیا، مگر ایسی احتیاط سے کہ بال نہ بگڑیں۔ اس کے بعد انگرکھے کی چنٹ پر چیں بہ جبیں ہوئے۔ پھر تو ادھر انگرکھے کی آستینوں اور ادھر پائجامہ کی تنگ مہریوں کے ساتھ ہاتھا پائی شروع ہوئی۔ مشکل یہ آ کر پڑی کہ کپڑا کشاکش کا متحمل نہیں، ذرا زور پڑا اور مسکا اور ہاتھ پاؤں کہتے ہیں کہ ہم ان چیونٹی کے بلوں میں گھسنے کے نہیں۔ حَتّیٰ یَلِجَ الْجَمَلُ فِی سَمِّ الْخِیَاطِ[۲]۔ بارے کاغذ کے سہارے سے ہولے ہولے پھسلاتے کہیں پہروں میں جا کر مشکل آسان ہوئی۔ اب ملبوس خاص زیب تن تو ہوا، مگر کس کیفیت سے کہ تنگی اور چستی کے مارے مشکیں الگ کسی ہوئی ہیں، پاؤں علیحدہ جکڑے ہوئے ہیں اور سارا بدن گویا شکنجے میں ہے[۳]۔

۲۔ حتیٰ کہ اونٹ سوئی کے ناکے میں سے پار ہو جائے (قرآن مجید۔ سورہ : ۷ آیت : ۳۸)

۳۔ یہ اگلے وقتوں کے ''ٹیڈی بوائے'' تھے۔ لیکن اس زمانے میں 'ٹیڈیت' کی وبا صرف دو شہروں یعنی دہلی اور لکھنؤ تک محدود تھی اور سب سے بڑی بات یہ کہ عورتوں کا طبقہ اس کے اثر سے بالکل محفوظ تھا۔

کھانسنا ، چھینکنا ، جمائی ، انگڑائی تو در کنار، گھنڈی تکمے کے لحاظ اور بندوں کے پاس خاطر سے اچھی طرح سانس بھی نہیں لے سکتے ۔ غور کرنے کی بات ہے کہ لباس سے غرض اصلی بدن ڈھانکنا اور آسائش پہنچانا ہے ۔ اس میں کبر و نخوت کو دخل دے کر کیا ناس مارا ہے کہ غرض اصلی گئی گزری ہوئی ، اور تکلیف و ایذا آلٹی گلے مڑھی گئی ۔ مقصود تھی پردہ پوشی ، ان بزرگ ذات نے اس میں تراش خراش اور وضع داری کو ایسا شامل کیا کہ کپڑوں نے اندرون دل تک کا لفافہ آدھیڑ کر رکھ دیا ۔ اب ان کے حالات لکھنے کی ضرورت نہیں ۔ صورت ببیں حالش مپرس ۔

کلیم بھی ایک اس طرح کا چھیلا تھا ، بد وضع ، آوارہ ، جس کے اطوار و عادات جا بہ جا لکھے جا چکے ہیں ۔ اس خصوص میں نعیمہ شرفا کی بہو بیٹیوں کی طرح کَالدُّرِّ الْمَکْنُوْنِ[۴] ، محفوظ و مصؤن تھی ۔ اس میں اور کلیم میں بے مبالغہ فرشتہ اور شیطان کی نسبت سمجھنی چاہیے ۔ غرض نعیمہ کا روبراہ ہونا دشوار ضرور تھا مگر نہ کلیم کی طرح محال ؛ مشکل البتہ تھا ، لیکن نہ کلیم کی مانند متعذر ۔ خالہ کے یہاں ڈولی سے اتری تو جوں خالہ کی شکل دور سے نظر پڑی کہ بھوں بھوں رونا شروع کیا ۔ دیہات کی مستورات کا تو یہ قاعدہ ہے کہ اگر کوئی مہمان یا مسافر بہت دنوں کے بعد آتا ہے تو اس سے مل کر رونے لگتی ہیں ، اس واسطے کہ اس وقت ان کو مفارقت کی سختیاں اور تکلیفیں اور یادگاری و انتظار کی زحمتیں یاد آتی ہیں ۔ مگر دہلی کا

---

۴ ۔ احتیاط سے رکھے ہوئے موتی کی طرح ۔

یہ دستور نہیں ہے ۔ یہاں کی عورتیں اُسی حالت میں روتی ہیں جب کہ طرفین میں سے کسی کا کوئی عزیز و قریب زمان جدائی میں مر گیا ہو ۔ ورنہ یوں مہمان و مسافر کے آنے پر رونا دلی والیاں منحوس سمجھتی ہیں ۔ گو خالہ کو دیکھ کر نعیمہ کے دل میں جوش پیدا ہوا تھا مگر اس کو ضبط کرنا چاہیے تھا ۔ لیکن نہ تو نعیمہ کو اتنی عقل تھی کہ اتنی بات سمجھتی ، اور شاید سمجھتی بھی ہو تاہم وہ دل پر اس قدر ضابط نہ تھی ۔ خالہ نے جو اس کو روتے دیکھا سخت تعجب کیا ۔ بھانجی کی عادت سے واقف تھیں ۔ سمجھ تو گئیں کہ ماں سے روٹھ کر آئی ہے ، اسی کا یہ رونا ہے ۔ لیکن جلدی سے دوڑ کر بھانجی کو گلے سے لگا لیا اور پیار چمکار کر بہت کچھ تسلی دی اور سمجھایا کہ اللہ رکھے بیٹے کی ماں ہوئیں ، اب تمھاری عمر بچوں کی طرح رونے کی نہیں ہے ۔ ہمسایے کی عورتیں سنیں گی تو کیا کہیں گی ؟ جانے دو بس کرو ، طبیعت کو سنبھالو ، جی کو مضبوط رکھو ۔

نعیمہ : ''اماں جان نے مجھے مارا ، اوں اوں ۔''

خالہ : ''مارا تو کیا ہوا ؟ ماں باپ ہزار بار دلار کرتے ہیں تو نصیحت کے واسطے مار بھی بیٹھتے ہیں ۔ ماں باپ کی مار ، مار نہیں سنوار ہے ۔ تمھاری نانی ، خدا جنت نصیب کرے ، بڑی ہتھ چھٹ تھیں ۔ تم اس بات کو سچ ماننا کہ اب ہم اُن کی مار کو ترستے ہیں ۔ ماں باپ کی مار کیا ہر ایک کو نصیب ہوتی ہے ۔ جنھیں خدا کو بہتر کرنا منظور ہوتا ہے ، وہ ماں باپ کی مار کھاتے ہیں ۔ بھلا تم

نے اس بات کا خیال کیا ۔ ہوش میں آؤ، تو دیکھو کہ تمھارا بیٹا بھی تمھارے رونے پر ہنستا ہے ۔ (ننھے بچے کی طرف مخاطب ہو کر) کیوں جی بڑے میاں ! تم کچھ اپنی اماں جان کو نہیں سمجھاتے ؟"

بچہ : "آغوں !"

خالہ : "آغوں غوٹے ، دودھ پی پی کر میاں ہوئے موٹے ۔

غرض خالہ نے نعیمہ کے رونے کو باتوں میں ٹال دیا۔ نعیمہ چندے جھینپتی سی رہی ۔ مگر پھر تو ہنسی خوشی رہنے لگی ۔ اگرچہ خالہ نے بھانجی سے رونے کا سبب مصلحتاً دریافت نہیں کیا ، مگر موقع سے صالحہ کو الگ لے جا کر ساری حقیقت پوچھی ۔ اور جب اس کو بہن کے گھر دین داری کی چھیڑ چھاڑ کا ہونا معلوم ہوا تو اس کو اس قدر خوشی ہوئی کہ بیان میں نہیں آ سکتی اور اس نے مصمم ارادہ کر لیا کہ جب تک نعیمہ کو پکی دین دار نہ بنا دے ، گھر سے رخصت نہ کرے ۔ خالہ کے گھر رہ کر نعیمہ کی عادتوں کا خود بہ خود درست ہوجانا ، عمدہ مثال ہے اس کی کہ صحبت سے بڑھ کر تعلیم کا کوئی اچھا طریقہ نہیں ۔ ماں کے گھر چند خاص باتیں نعیمہ کی اصلاح میں خلل انداز تھیں ۔ اول تو اس نے ماں اور تمام خاندان کو بے دینی کی حالت میں مدتوں زندگی بسر کرتے ہوئے دیکھا ، پس بالضرور ان کی نصیحت کو وہ وقعت نہیں ہو سکتی تھی جو یہاں خالہ کی باتوں کو تھی ۔ دوسرے ، ماں کے گھر بھائی بہن نوکر چاکر پاس پڑوس والے ، کتنے لوگ تھے جو

نعیمہ کو ابتدائے عمر سے ایک طرز خاص پر دیکھ چکے تھے ۔ نعیمہ کو ان کے روبرو طرز جدید اور جدید بھی کیسا کہ طرز سابق سے مخالف ، اختیار کرتے ہوئے عار آتی تھی ۔ تیسرے ، ماں کے یہاں اتفاق سے اس کو ایک سختی بھی پیش آ گئی تھی اور وہ سختی اس کی حالت کو کسی طرح مناسب نہ تھی ۔ چوتھے ، اس کو ماں پر بڑا ناز تھا ، یعنی اُن کی خدمت میں شدت سے گستاخ تھی اور ان کے کہنے کی مطلق پروا نہ کرتی تھی ۔ خالہ کے یہاں آ کر رہی تو کسی نے بھول کر بھی اس سے تذکرہ نہ کیا کہ دین داری بھی کوئی چیز ہے ، یا خدا کی پرستش بھی انسان کا ایک فرض ہے ۔ مگر تھا کیا ، کہ چھوٹے بڑے سب ایک رنگ میں رنگے تھے: صِبْغَةَ اللهِ وَ مَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللهِ صِبْغَةً[5] اور ان کی تمام حرکات و سکنات شان دین داری لیے ہوئے تھیں ۔ اُن کی نشست و برخاست ، اُن کی رفتار و گفتار ، اُن کا قول و فعل ، اُن کی بات چیت ، اُن کا میل جول ، اُن کا لڑائی جھگڑا ، اُن کا کھانا پینا ، اُن کی خوشی ، اُن کا رنج ، کوئی ادا ہو ، وہ ایک نرالی دین دارانہ ادا تھی ۔ نعیمہ کو خالہ کا گھر ایک نئی دنیا معلوم ہوتا تھا ۔ اگرچہ ابتداءً وہ یہاں کے اوضاع کو حقارت سے دیکھتی تھی ، لیکن جوں جوں وہ ان دستورات سے مانوس ہوتی گئی ، ان کی عمدگی اور بہتری اس کے ذہن میں بیٹھتی گئی ۔ اور آخر اس کو ثابت ہوا کہ بے دین زندگی ، محض

---

۵ ۔ ترجمہ : (مسلمانو! ان لوگوں سے کہو کہ ہم تو) اللہ کے رنگ (میں رنگے گئے) اور اللہ کے رنگ سے اور کس کا رنگ بہتر ہوگا (سورۂ البقر ، آیت : ۱۲۸)

ایک بے اطمینان ، بے سہارے زندگی ہے ۔ اگر رنج و ایذا ہے ، تو کوئی وجہ تسلی ، کوئی ذریعۂ تشفی نہیں اور اگر آرام و خوشی ہے تو اس کو ثبات و قرار نہیں ۔ فاقہ ہے تو صبر نہیں ، کھانا ہے تو سیری نہیں ۔ بدی کی سزا نہیں ، نیکی کی جزا نہیں ۔ بے دین آدمی ایسا ہے، جیسے بے نکیل کا اونٹ ، بے ناتھ کا بیل ، بے لگام کا گھوڑا ، بے ملاح کی ناؤ ، بے ریگولیٹر کی گھڑی ، بے شوہر کی عورت ، بے باپ کا بچہ ، بے تھیوے کی انگوٹھی ، بے لالی کی مہندی ، بے خوشبو کا عطر ، بے باس کا پھول ، بے طبیب کا بیمار ، بے آئینے کا سنگھار ۔ یعنی دین نہیں تو دنیا و ما فیہا سب ہیچ اور عبث اور فضول اور پوچ اور لچر ہے ۔

نعیمہ نے رفتہ رفتہ خود بہ خود خالہ کی تقلید شروع کی ۔ وہ ہمیشہ پہر سوا پہر دن چڑھے سو کر اٹھتی تھی اور یہاں گھر بھر ، چھوٹے بڑے ، منہ اندھیرے اٹھ ، ضرورتوں سے فارغ ہو ، عبادت الٰہی میں مصروف ہوتے تھے۔ گھر بھر کا اٹھنا اور وہ بھی نرا اٹھنا اور چارپائیوں پر لدے بیٹھے رہنا نہیں بلکہ چلنا پھرنا ، کام کاج کرنا ؛ ہر چند نعیمہ کی وجہ سے احتیاط کی جاتی تھی مگر کہاں تک ، کچھ نہ کچھ آہٹ آواز ہوتی ہی تھی ۔ بعد چندے نعیمہ کی آنکھ بھی سب کے ساتھ کھلنے لگی ، اور جاگی تو ممکن نہ تھا کہ اس کو اپنی حالت پر تنبہ نہ ہو ۔ اس واسطے کہ وہ اپنے تئیں دیکھتی تھی کہ بچے کی نجاست میں لتھڑی ہوئی پڑی انگڑائیاں لے رہی ہے ؛ سست ، اداس ، مضمحل ، نیند کے خمار سے کسل مند ۔ اور دوسرے ہیں کہ چاق چوبند ، چست وچالاک،

تازہ دم ، پاک صاف ، خدا کی درگاہ میں شکر کے سجدے کر رہے ھیں کہ رات امن چین سے کٹی اور دعائیں مانگ رہے ھیں کہ بار الہا ! ہم کو روزی دے ، اتنی کہ فراغت سے کھائیں اور رزق دے ، ایسا کہ دوسرے کے آگے ہاتھ نہ پھیلائیں ، حاجت نہ لے جائیں ۔ بار خدایا ! بیماروں کو شفا ، گم راھوں کو ھدایت ، قیدیوں کو رھائی ، مسافروں کو امن ، بھوکوں کو روزی ، قحط زدوں کو ارزانی ، تشنہ کاموں کو پانی ، مایوسوں کو امید ، ناکاموں کو کام یابی کی نوید ، مفلسوں کو قناعت ، تونگروں کو سخاوت ، بے اولادوں کو اولاد ، نا مرادوں کو مراد ، جاھلوں کو علم ، عالموں کو عمل ، زاھدوں کو اخلاص ، حاکم وقت کو توفیق عدل و داد ، رعیت شاد ، ملک آباد ، کیا اپنے کیا غیر ، کل جہان کی خیر[٦] ۔

تنبہ ھوئے پیچھے نعیمہ کی اصلاح ھوئی ھوائی تھی ۔ تھوڑے ھی دنوں میں وہ دین دار خدا پرست بن گئی ۔ نماز روزے کی پابند ، وعظ و نصیحت کی دل دادہ ، منکسر ، متواضع ، ملن سار ، صلح جو ، نیک خو شائستہ باوجودے کہ نعیمہ ایک آسودہ حال گھر کی بیٹی تھی اور اس نے ناز و نعمت میں پرورش پائی تھی اور ماں باپ کو اس کی دل جوئی اور خاطر داری ھمیشہ ملحوظ رھتی تھی ، بایں ھمہ وہ اپنے مزاج ، اپنی عادات ، اپنے خیالات کے پیچھے سدا ناخوش رھا کرتی تھی ۔ اور چوں کہ طبیعت میں برداشت مطلق نہ تھی ، ذرا سی تکلیف کو وہ مصیبت کا پہاڑ بنا لیتی ۔ اگر کسی

٦ ۔ یہاں دعا کا عام انداز دکھایا گیا ھے ۔

نوکر نے مرضی کے مطابق کوئی چھوٹا سا کام نہ کیا ، یا مثلاً کھانے میں نمک پھیکا یا تیز ہوگیا ، یا روٹی کو چتی لگ گئی ، یا کپڑے کی سلائی اس کی خاطر خواہ نہ ہوئی ، یا بچہ کسی وقت رونے لگا ، ان میں سے ایک ایک بات کا سارے سارے دن اس کو جھکڑے لگ جاتا تھا ۔ اور جو کہیں خدا نخواستہ خود اس کی طبیعت یونہی سی علیل ہو گئی ، یا اس کو اپنی خانہ ویرانی کا کبھی خیال آ گیا تو ہفتوں گھر کا عیش منغص ہوا ۔ اب خیالات دین داری کے ساتھ اس کو عافیت اور اطمینان کا مزہ ملا ۔ دنیوی کوئی تکلیف نہ تھی جو اس کو ایذا دیتی ہو ۔ مگر ہاں ماں باپ کی نا رضامندی اس کے دل میں کانٹے کی طرح کھٹکتی تھی اور ایک ایک لمحہ اس پر شاق تھا ۔

اسی اثنا میں خدا نے اپنے فضل سے نعیمہ کی خانہ آبادی کی صورت بھی نکال دی ۔ نعیمہ کا شوہر بڑا دین دار تھا اور اس کو بی بی ملی نعیمہ جو ان دنوں دین سے مطلق بے بہرہ اور خدا پرستی سے کلیۃً بے نصیب تھی ۔ ہرچند وہ نعیمہ کے حسن صورت پر فریفتہ تھا مگر اختلاف عادات ، اختلاف عقائد ایک ایسا پردہ تھا کہ وہ دونوں میں اتحاد کے پیدا ہونے کا مانع تھا ۔ ساس نندیں ، میاں بی بی کی اتنی ناموافقت کا سہارا پا کر ایسی بے رخ ہوئیں کہ نعیمہ کا رہنا دشوار کر دیا ۔ اب نعیمہ کی تبدیل حالت کے تھوڑے ہی دن بعد صالحہ کے

ے ۔ ابتدائی ایڈیشن کے سوا نئے پرانے تمام نسخوں میں جھکڑ کی جگہ جھگڑا درج ہے ۔ جکھڑ لگنے کے معنی ہیں دھن لگ جانا ، کسی بات کے پیچھے پڑ جانا ۔

چچا کے گھر شادی کی تقریب پیش آئی - نعیمہ کو دہرا بلاوا
آیا ایک تو صالحہ کے رشتے سے ، دوسرا سسرال کی طرف سے ،
صالحہ کی چچا زاد بہن اور نعیمہ ، دیورانی جٹھانی بھی تھیں -
شادی کے مجمع میں اور عورتوں نے تو اپنی رات گیت گانے
اور لایعنی باتیں بنانے میں ضائع کی ، اور نعیمہ نے نماز عشاء
سے فارغ ہو کر صلٰوۃالتسبیح[۸] کی نیت باندھی تو آدھی رات
ہو گئی - پھر تھوڑی دیر سو کر تہجد پڑھنے کھڑی ہوئی تو
صبح کردی - نعیمہ کی شب بیداری اور تہجد گزاری کی خبر
جب اس کے شوہر نے سنی تو غایت درجہ محظوظ ہوا - اور
اگرچہ وہ کبھی کبھی سسرال آتا جاتا تھا اور اپنی ذات سے
بی بی کا بڑا خیال رکھتا تھا ، لیکن بی بی کے بےدین ہونے کی
وجہ سے ، اس کو ، اپنی ماں بہنوں کے مقابلے میں ، اس کی
طرف داری کرنے کا موقع نہیں ملتا تھا - اب جو اس نے
بی بی کا دین دار ہونا سنا ، تو ڈولی لے کر دوڑا ہوا
سسرال آیا -

نعیمہ ماں کے رضا مند کرنے کے لیے بیتاب تو تھی ہی ،
شادی میں جو دونوں ایک جگہ جمع ہوئیں تو نعیمہ دور سے
ماں کو دیکھ دوڑ کر قدموں پر گر پڑی - ادھر فہمیدہ ،
باقتضائے مہر مادری ، من جانے کے لیے بہانہ ڈھونڈھتی تھی -
بیٹی کو جھکتے دیکھ ، جلدی سے اٹھ ، گلے لگا لیا - اور
جب بہن اور بھانجی سے نعیمہ کا حال اور رات کے وقت اس کو
خشوع و خضوع کے ساتھ عبادت الٰہی کرتے دیکھا ، تو

---

۸ - نفل نماز جس میں بہ وقت قیام پندرہ بار اور بہ وقت
رکوع و سجدہ و قومہ ، دس دس بار سبحان اللہ وغیرہ کلمات کا
ورد کرتے ہیں -

اس نے نہ صرف بیٹی کی خطا سے درگزر کی ، بلکہ پہلے سے زیادہ ریجھ ریجھ کر اس کو پیار کیا ۔ اور جب شادی کے مہمان رخصت ہوئے تو بہن بھانجی کا بہت بہت شکریہ ادا کر کے بیٹی کو اپنے ساتھ گھر لوا لائی ، اور محلے کی بیبیوں کو جمع کر کے ایک ایک سے اس کو ملوایا ۔ ادھر نعیمہ ، ساری بیبیوں میں کشادہ پیشانی سے اپنے قصور کا اظہار کر کے ، کبھی تو ماں کے پاؤں پر سر رکھ دیتی تھی اور کبھی حمیدہ کو گود میں لے لے کر پیار کرتی تھی ، اور اس کی پیشانی پر جہاں کیل کا داغ تھا ، بوسے دیتی تھی ۔ کبھی بیدارا کو بلا بلا کر پاس بٹھاتی اور دولتی کے بدلے دونوں ھاتھ اس کے سامنے جوڑتی تھی ۔ آج شام کو تو نعیمہ ماں کے گھر آئی ، اگلے دن بڑے سویرے اس کا میاں ڈولی لے آ موجود ہوا ۔ نعیمہ چندے سسرال جا کر رہی تو نہ صرف میاں بلکہ ساس ، نندیں ، سارے کا سارا کنبہ ، اس کی نیکی کا مرید و معتقد تھا ۔

نعیمہ کو اپنے گھر آئے دوسرا مہینہ تھا کہ کلیم ، اس حالت سے کہ اوپر بیان کی گئی ، بہن کے یہاں پہنچا ۔ بھائی کی ایسی ردی حالت دیکھ کر بہن پر اور بہن بھی کیسی خدا ترس ، جو صدمہ ہوا قابل بیان نہیں ۔ کلیم اسی کیفیت سے بہن کے گھر رہا ۔ ایک چھوڑ دو دو ڈاکٹر ، شہر کے نامی جراح ، مل کر اس کا علاج کرتے تھے مگر اس کے زخموں کا بگاڑ کم نہ ہوتا تھا ۔ صبح و شام تھوڑی دیر کے لیے کبھی اس کو ہوش آ جاتا تھا ، اور ضرور اس نے سمجھا ہوگا کہ کہاں ہے اور کون لوگ اس کی تیمار داری کر رہے ھیں ۔ لیکن اس کی ناتوانی اور نقاھت

دیکھ کر کوئی اس سے کسی قسم کا تذکرہ نہیں کرتا تھا ۔ باتیں کرتے بھی تھے تو تسلی و تشفی کی ۔ یہاں تک کہ زخموں کا فساد انتہا کو پہنچ گیا ، اور اس کی مدت حیات پوری ہو چکی ۔ مرنے سے پہلے یکایک ایسی اس کی حالت بہتر ہو گئی کہ وہ اچھی خاصی طرح آپ سے آپ اٹھ کر بیٹھ گیا ۔ اور خلاف عادت اس نے فرمائش کر کے دوگوشتہ پلاؤ پکوایا اور تندرستوں کی طرح وہ گھر والوں کے ساتھ بہت دیر تک پکار پکار کو باتیں کرتا رہا ۔ اس نے اپنے تمام حالات ، جب سے کہ وہ گھر سے نکلا اور جب تک کہ وہ مجروح ہو کر پھر دہلی آیا ، ذرا ذرا بیان کیے اور بھائی بہن ، ایک ایک کر کے سب کا حال پوچھا ۔ اس وقت وہ اپنے افعال پر تاسف کر کے اتنا رویا اتنا رویا کہ اس کو غش آ گیا ۔

بڑی دیر کے بعد ہوش میں آیا تو اس نے ماں سے کہا کہ آج کی غیر معمولی توانائی جو تم مجھ میں دیکھتی ہو ، میں خوب سمجھتا ہوں کہ یہ میری آخری توانائی ہے ۔ خون جو مدار حیات ہے ، مطلق میرے بدن میں باقی نہیں رہا ۔ بلکہ میں جانتا ہوں کہ شاید میری ہڈیوں کے اندر کا گودا بھی پگھل پگھل کر فنا ہو چکا ہے ۔ گو تم لوگ میری تقویت کی نظر سے تسلی و تشفی کی باتیں کرتے ہو مگر میں سمجھ چکا ہوں کہ میں اس مرض سے جاں بر ہونے والا نہیں ۔ میں اپنے مرنے کو ترجیح دیتا ہوں ، اس نالائق زندگی پر جو میں نے بسر کی ۔ اگرچہ میں نے اپنی زندگی ، خرابی اور رسوائی اور فضیحت اور والدین کی نا رضامندی اور خدا کی نافرمانی میں کاٹی ، اور ایسی ہزاروں لاکھوں زندگیاں

ہوں تو بھی اس نقصان کی تلافی کی امید نہیں ، جو اس چند روزہ زندگی میں مجھ کو اپنی بدکرداری سے پہنچا ، مگر مجھ کو تین طرح کی تسلی ہے ۔ اول یہ کہ میں مرتا ہوں تائب ، نادم ، پشیمان ، خجل ، متاسف ۔ دوسرے یہ کہ سفر عاقبت شروع کرتے وقت ایسے لوگوں میں ہوں جو اس راہ کے منزل شناس اور میرے دل سوز اور ہم درد اور شفیق اور مہربان حال ہیں ۔ تیسرے یہ کہ غالباً میری زندگی دوسروں کے لیے نمونۂ عبرت ہوگی ، کہ اس صورت میں ، گو اپنی زندگی سے میں خود مستفید نہیں ہوا لیکن اگر دوسروں کو کچھ نفع پہنچے تو میں ایسی زندگی کو رائگاں اور عبث نہیں کہہ سکتا ۔ ع :

من نہ کردم شما حذر بہ کنید۹

اب مجھ کو دنیا میں سوائے اس کے اور کوئی آرزو باقی نہیں کہ میں ابا جان سے اپنا قصور معاف کرا لوں ۔

یہ کہہ کر اس پر بڑے زور کی رقت طاری ہوئی ۔ بےچارے کی طاقت تو مدتوں سے سلب ہو ہی چکی تھی ، رونا تھا کہ بےہوش ہو گیا ، اور اسی بےہوشی میں اس کا سانس اکھڑ گیا اور لگا ہاتھ پاؤں توڑنے ۔ نبضیں چھوٹ گئیں ، ہچکیاں لینے لگا ، ناک کا بانسہ پھر گیا ۔ عورتیں تو یہ حالت دیکھ کر رونے پیٹنے لگیں ۔ باہر مردانے سے نصوح دوڑا آیا ۔ اور عورتوں کو علیحدہ کر کے جزع و فزع نامشروع ۱۰

۹ - میں نے تو نہ کیا لیکن تم اس سے پرہیز کرو ۔

۱۰ - ایسی گریہ و زاری جو شرعاً ممنوع ہو ۔

سے منع کیا اور صبر جمیل کی تلقین کی اور بیٹے کے سرھانے بیٹھ کر یاسین پڑھنی شروع کی ۔ منہ میں شربت ٹپکایا ، اور اس کو قبلہ رو لٹایا ۔ کلمہ پڑھ کر سنایا ۔ شربت کا حلق سے اترنا تھا کہ کلیم نے آنکھیں کھول دیں اور باپ کو نگاہ حسرت آلود سے دیکھ کر اس نے ہاتھ جوڑے ، اور اسی حالت میں اس نے جان بہ حق تسلیم کی ۔ ع :

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

اس میں شک نہیں کہ اگر کلیم بچ جاتا تو وہ نیکی اور دین داری میں اپنے سب بھائی بہنوں پر سبقت لے جاتا ۔ اس نے مصیبتیں اٹھا کر اپنی رائے کو بدلا تھا ، اور آفتیں جھیل کر تنبّہ حاصل کیا تھا ۔ پس وہ مجتہد تھا اور دوسرے مقلد ؛ وہ محقق تھا اور دوسرے ناقل ۔ اس کا سا انجام خدا سب کو نصیب کرے ۔

کلیم کا جوان مرنا ایک ایسی بھاری موت تھی کہ ماں باپ تو دونوں گویا اس کے ساتھ زندہ درگور ہو گئے ۔ بھائیوں کا بازو ٹوٹ گیا ۔ بہنوں کے سر سے ایک بڑا سرپرست اٹھ گیا ۔ لیکن بہ تقاضائے دین داری سب نے صبر جمیل کیا اور ہر شخص نے بجائے خود عبرت پکڑی ۔ کلیم کے ساتھ نصوح کی وہ تمام کوششیں بھی تمام ہوئیں جو اس کو اصلاحِ خاندان کے لیے کرنی پڑتی تھیں ۔ کیوں کہ کلیم مرحوم کے سوا سب چھوٹے بڑے اس کی رائے میں آ چکے تھے ۔ یا تو ابتداءً علیم کے انٹرنس پاس کرنے کے لالے پڑے تھے ، یا اس نے بی ۔ اے پاس کیا ۔ ایک سے ایک عمدہ نوکری

گھر میں بیٹھے اس کے لیے چلی آتی تھی ، مگر اس نے نیک نہادی کی وجہ سے ، سر رشتۂ تعلیم کو یہ سمجھ کر پسند کیا کہ ہم وطنوں کو نفع پہنچانے کا قابو ملے ۔ سلیم بڑا ہو کر طبیب ہوا تو کیسا کہ آج جو دلی کے بڑے نامی طبیب ہیں وہ اسی کی بیاض کے نسخوں سے مطب کرتے ہیں ۔ ولیۂ مادر زاد حمیدہ ، قرآن اس نے حفظ کیا ، حدیث اس نے پڑھی ۔ اور اگر سچ پوچھیے ، تو شہر کی مستورات میں جو کہیں کہیں لکھنے پڑھنے کا چرچا ہے ، یا عورتیں خدا اور رسول کے نام سے واقف ہیں ، یہ سب بی حمیدہ کی بدولت ۔

جزاھا اللہ عنا خیر الجزا

ضمیمہ ۱

تبصرہ

(از مسٹر ایم۔کیمپسن ایم۔اے)

۱۸۷۳ء میں یہ کتاب ، مصنف کی طرف سے صوبائی حکومت کے اشتہار کے بہ موجب ، ایک انعامی مقابلے میں شرکت کی غرض سے ، مسٹر ایم۔ کیمپسن ، ڈائرکٹر سررشتۂ تعلیم ممالک مغربی و شمالی (موجودہ صوبہ یو۔پی۔ بھارت) کی خدمت میں پیش کی گئی تھی۔ مسٹر کیمپسن نے ایک سرکاری یاد داشت میں اس کتاب پر مفصل تبصرہ کیا اور اول درجے کے انعام (مبلغ ایک ہزار روپے) کی سفارش کی۔ کیمپسن صاحب کی مذکورہ یاد داشت گورنمنٹ گزٹ کے ضمیمے (مطبوعہ ۱۸۷۴ء) میں شائع ہوئی تھی۔ توبۃ النصوح کے دوسرے ایڈیشن (مطبوعہ نول کشور ، کان پور—۱۸۸۲ء) میں اس یاد داشت کا اردو ترجمہ (نیز لیفٹننٹ گورنر ، سر ولیم میور کی جانب سے سرکاری اعلانیے کا ترجمہ) ، مصنف کے دیباچے سے پہلے درج ہے۔ کیمپسن صاحب نے تبصرے کے علاوہ پوری کتاب کا خلاصہ بھی فصلاً فصلاً ، کئی صفحات میں لکھا ہے۔ تلخیص کا حصہ حذف کر کے بقیہ یاد داشت بہ جنسہ یہاں نقل کی جاتی ہے۔

مرتب

چٹھی جناب صاحب ڈائرکٹر بہادر سر رشتۂ تعلیم ممالک مغربی و شمالی

یادداشت نمبر ۳۸ بابت ۱۸۷۳ء

توبۃالنصوح کتاب اُردو تصنیف مولوی نذیر احمد

یہ کتاب ایک قصہ مسلمانوں کے ایک خاندانی حالات میں 'مرآت العروس' کے مصنف کا تصنیف کیا ہوا ہے اور اس سے غرض یہ ہے کہ اس ملک کے لوگ اپنے اطفال کو علم اخلاق اور دین کی تعلیم کرنے مین زیادہ شوق کے ساتھ متوجہ ہوں ـ اور بہ خلاف اس قاعدۂ مروجہ کے کہ لڑکوں کے واسطے باب تعلیم اُستاد بجائے والدین کے ہوتا ہے، مصنف نے یہ ثابت کیا ہے کہ والدین کی کوشش اور خود اُن کا چال چلن ہی ایک بڑی بنا تعلیم کی ہے ـ اور مصنف نے اس بات کی تمثیل میں صرف انہی نتائج قبیحہ کے بیان کرنے پر اکتفا نہیں کی جو والدین کی غفلت کا ثمرہ ہیں بلکہ جو نعمتیں اور برکتیں خاندانی حسن تربیت سے میسر ہوتی ہیں اُن کو بھی بہ خوبی ظاہر کر دیا ہے ـ اور اس کا مقصود اصلی یہ ہے کہ تربیت خاندانی جو فی الواقع درست اور اصول کے ساتھ ہو گویا عین دین داری اور خدا پرستی ہے ـ لیکن

اس بات کے کہنے میں اُس نے یہ احتیاط کی ہے کہ مبادا ایسے ملک میں اس کی نسبت کوئی غلط فہمی واقع ہو جہاں بہ قول مصنف ، ہر شخص کا عقیدہ جداگانہ معلوم ہوتا ہے ، اور تعصبات مذہبی اُس حد پر بڑھے ہوئے ہیں کہ عادات اور خیالات گو کیسے ہی فی نفسہ معقول ہوں ، جس حال میں کہ غیر مذہب والوں سے پیدا ہوں ، لوگ اُن کو وہم و وسواس کی نظر سے دیکھتے ہیں ۔ اسی لیے مصنف نے لکھا ہے کہ خانگی تعلیم کا مضمون لکھنے میں اگرچہ مذہبی تقریر سے گریز کرنا ممکن نہیں ہے ، لیکن اس کتاب میں کوئی ایسی بات نہیں ہے کہ جو مسلمان نہ ہوں اُن کے دل کو بری معلوم ہو ۔ اور جہاں مذہب کا ذکر آیا ہے ، وہاں وہ ذکر اس طور پر ہے کہ سب نیک آدمیوں کو مقبول خاطر ہو ۔ اور مصنف نے یہ بات سچی سچی کہی ہے ، نہ کچھ کمی کی ہے نہ زیادتی ۔ اور میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ خالص وحدانیت دین اسلام کی ، مصنف کے مطلب سے خوب مناسبت رکھتی ہے ۔ اس قصے میں ان اشخاص کا ذکر ہے ، یعنی خاندان کا بزرگ ، نصوح ، اس کی زوجہ فہمیدہ ، اور اس کے تین بیٹے ، کلیم ، علیم ، سلیم اور دو بیٹیاں ، نعیمہ اور حمیدہ ، اور ایک بھانجی صالحہ اور کئی اور اشخاص کے نام بھی قصے کے سلسلے میں آئے ہیں ۔ آغاز قصے کا اس بیان سے ہے کہ ایک مرتبہ دلی میں ہیضہ پھیلا اور نصوح ، جس کے دل کو اپنے چار طرف موت کی دست برد دیکھ کر بڑا صدمہ پیدا ہوا تھا ، اسی بلا میں مبتلا ہوا ۔ اُس نے جانا کہ میری موت بھی آ پہنچی ۔ اسی حالت میں اس کو ایک غفلت کی نیند آ گئی اور انجام کار اس بیماری سے اس کو صحت

بھی ہو گئی - اسی نیند میں یہ خواب دیکھا کہ اس عالم میں ہے جہاں سب روحیں جاتی ہیں - تمام حال اپنی عمر کا اور دین سے جو اس کو بے پروائی رہتی تھی ، اور اس کی خود پرستی اور اہل و عیال کے حقوق کے ادا کرنے کی غفلت ، یہ سب باتیں اس کے روبرو پیش آئیں ، اور اپنے خالق کے سامنے وہ عاصی و مجرم ٹھہرا - بعد صحت کے بھی یہی خیال اس کے دل پر غالب رہا اور اگلے حال سے بالکل اس کی طبیعت بدل گئی - اسی کے معنی توبۃالنصوح ہیں - اور آگے قصے میں بیان کیا ہے کہ اپنے امورات خانگی کی اصلاح اور ان دشواریوں کے رفع کرنے میں جو اس کو پیش آئیں اس نے کیا کیا تدبیریں کیں اور اس کتاب کی بندش میں انواع و اقسام کا بیان اور مکالمہ ہے - اور شاید مکالمہ حد سے زیادہ ہے - لیکن یہ بات کچھ قباحت کی نہیں ہے کیوں کہ طلاقت اور محاورہ اردو زبان کا جو بول چال کی زبان ہے ، اس سے پہلے کسی نے اس خوبی کے ساتھ قلم بند نہیں کیا ہے - مشرح بیان اس قصے کے مضامین کا فصلاً فصلاً یہ ہے - - - - - -

الحاصل ہماری دانست میں یہ کتاب لائق ہر طرح کی تعریف کے ہے - مولوی نذیر احمد پر ایسی کتاب کے لکھنے کے لیے آفرین ، جس کو اس ملک کے لوگ بغیر کسی نوع کی کراہیت دینی کے پڑھ کر خوش ہوں گے اور اس کے ساتھ ہی ان کو اس سے صاف ظاہر ہوگا کہ پستئی آداب صحبت و اخلاق کا چارہ خود ان کے ہی اختیار میں ہے - اور مصنف نے جو ان دنوں کے شاعروں کی تحقیر لکھی ہے ، وہ اسی لائق ہیں - اور اس قصے کی سنجیدگی کے مقابلے میں

ایک نوع کا تفنن اور تفریح طبع اس ظرافت سے حاصل ہوتی ہے جو ظاہر دار بیگ کی دم بازی اور دولت آباد کے مولویوں کے سامنے کلیم کے حیران اور بے دست و پا رہ جانے کے بیان میں ہے - جو نصیحتیں کہ صراحتاً یا ضمناً اس کتاب سے نکلتی ہیں وہ غالباً ہندوستانیوں کے لیے بڑی فائدہ مند ہوں گی اور خاص اُن میں سے یہ ہیں:

(۱) بے دینی کی خرابیاں - (۲) لڑکوں کا ابتدائی عمر سے تعلیم پانا اور والدین کا نیک ہونا اچھے چلن کی بنیاد ہے - (۳) عورتوں کی تعلیم کی ضرورت ، صالحہ کی نیکی اور نعیمہ کی جہل سے خوب ظاہر کی گئی ہے - (۴) صحبت نیک اور کتب پسندیدہ کا نتیجہ نو عمر لڑکوں کی اوضاع کی درستی کے باب میں - (۵) اخلاق کی نسبت صحبت بد کی قباحت اور معمولی کتب درسیۂ فارسی کی مضرت -

الغرض اس کتاب کی نسبت یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ ایک شخص تعلیم یافتہ ، دھلی کی زبان کا ماہر ، کیوں کر اپنی زبان کو فصاحت اور محاورے کے ساتھ نہ لکھے گا - کہیں قصد نمائش نہیں کیا گیا ہے اور نہ کہیں نشان علمیت کے اظہار کا پایا جاتا ہے - مصنف کی عبارت سادگی کی صفت رکھتی ہے - عربی اور فارسی الفاظ بول چال میں بلا تکلف مستعمل ہوتے ہیں ، نہ اس طور پر کہ بے محل معمے کے طور پر رکھ دیے گئے ہوں - اور ہندی الفاظ خانگی روز مرہ کے ایسے موقع موقع پر ہیں کہ ہندو اور مسلمان دونوں اُن پر مساوی ملکیت رکھتے ہیں - اور ایسے الفاظ اس کتاب میں تھوڑے نہیں آئے ہیں جو دیسی زبان

کے مروجہ لغات میں نہ ملیں ۔ پس جو طالب علم جی لگا کر پڑھے گا اس کو فائدہ عظیم ہوگا ۔ اور اکثر مقامات میں قصہ بہ طور مکالمے کے ہے ۔ اور یہ ایک ایسا طریق بیان ہے کہ ایک تو اُردو میں کم یاب ہے ، دوسرے اس زبان کے طلبا کے واسطے ایک بڑا فائدہ زبان صاف و مسلسل کا بخشتا ہے ۔ محاورات ایسے ایسے ہیں جن سے غیر ملک کے لوگ آگاہ نہیں ، لیکن ان سے دیسی زبان میں قوت و بلاغت پیدا ہوتی ہے ۔ مثلاً تالی دونوں ہاتھوں سے بجتی ہے ، کوئی اویر کوئی سویر ، تانت باجی راگ پایا ، جی برا کیا تھا ، بوٹیاں توڑ توڑ کر کھانا ، اور اسی طرح کے اور بہت سے محاورے ہیں جن کا لکھنا یہاں فضول ہے ۔

میں اس کتاب کو مصنف کی مرآۃالعروس اور بنات‌النعش سے افضل سمجھتا ہوں ۔ اس میں طرز عبارت اور قوت بیان کی خوبی ان دونوں کی بہ نسبت زیادہ ہے ۔ گو بعض اشخاص ، نصوح کی نصیحت کے منشاء اور باب ہشتم کی طول گفتگو کی نسبت ، جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ، اعتراض کریں ، لیکن خیال کرنا چاہیے کہ یہ طریقہ اس ملک کے مصنفوں کا ہے اور کسی وجہ سے دلیل ، قوت و زور کی کمی نہیں ہے ۔ کہیں کہیں میری دانست میں ایسا مضمون ہے جو اہل یورپ کی نظر میں ضعیف معلوم ہوگا ۔ مثلاً جس مدعا میں ثبوت کی حاجت نہیں اس میں ثبوت پیش کرنا اور جس میں حاجت ہے ، اس کے لیے ایسی دلیل گزرانی جس کے تسلیم کیے جانے میں کلام ہے ۔ لیکن یہ ایک ایسی مخصوص عادت ہندوستانیوں کی ہے کہ انھی چند مقالات سے جو اس

کتاب میں ھیں ، اصل حقیقت اس بات کی ظاھر ھوتی ھے[1] ۔ غرض یہ ایک ایسی کتاب ھے جس سے آردو پڑھنے والوں ، کیا مسلمان ، کیا ھندو اور کیا عیسائی ، سب کو فائدہ اور حظ ھوگا ۔ اور مجھ کو یقین ھے کہ ھندوستانی مولوی نذیر احمد کے نہ صرف اس لیے مشکور ھوں گے کہ آن کے نقص اس میں عموماً ظاھر کیے گئے ھیں ، بلکہ اس واسطے بھی کہ آن نقصوں کے رفع کرنے کا چارۂ کار بھی بتا دیا گیا ھے ۔ میری رائے میں مصنف مستحق انعام اول درجہ نہ یعنی ایک ھزار روپے کا ھے ۔

مقام نینی تال — میتھیو کیمپسن

۱۱ ستمبر ۱۸۷۳ء — ڈائرکٹر سر رشتۂ تعلیم ، ممالک مغربی و شمالی

---

۱ ۔ واضح ھو کہ اصل کتاب کے حاشیے پر عندالملاحظہ جناب صاحب ڈائرکٹر بہادر اور جناب لیفٹننٹ گورنر بہادر نے اپنے دستِ خاص سے اکثر جگہ کچھ کچھ عبارت خط پنسل سے لکھ دی تھی ۔ چناں چہ مصنف نے چھپنے سے پہلے کتاب پر نظر ثانی کر کے جہاں تک ممکن ھوا ایماء ارشاد کے مطابق کتاب میں ترمیم کردی ۔

ضمیمہ ۲

دیباچہ

از سر ولیم میور - کے - سی - ایس - آئی
سابق لفٹننٹ گورنر ممالک مغربی
(موجودہ یو - پی - ہندوستان)

۱۸۸۴ء میں مسٹر ایم کیمپسن نے توبۃالنصوح کا انگریزی میں ترجمہ کرکے سر ولیم میور کے دیباچے کے ساتھ لندن میں چھپوایا تھا - میں نے اپنے شاگرد عزیز، عبدالعزیز سیٹھی کی وساطت سے ولیم میور کے اس دیباچے کی نقل انڈیا آفس لندن کے کتب خانے سے حاصل کر لی ہے اور یہاں اس کا ترجمہ پیش کرتا ہوں - ولیم میور کے اس دیباچے میں، بیشتر انہی آراء کی تکرار ہے جن کا اظہار وہ دس سال پہلے، ۱۷ جنوری ۱۸۷۴ء کے سرکاری مراسلے میں فرما چکے تھے - توبۃ النصوح کے طبع دوم میں کیمپسن صاحب کے تبصرے کے بعد، اس مراسلے کا ترجمہ بھی درج ہے - (مرتب)

از سر ولیم میور

ہندوستان کی دیسی زبانوں میں ایسے صحت مند ادب کی نمایاں طور پر کمی محسوس ہوتی ہے جو مفید بھی ہو اور دل چسپ بھی - یہاں جو کتابیں عموماً ملتی ہیں، وہ قابل اعتراض مطالب و رجحانات سے بھری پڑی ہیں - سبق آموز اور دل کش کہانیوں پر مشتمل کتابیں جو نو عمر طلبہ یا خواتین کے مطالعے کے لیے موزوں ہوں ، گویا نہ ہونے کے برابر ہیں - اچھی کتابوں کی نایابی ، تعلیم اور بالخصوص لڑکیوں کی تعلیم کی راہ میں ایک بہت بڑی رکاوٹ ہے - پڑھنے لکھنے کے معاملے میں لڑکیوں کے سرپرست اور اُن کے شوہر ، اُن کی حوصلہ افزائی اسی لیے نہیں کرتے کہ اُن کے ذوق مطالعہ کی تسکین کے لیے صرف فحش اور قابلِ اعتراض کتابیں ملتی ہیں -

آج سے دس سال قبل ، حکومت کی جانب سے دیسی زبان کی بہترین تصانیف پر انعامات دیے جانے کا اعلان ہوا تھا - اس اعلان پر یہ کتاب مسٹر ایم - کیمپسن ، سابق ڈائرکٹر سررشتۂ تعلیم صوبہ‌جات شمالی و مغربی کے ملاحظے میں پیش کی گئی تھی اور اسے سو پونڈ کے انعام کا مستحق قرار دیا گیا تھا - توبۃالنصوح کے مصنف کو انعام عطا کرتے ہوئے مسٹر کیمپسن کے نام مندرجہ ذیل یاد داشت بھیجی گئی تھی

جو صوبہ جات شمالی و مغربی کے سرکاری گزٹ مجریہ ۱۸۷۴ء میں شائع ہوئی تھی :

"کتاب[1] کا مقصد اور زبان دونوں بہ غایت پسندیدہ اور قابل تعریف ہیں ۔ فی الواقعی ، بیان کی قوت ، اسلوب کا پاکیزہ و سادہ حسن ، محاورات کی بے مثال برجستگی ، اور دلی کی عام بول چال کے مطابق فارسی و عربی الفاظ کی موزون آمیزش ، اس کتاب کے اعلیٰ اوصاف ہیں ۔ ضرب الامثال اور اشعار کے بہ کثرت و بر محل استعمال اور روز مرہ کی بے تکلف گفتگو کے فقروں نے اس کتاب کی افادیت میں بہت زیادہ اضافہ کر دیا ہے ۔ اس کے مطالعے سے مسلمانوں کی خانگی زندگی کے بارے میں جو بصیرت حاصل ہوتی ہے ، اس کی وجہ سے یہ کتاب یورپی قارئین کے لیے مرأة العروس کی طرح بے حد قابل قدر اور سبق آموز ہے ۔

اس کتاب کا سب سے نمایاں پہلو ، اس کا مذہبی رنگ ہے ۔ کتاب کے دیباچے میں مصنف نے کھلے طور پر اعتراف

---

۱ ۔ یہاں مذکورہ یاد داشت کے ابتدائی جملے حذف کردیے گئے ہیں ۔ توبۃالنصوح کے دوسرے ایڈیشن میں سے اس عبارت کا محذوف حصہ یہاں نقل کیا جاتا ہے : "نواب لفٹننٹ گورنر بہادر بالاجمال اس کتاب کو از بس پسند کرنے میں آپ کے ساتھ متفق الرائے ہیں ۔ البتہ بہ مقابلہ مراۃالعروس کم تر درجے کی ہے ۔ یعنی بہ اعتبار بندش اور حالات کے اس میں وہ بے ساختگی نہیں جو مرأۃالعروس میں ہے اور چند اشخاص کا ذکر ایک مرتبہ کیا گیا ہے مگر پھر ان پر نظر نہیں رکھی گئی ۔ مکالمے میں اور نصائح میں بہت طول ہے اور کہیں کہیں بے محل بھی ہے مگر ساتھ ہی اس کے یہ بات بھی ہے کہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

کیا ہے کہ مذہب کے حوالے کے بغیر ، حسن معاشرت کی تعلیم اور خانگی زندگی میں نیکی اور اخلاق کی تلقین ، اس کے بس کی بات نہیں ۔ اس بارے میں مصنف نے اپنی رائے کا اظہار نہایت پرزور الفاظ میں کیا ہے ۔ چناں چہ وہ لکھتا ہے :

''پہلے میرا ارادہ تھا کہ خانہ داری اور بود و باش باہمی کے واسطے نیکی اور خوش خوئی کا ضروری ہونا بغیر تعلق مذہبی ثابت کروں ، لیکن جب لکھنا شروع کیا تو معلوم ہوا کہ ایسا قصد کرنا گویا روح کو قالب سے ، شعاع کو آفتاب سے ، عرض کو جوہر سے ، ناخن کو گوشت سے جدا کرنا ہے ۔''

پس اس بیان کے مطابق ، اس قصے کا ماحصل یہ ہے کہ سرگرمی اور خلوص دل سے اپنے عقاید مذہبی کی پیروی کرنا ہی خانگی مسرتوں اور سعادتوں کی بنیاد ہے ۔ اس میں شک نہیں کہ مصنف کے اس اصول سے اختلاف رائے کی گنجائش ضرور ہے ، لیکن مصنف نے جس گہری عقیدت اور خلوص نیت سے ، اسلامی نقطۂ نظر کے مطابق اپنے مطلب کو ادا کیا ہے ، اس کی نسبت کسی کو شبہ نہیں ہو سکتا[2] ۔

---

۲ - یہاں جو عبارت حذف کی گئی ہے اس کا ترجمہ درج ذیل ہے :

''اول نظر میں جناب لفٹننٹ گورنر بہادر کو تردد ہوا تھا کہ شرائط اشتہار مندرجۂ اشتہار انعامات کے لحاظ سے ، جس میں بہ صراحت مذہبی کتابیں مستثنیٰ کی گئی ہیں ، یہ کتاب اس اشتہار کے منشا میں داخل ہے یا نہیں ۔ لیکن پوری کتاب ۔ ۔ ۔ الخ

پوری کتاب کو بہ غور ملاحظہ فرمانے کے بعد عزت مآب مطمئن ہیں کہ مصنف نے اپنے اس عہد کو بڑی سے خوبی نباہا ہے کہ اس کتاب میں کوئی ایسی بات آنے نہ پائے جو مذہبی تعصبات پر مبنی ہو یا غیر مذہب والوں کو ناگوار گزرے ۔ مصنف نے ایمان اور عقائد مذہبی کے ضمن میں جن بنیادی حقیقتوں پر زور دیا ہے اور جو نصیحتیں اس میں بیان کی ہیں اُن سے غیر مذہب والے بھی مستفید ہو سکتے ہیں ۔ عزت مآب لفٹننٹ گورنر بہادر اس بارے میں آپ کی رائے سے متفق ہیں کہ یہ کتاب نہ صرف مسلمانوں بلکہ ہندو اور عیسائی قارئین کو بھی پسند خاطر ہوگی ۔ بعض ایسے واقعات مثلاً فہمیدہ کے ساتھ چھوٹی لڑکی کا مکالمہ نہایت فطری اور پر اثر ہے ۔ خواہ کسی مذہب کا آدمی ہو ، اسے پڑھ کر متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا ۔

اس صورت میں سر ولیم میور صاحب کو اس امر کے تسلیم کرنے میں کوئی تامل نہیں کہ یہ کتاب سرکاری اشتہار کی منشا کے مطابق ہے ۔ جناب ممدوح اسے ایک ہزار روپے کا پورا انعام عطا فرماتے ہیں اور یقین کرتے ہیں کہ یہ کتاب اُردو میں ایک بیش قیمت اضافہ ثابت ہوگی اور مسلمانوں میں عظیم شہرت و مقبولیت حاصل کرنے کے علاوہ دیگر اقوام کے لوگوں میں بھی بہ کثرت رواج پائے گی ۔"

ہندوستانی ادب کی موجودہ حالت کے پیش نظر ، مجھے یقین ہے کہ انگریز فضلاء کو اُردو زبان میں تحریر و تقریر کا فصیح و با محاورہ اسلوب سکھانے کے لیے ، اس مصنف کی دو کتابوں ، مراۃالعروس اور توبۃالنصوح سے بہتر اور کوئی

کتاب دست یاب نہیں ہو سکتی ۔ ان کتابوں کی زبان ، دھلی کی عام بول چال کی خالص زبان ہے ۔ ان قصوں میں ایسے مخصوص واقعات بہ کثرت آئے ھیں جن سے مسلمانوں کے سماجی رسوم اور عادات و خصائل پر روشنی پڑتی ہے ۔ اس لحاظ سے یہ دونوں کتابیں اُن خواتین کے لیے خاص طور پر مفید ثابت ہوں گی جنھیں شمالی ھند کے مسلمان شرفاء کے زنان خانوں میں آمد و رفت کا موقع ملتا ہے ۔

مسٹر کیمپسن نے کتاب کی عبارات کو بڑی احتیاط اور قابلیت سے انگریزی زبان میں منتقل کیا ہے ۔ زبان اور روز مرہ کی نزاکتوں اور لطافتوں کو بڑی خوبی سے ادا کیا اور مشرقی خیالات ، روایات اور تلمیحات کو مغربی قارئین کے لیے قابل فہم بنا کر پیش کیا ہے ۔ یہ ایک ایسی مہم ہے جس میں بعض اوقات بڑی دقتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے ۔ بعض بیانات اور بعض مکالمے جو اصل کتاب میں غیر ضروری طور پر طویل تھے ، مختصر کر دیے گئے ہیں ۔

اس کتاب کی ایک اھمیت یہ بھی ہے کہ یہ ھمیں مذھب اسلام کی اعلیٰ قدروں ، اور نیکی کو فروغ دینے اور بدی کو مٹانے کے رحجانات سے آگھی بخشتی ہے ۔ درحقیقت اس قصے کا مذھبی سانچا بے مثال ہے اور میری رائے میں مسلمانوں کے لیے ایک انوکھی چیز ہے ۔ اس اعتبار سے یہ کتاب مسلمانوں کی اُن تمام تصانیف سے ایک جداگانہ حیثیت رکھتی ہے ، جو اب تک میری نظر سے گزر چکی ھیں ۔ مسلمانوں میں جو مذھبی کتابیں رائج اور مقبول ھیں ، عموماً محض رسمی قسم کی ھیں اور اُن کا دائرہ صرف فرائض اور

عبادات کے بیان تک محدود ہے ۔ سماجی اور خانگی زندگی میں مذہب کو ایک فعال اور مؤثر عنصر کی حیثیت سے پیش کرنا ، مسلمان مصنفوں کے لیے ایک اچھوتا موضوع ہے ۔ در اصل یہ بات ہندوستان جیسے کسی ایسے ہی ملک میں ممکن تھی جو عیسائیت کے زیر اثر آ چکا ہو ، اور یہ امر واقعہ ہندوستان میں ہماری مذہبی تبلیغ کی کامیابی کی ایک حوصلہ افزا علامت ہے[3] ۔ چوں کہ نذیر احمد اس کتاب کی تصنیف کے وقت تک انگریزی ادب سے بہت کم آشنا تھے ، لہذا انھوں نے یہ اثرات بالواسطہ قبول کیے ہوں گے ۔ اور بالواسطہ متاثر ہونے کی وجہ سے یہ حقیقت اور زیادہ روشن ہو گئی ہے ۔ یہ کہانی انگریزی خیالات کا نتیجہ ضرور ہے لیکن کسی انگریزی کتاب کا چربہ نہیں ہے ۔

ان تمام وجوہ سے میں مسٹر کیمپسن کے اس ترجمے کی سفارش اُن تمام حضرات سے کرتا ہوں جو ہندوستان کے معاملات سے دل چسپی رکھتے ہیں اور اس بارے میں فاضل مترجم کا ہم نوا ہوں کہ ہندوستانی زبان کے اکتساب اور اس زبان کے امتحان اہلیت کے لیے اصل کتاب کا مطالعہ بہ طور نصاب کرنا چاہیے ۔

جولائی ۱۸۸۴ء — ڈبلیو ۔ ایم ۔

---

۳ ۔ مغربی علوم اور انگریزی ادب کے اثرات کو عیسائیت کی تبلیغ کے ثمرات قرار دینا ، سر ولیم میور کے مذہبی غلو اور تبلیغی جوش و خوش فہمی کی علامت ہے یا تاریخی حقائق کی غلط توجیہ و تعبیر کی کوشش ۔

ضمیمہ ۳

(فرہنگ)

فرہنگ

الفاظ و مرکبات و امثال و محاورات

الف

آسمان پر تھگلی لگانا	دشوار کام کرنا ۔ جہاں کوئی نہ جا سکے وہاں پہنچنا ۔
آصف خانی	نیم آستین ۔ صدری یا جیکٹ ۔
آنکنا	قیمت کا اندازہ کرنا ۔ دام لگانا ۔
آوازہ کسنا	طعنہ زنی کرنا ۔ فقرے کسنا ۔ چھیڑنا ۔
آوے کا آوا	(بگڑنا یا خراب ہونا کے ساتھ) پورے خاندان کا بگڑ جانا ۔ آوا : کمہار کی بھٹی یا پزاوہ) ۔
ابخرے	بخارات ۔
اُبٹنا (اسم)	جسم کی رنگت نکھارنے کا مسالہ ۔ غازہ ۔ (پورب میں ابٹن کہتے ہیں)

اٹوانٹی کھٹوانٹی لے کر پڑنا	غم یا غصے کے سبب سے الگ جا کر پڑ رہنا ۔ اٹوانٹی کھٹوانٹی بھی مستعمل ہے ۔
احتساب	محاسبہ ۔ جانچ پڑتال ۔
احزاز	جمع کرنا ۔ مضبوط کرنا ۔
ادعائی رشتے	منہ بولے رشتے ۔
ادعائی ناخوشی	بے وجہ یا بناوٹی خفگی ۔
ادھیانا	آدھا ہو جانا
ادھیڑ بُن	الجھن ۔ کشمکش ۔ تذبذب ۔ (اُدھیڑنا اور بننا سے مشتق) ۔
اذعانی	یقینی ۔
اربابِ دول	دولت مند لوگ ۔
ارتباط	ربط ضبط ۔ میل جول ۔
ارزاقِ عباد	بندوں کو رزق پہنچانا ۔
استخفاف	ذلت ۔ سبکی ۔ تحقیر ۔
استخفافِ معصیت	گناہ کو ہلکا سمجھنا ۔
استشارہ	صلاح و مشورہ چاہنا ۔
استفراغ	فراغت چاہنا ۔ قے ۔
استفراغِ امتلائی	جو قے معمولی متلی یا پیٹ کی خرابی کی وجہ سے ہو (وبائی نہ ہو) ۔
استمالت	دل جوئی ۔ مائل کرنا ۔

استمراری پٹّا	دوامی پٹّا جس میں کاشت کار کو بے دخل نہ کیا جا سکے ۔
استہزا	ہنسی اڑانا ۔ تضحیک ۔
اسم با مسملی	جس میں نام کی صفت موجود ہو ۔
اسہال	دست آنا۔پیٹ چلنا ۔
اشتغال	مشغولیت ۔
اشراق	نفل نماز جو طلوع آفتاب کے بعد پڑھی جاتی ہے ۔
اعوان	عون کی جمع ۔ مدد گار ۔
افتاد	مصیبت ۔ ڈھنگ (مزاج یا طبع کے ساتھ) ۔
اکتفا	کفایت کرنا ۔ کافی ہونا ۔ بس کرنا ۔
اکل کُھرا	بد مزاج ۔ خود غرض ۔ جو دوسروں کو دیکھ نہ سکے ۔ تنہا خور (اکیلا سے اکل اور خور سے بگڑ کر کھرا ہو گیا) ۔
الُاھنا	شکوہ ۔ شکایت ۔
الجوع	بھوک ۔
الحاح	گڑ گڑانا ۔ منت سماجت کرنا ۔
العطش	پیاس ۔
الوانِ نعمت	طرح طرح کی نعمتیں ۔
انصار	مددگار ۔

انضمام	ضم ہونا (یا کرنا) ۔ مل جانا ۔
انقطاع	کٹ جانا ۔ ختم ہو جانا ۔

ب

بازیافت	کھو کر پا جانا ۔
باز دید و زیارت	کسی کی آمد کے بعد جواباً ملنے کے لیے جانا ۔ زیارت یعنی دیکھنا یا ملنا ۔ ملاقات ۔
باقیات الصالحات	نیک یادگاریں ۔ نیک کام جو مرنے کے بعد باقی رہ جائیں ۔
بالا بتانا	ٹالنا ۔ بہانہ کرنا ۔ دھوکا دینا ۔
بالخاصہ	خصوصاً ۔
بالفعل	فی الحال ۔ سردست ۔
بالمشافہ	رو بہ رو ۔ آمنے سامنے ۔
باوا آدم	طور طریق ۔ (بدل جانا یا نرالا ہونا کے ساتھ) ۔
بدرقہ	ساتھی ۔ رہنما ۔
برأت	صفائی ۔ بری ہونا ۔
برد اطراف	ہاتھ پاؤں کا ٹھنڈا ہو جانا ۔
بزرگداشت	خاطر داری ۔
بساطی	عام ضرورت کی چھوٹی چھوٹی چیزیں بیچنے والا ۔

بطالت	بے کاری ۔ دلیری ۔
بغلی دشمن	دوست نما دشمن ۔ وہ شخص جو ساتھ رہ کر دشمنی کرے ۔
بلاد دور دست	دور دراز کے شہر ۔
بن زان	ران کا سرا ۔ ران کی جڑ ۔
بہ طوع خاطر بہ طیب خاطر	خوش دلی سے ۔
بیاض	نوٹ بک جس میں پسندیدہ اشعار ، منتخب اقوال یا نسخے وغیرہ لکھے جاتے ہیں ۔
بیچا	ہوّا ۔ بچوں کو ڈرانے کے لیے ایک فرضی شکل ۔
بیعت	فرماں برداری کا پیمان کرنا ۔ مرید ہونا ۔
بے غیرتی کا ٹھیکرا آنکھوں پر رکھنا	بے شرمی اختیار کرنا ۔ دیدہ دلیر ہو جانا ۔
بے ہمہ و باہمہ	سب کے ساتھ رہتے ہوئے بھی سب سے بے نیاز ۔

پ

پاکھنڈ	مکر ۔
پائے گاہ	منصب ۔ منزلت ۔ اجلاس ۔

پتا مارنا	محنت مشقت سے کام کرنا ۔ کسی مقصد کی لگن میں دکھ جھیلنا ۔
پٹنا	(بالفتح) (۱) پر ہو جانا (۲) ادا ہو جانا (۳) تباہ ہونا ۔
پٹہ دار	مقررہ لگان پر مقررہ معیاد کے لیے زمین لینے والا ۔
پٹی دار	حصے دار ۔ گاؤں کی آراضی میں مختلف حصوں کے مالک ۔
پزاوہ	اینٹوں کا بھٹا ۔
پذیرا	قابل قبول ۔ منظور ۔
پکی لکڑی کا لچکانا	عادات پختہ ہو جانے کے بعد بدلنے کی کوشش کرنا ۔
پکھاوجی	پکھاوج (طبلہ ، ایک قسم کی ڈھولک) بجانے والا ۔
پوتھ (پوت)	کانچ کے چھوٹے ، سوراخ دار دانے ۔
پوست کندہ	کھول کر ۔ واضح طور پر ۔
پھٹ پھٹ	لعنت ملامت ۔ بے زاری یا نفرت کا اظہار ۔
پھڈّی جوتی	بہت نیچی ایڑی کا جوتا ۔
پھلوٹی	پہلی اولاد ۔
پیش بینی مستقبلات	آنے والے واقعات کا پہلے سے اندازہ کر لینا ۔

پیمک	کلابتوں کی بنی ہوئی سنہری یا روپہلی لیس ۔

ت

تابڑ توڑ	مسلسل ۔ لگاتار ۔
تامّل صحیح	صحیح غور و فکر ۔
تانت باجی راگ پایا (یا بوجھا) ۔	تانت یعنی ساز کا تار بجتے ہی راگ کو سمجھ لینا یعنی ایک اشارے میں بات کو پا لینا ۔
تبرِ ستم	(اضافت تشبیہی) ظلم و ستم کا کلہاڑا ۔
تجاہل	انجان بننا ۔
تحمیق	احمق بنانا ۔
تراہ تراہ مچنا (یا ہونا)	کسی چیز کی قلت یا قحط کے موقع پر چیخ پکار مچنا ۔ واویلا ۔ فریاد ۔ دہائی ۔
ترتیل	صاف صاف ، ٹھیک ٹھیک پڑھنا ۔ (عموماً تلاوت قرآن کے لیے بولا جاتا ہے) ۔
تسمہ لگا نہ رکھنا	کوئی کسر نہ چھوڑنا ۔ کوئی کمی نہ رکھنا ۔
تشنّج	اینٹھن ۔ جسم کے اعضا کا اکڑنا یا کھنچنا ۔

تعّب	رنج ۔ ماندگی ۔ تھکن ۔
تفضیح	فضیحت کرنا ۔ رسوا کرنا ۔
تکفّل	پرورش ۔
تکفیر	کافر بنانا ۔ کفر کا فتویٰ لگانا ۔
تکیہ(ہونا یا کرنا)	بھروسہ ہونا یا کرنا ۔
تلافیٔ مافات	جو نقصان ہو چکا ہو اُسے پورا کرنا۔
تالّی	لوٹے کی ٹونٹی کی دھار ۔
تمتعاتِ دنیوی	دنیا کے فائدے ۔
تمر ہندی	املی ۔ ایک ترش پھل ۔
تمسّک	دستاویز ۔
تنبّہ	آگہی ۔
تن بہ تقدیر	تقدیر کے بھروسے ۔ قسمت کے حوالے۔
توشہ خانہ	گودام ۔
توطیہ	تمہید ۔ تقریب ۔
توئی	کپڑے پر بنی ہوئی بیل جو دوپٹوں، چادروں اور رضائیوں میں ٹانکی جاتی ہے ۔
تہجد	وہ نفل نماز جو آدھی رات کے بعد اور صبح صادق سے پہلے پڑھی جاتی ہے ۔
تھڑی تھڑی کرنا	لعنت ملامت کرنا ۔ رسوا کرنا ۔

تھورنا (تُھرنا)	کھانا ۔ یہ لفظ تحقیر یا تضحیک کے طور پر بولا جاتا ہے جیسے پینے کے لیے ڈھکوسنا ۔
تھیوا	انگوٹھی کا گھر جس میں نگینہ یا کندہ شدہ مہر جڑی جاتی ہے ۔

ٹ

ٹانگ کے نیچے (یا ٹانگ تلے) سے نکل جانا ۔	ہار مان لینا ۔
ٹرّا	اکھڑّ ۔ بد مزاج ۔ سخت کلام ۔
ٹرخانا	بے دلی سے کسی کام کو انجام دینا ۔
ٹکر کا	برابر کا ۔ جوڑ کا ۔

ث

ثبات	قیام ۔ قرار ۔
ثقہ	قابل اعتبار ۔ معتبر ۔

ج

جاسوس ایزدی	خدائی مخبر ۔ مراد فرشتے ۔
جبلّت	فطرت ۔ طبیعت ۔
جیٹا	حوصلہ ۔ ہمّت ۔

جدوار	ایک دوا کا نام ۔
جُزئی	جزُ (بہ معنی حصہ) سے مشتق ہے ۔ مُراد چھوٹی ، معمولی ۔
جمع خرچ نویس	اکاؤنٹنٹ ۔
جود	فیّاضی ۔
جوع البقر	گائے بیل کی سی بھوک ۔ ایک بیماری جس میں آدمی کھانے سے کبھی سیر نہیں ہوتا ۔
جہت	وجہ ۔ سبب ۔ سمت ۔
جھوڑ (ہونا)	سخت کلامی ۔ جھڑپ ہو جانا ۔

چ

چرب زبانی	چکنی چپڑی باتیں کرنا ۔ خوشامدانہ باتیں کرنا ۔
چکلے دار	جاگیر دار ۔ ناظم علاقہ (چکلا عموماً رنڈیوں کے محلے کو کہتے ہیں ۔ لیکن اس کے معنی جاگیر ، صوبہ یا علاقہ کے بھی ہیں) ۔
چلّہ	چالیس دن کی مدت ۔
چمپت ہو جانا	غائب ہو جانا ۔ رفوچکر ہو جانا ۔
چونچال	چست و توانا ۔ شوخ و شریر ۔
چھاتی پر پتھر رکھنا	صبر کرنا ۔ برداشت کرنا ۔

چھٹی	بچے کی پیدائش کے چھٹے روز کی رسوم جب زچہ کو غسل دیا جاتا ہے - (یہ رسم عموماً نویں یا دسویں دن ہوتی ہے، مگر چھٹی ہی کہلاتی ہے) -
چھدّا اتارنا	الزام سے بچنے کے لیے برائے نام کوئی کام کرنا - سر کا بوجھ اتارنا -
چہرے پر ہوائیاں اڑنا	چہرہ فق ہو جانا - چہرے کی رنگت بدلنا -
چھے جانا	ناک یا کان کے سوراخوں کا زیور کے بار سے بڑھ جانا یا پھٹ جانا -
چھیجنا	گھٹنا - کم ہونا - مرنا -
چین	شکن (چیں بہ جبیں ہونا یعنی پیشانی پر شکن ڈالنا - خفگی کا اظہار کرنا)-
چیں بول جانا	عاجزی کا اظہار کرنا - پناہ مانگ لینا -
چیٹلد	مکر - فریب -

ح

حاذق	ماہر - کامل - تجربہ کار (حکیم کی صفت میں مستعمل ہے) -
حبلِ متین	مضبوط رسی -

حتمی	مضبوط ۔ پکا ۔ قطعی ۔
حساب مناسخہ	میراث و ترکے کا حساب ۔
حسنِ معاشرت	اچھی طرح مل جل کر رہنا ۔ خانگی زندگی کی خوبی ۔
حیزّ التوا میں ڈالنا	ملتوی کر دینا ۔ ٹالنا ۔ حیزّ یعنی حد ، کنارہ ، جگہ ۔
حیص بیص	بحث ۔ حجت ۔ جھگڑا ۔ غوغا ۔

خ

خاصہ	شاہی دسترخوان کا کھانا ۔
خدم	خادم کی جمع ۔
خسّت	کنجوسی ۔ کمینہ پن ۔
خشوع و خضوع	عاجزی و انکسار ۔
خصومات	جھگڑے ۔ مقدمے ۔
خفقانی المزاج	جلد گبھرانے یا ڈرنے والا ۔ خفقان یعنی ہول دل یا دل کی دھڑکن کی بیماری ۔
خفیف	ہلکا ۔ کم مرتبہ ۔
خلقِ عظیم	اعلیٰ اخلاق ۔
خنّاس	شیطان ۔ شیطانی وسوسہ ۔
خوابِ مشوّش	ڈراؤنا خواب ۔

د

دارالجزا	بدلا پانے کی جگہ ۔ مراد آخرت ۔
دارالمحن	رنج و غم کا گھر ۔ مراد دنیا ۔
دادنی	پیشگی رقم ۔
دائرۂ عبودیت	بندگی کا دائرہ ۔
دبکیّا (دبکیّوں)	سونے چاندی کے تاروں کو کوٹنے والا ۔ تارکشی کا کام کرنے والا ۔ دبکنا یعنی تار کو کوٹنا یا تار کشی کا کام کرنا ۔
دُر دُر	دور دور کا مخفف ۔ دھتکارنے کے لیے بولا جاتا ہے ۔
دَرشنی ہنڈی	ساہوکاروں کا جاری کیا ہوا چیک ۔ یا ڈرافٹ جس کی ادائیگی فوراً ہو ۔
دفعِ مضرت	نقصان سے بچاؤ ۔
دندانِ آز	حرص کے دانت مراد حرص یا لالچ ۔
دوپٹا	(لغوی معنی) دو پاٹ کی چادر ۔ (۱) اوڑھنی ۔ (۲) وہ چادر جس کو مرد کمر میں باندھتے ہیں ۔ پٹکا ۔
دوگانۂ فرض	دو رکعت نماز فرض ۔
دُھر	انتہائی بُعد مسافت ۔ سیدھا راستہ جو منزل تک پہنچا دے ۔ سیدھ ۔

دھواں دھوں — زور زور سے ۔ (مارنے پیٹنے کے لیے بولا جاتا ہے) ۔

دیولی — مٹی کا چھوٹا دیا ۔

ڈ

ڈاک بٹھانا — کہاروں ، گھوڑوں یا ہرکاروں کی چوکی بٹھانا ۔ سفر کے لیے گھوڑے یا پالکی کا سلسلہ وار انتظام کرنا ۔

ڈاڑھیں مارنا (دھاڑیں مارنا) — چیخ چیخ کر رونا ۔ واویلا کرنا ۔

ڈھکوسنا — بے تکلف یا بے تحاشہ پی جانا ۔ یہ لفظ طنزاً یا استہزا کے پیرایے میں بولا جاتا ہے ۔

ڈھو جوان — بھاری بھرکم جوان ۔

ڈیڑھ اینٹ کی مسجد (بنانا) — دوسروں سے الگ ہو کر کام کرنا ۔ یہ محاورہ علیحدگی پسندی کے لیے بولا جاتا ہے ۔

ذ

ذھول — بھول ۔

ر

رام کہانی — طویل اور پُر درد کہانی ۔

ربقۂ اطاعت	حلقۂ اطاعت ۔
رت جگا	خوشی کی تقریب میں رات بھر جاگنا اور جشن منانا ۔
ردائت	بگاڑ ۔ خراب ہونا ۔
رسی جل گئی پر بل نہ گیا	مصیبت اٹھانے اور سزا پانے کے باوجود غرور اور اکڑ باقی ہے ۔
رفاہ	بھلائی ۔ فائدہ ۔
رقّت	نرم دلی ۔ دل کا پگھل جانا ۔
روبراہ ہونا	راستے پر لگ جانا ۔
رودار	عزت والا ۔ معزز ۔
رویائے صادقہ	سچے خواب ۔
ریگولیٹر	گھڑی کی رفتار کو متوازن رکھنے والا پرزہ ۔

ز

زار نالی	آہ و زاری ۔
زبردست کا ٹھینگا سر پر	زبردست کی سختی بھی برداشت کرنی پڑتی ہے ۔
زڑ لگنا	دھن لگ جانا ۔

س

ساق	پنڈلی ۔

سجیع	نظم کا وہ ٹکڑا جس میں کسی شخص کا نام اس خوبی سے لایا جائے کہ وہ شعر کا جزو مطلب ہوجائے ۔
سخن پروری	بات کی پچ کرنا ۔
سر قفلی	وہ رقم جو مکان پر قبضہ لیتے وقت مالک مکان کو پیشگی ادا کی جاتی ہے ۔
سر منڈاتے ہی اولے پڑنا	ابتداء ہی میں مصیبت سے دو چار ہونا ۔
سر مو	بال برابر ۔ بہت تھوڑا ۔
سر مونڈنا	درگت بنانا ۔ ٹھگ لینا ۔
سر ہونا	پیچھے پڑنا ۔ الجھنا ۔
سقیم الحال	خستہ حال ۔ بد حال ۔
سنجاف	حاشیہ ۔ گوٹ ۔ ایک قسم کا کپڑا جو گوٹ کے لیے استعمال ہوتا ہے ۔
سنجھلا	منجھلے سے چھوٹا (بڑے سے چھوٹا منجھلا کہلاتا ہے) ۔
سوابق نعمت	پچھلے احسانات یا بخشش ۔
سواد خط	پڑھنے لکھنے کا ملکہ ۔ عموماً تحریر کی مہارت کے لیے آتا ہے ۔
سوختنی	جلا دینے کے قابل ۔
سوا گز کی زبان	زبان دراز ۔ بد زبان ۔
سوء ہضم	بد ہضمی ۔ ہاضمے کی خرابی ۔

سہل انگاری — کسی چیز کو آسان سمجھ کر غفلت برتنا ۔

سیر (بالکسر) — خود کاشت اراضی (سیر کرنا یعنی زمین کو اپنی کاشت میں لانا) ۔

سیر چشم — غنی ۔ سخی ۔

سینگ کٹا کر بچھڑوں میں ملنا — بڑے ہوکر بچوں کی سی حرکتیں کرنا ۔

ش

شادی مرگ — فرط مسرت سے مر جانا ۔

شیاطین الانس — آدمیوں کے شیطان ۔ شیطان بہ شکل انسان۔ مراد بد معاش و مفسدلوگ ۔

شیشہ آلات — جھاڑ فانوس ۔ روشنی کا ساز و سامان۔

ص

صبرِ جمیل — کسی سانحے کے وقوع پر صبر و شکر کرنا ۔ ارادی صبر جو ایک مجاہدہ ہے اور جس پر ثواب ملتا ہے ۔

صحبت نا ملائم — نا مناسب یا بری صحبت ۔

صرف توجہ — توجہ پھیر لینا ۔

صمیم قلب — خلوص دل ۔ دلی یک جہتی و یک رنگی ۔

ض

ضعیف البنیان	کمزور بنیاد (یا کمزور فطرت) والا۔
ضغطه	کشمکش ۔ تنگی ۔ سختی ۔
ضماد	لیپ ۔
ضیق	تنگی ۔

ط

طغرا	نشان ۔ علامت ۔ پیچیدہ خط میں نام و القاب وغیرہ کی تحریر ۔
طلعت	شکل ۔ چہرہ ۔
طنطنه	آن بان ۔ ناز و شیخی ۔
طوطی بولنا	شہرت یا ناموری ہونا ۔
طوعاً و کرھاً	چار و ناچار ۔ خواہ مخواہ ۔

ع

عاق	نا فرمانی ۔ (عاق کرنا یعنی فرزندی سے الگ کر دینا) ۔
عبید	غلام ۔
عجز و الحاح	عاجزی کرنا اور گڑگڑانا ۔
عرصۂ خطر	خطرے کا میدان ۔ خطرے کی جگہ ۔

عرض — جوہر کا مقابل ۔ جو چیز اپنے وجود کے لیے جوہر کی محتاج ہو ۔ مثلاً روح جوہر ہے اور جسم عرض ۔

عذابِ مقیم — مستقل عذاب ۔

عزیزالوجود — قابل قدر ہستی ۔

عسیرالانقیاد — مشکل سے مطیع ہونے والا ۔

علّامہ — (اردو محاورے میں) بے باک اور شوخ چشم عورت ۔

عمیم — عام (لطف و کرم کے ساتھ یہ صفت لاتے ہیں) ۔

عناصر اربعہ — چار عنصر جن سے کائنات بنی ہے : آب و خاک و باد و آتش ۔

عواطف — عاطفت کی جمع ۔ مہربانی ۔ عنایت ۔

عہد واثق — پکا وعدہ ۔ (واثق یعنی مضبوط پختہ)

ف

فارغ خطی — وہ رسید یا دستاویز جس میں رقم کی بے باقی تحریر ہو ۔

فدیہ — مال جو قیدی کو چھڑانے کے لیے دیا جائے ۔ صدقہ ۔

فراست صائب — صحیح سمجھ بوجھ ۔

فراغ خاطر ۔ — بے فکری ۔

فرمانِ واجب الاذعان — ایسا حکم جس پر عمل کرنا ضروری ہو ۔

فروتنی — عاجزی ۔ انکسار ۔

فیل مچانا — ضد کرنا ۔ مچلنا ۔

فیل ھائی — مکارہ ۔ فریبی عورت ۔

ق

قاطبۃً — بالکل ۔ کلیۃً ۔

قدغن — پابندی ۔ ممانعت ۔

قدوم — تشریف آوری ۔ آمد ۔

قرضِ حسنہ — وہ قرض جس پر سود نہ لیا جائے ۔

قسیّ القلب — سنگ دل ۔

قضائے مبرم — نہ ٹلنے والی قضا ۔

قطعہ — نظم کی ایک صنف ۔ خوشنویسوں کے لکھے ہوئے اشعار جو زینت کے لیے دیواروں پر آویزاں کیے جاتے ہیں ۔

قل اعوذیے — تحقیر کے طور پر اُن لوگوں کے لیے بولا جاتا ہے، جو قرآن کی چند آیتیں یاد کر کے مولویوں کا پیشہ اختیار کر لیتے ہیں ۔

قلبِ ماهیت	شکل و صورت کا بدل جانا ۔ کایا پلٹ ۔
لہری روزہ	غصے کا فاقہ ۔

ک

کاربرآری	کام نکالنا ۔
کالطبیعة	طبیعت یا فطرت کی طرح ۔ فطری ۔
کانوں کان خبر نہ ہونا	انتہائی خاموشی اور راز داری سے ۔
کبیدگی	رنجیدگی ۔
کٹھ حجتی	کج بحثی ۔ ہٹ دھرمی ۔
کچا ساتھ ہونا	چھوٹے بچوں کی پرورش کا بار ہونا ۔
کراماً کاتبین	دو فرشتے جو ہر وقت انسان کے ساتھ رہتے اور نیک و بد اعمال لکھتے ہیں ۔
کرّوبیاں	فرشتے ۔
کریلا اور نیم چڑھا	کریلا کڑوا ہوتا ہی ہے ۔ اگر اس کی بیل نیم کے درخت پر چڑھا دی جائے تو اور زیادہ کڑوا ہو جائے گا ۔ اسی طرح جو برا ہو ، بری صحبت میں اور بگڑے گا ۔

کریم النفسی	سخاوت ۔
کلمہ بھرنا	تعریف کرنا ۔
کماحقہ	جیسا کہ حق ہے ۔
کما ینبغی	جیسا کہ چاہیے ۔
کنڈے	آپلے ۔
کنفسٍ واحدۃ	ایک فرد واحد کی طرح ۔ متفقہ طور پر ۔
کورنمکی	نمک حرامی ۔
کوڑی	ایک بیسی ۔ (کوڑیوں یعنی بیسیوں) ۔
کُوڑ مغز (یا کوڑھ مغز)	بے عقل ۔ بے وقوف ۔
کوکھ میں کیڑے پڑنا	عورتوں کا کوسنا ہے ۔ اولاد نہ ہونا ۔
کھانے کو جچّہ اور کام کو بچہ	کھانا زچّہ کی طرح (زچّہ کو خوب مقوی غذائیں کھلائی جاتی ہیں) اور کام بچوں کی طرح کرنا ۔
کھڑاگ	بکھیڑا ۔ اصل لفظ کٹھراگ ہے ۔
کھرچن	تہہ دیگی ۔ دیگ کی تہہ سے لگا ہوا پلاؤ یا زردہ جو زیادہ گھی جذب کرنے کی وجہ سے لذیذ لیکن سخت اور ثقیل ہوتا ہے ۔

کھرّے	طبیعت کے روکھے۔ خشک مزاج ۔ اکھڑ ۔
کھل کھیلنا	آزادی سے رنگ رلیاں منانا۔ بے باک ہو جانا ۔
کیا پدّی اور کیا پدّی کا شوربہ	پدّی ایک ننھا سا پرندہ ہے ۔ اس کا شوربہ ھی کتنا ہوگا ۔ ہیچ و حقیر کے معنی میں یہ مثل بولی جاتی ہے ۔

گ

گجَر دم	گجر بجنے کے وقت ۔ علی الصباح ۔
گڑ کھاؤں اور گلگلوں سے پرہیز	خفیف سی برائی سے نمائشی پرہیز کرنا اور بڑی بڑی برائیوں کا ارتکاب کرنا ۔ گلگلا ایک قسم کا میٹھا پکوان ہے ۔ خمیر دار آٹے میں گڑ ملا کر پکوڑوں کی طرح تیل میں تلا جاتا ہے ۔
گندھی	عطر فروش ۔
گنگا جمنی	سنہری روپہلی ۔ یا جس پر سنہرا روپہلا کام ہو ۔

ل

لا جَرم	البتہ ۔ ضرور ۔

لاڈو — پیاری ۔ لاڈلی ۔

لاشئے محض — بالکل بے حقیقت ۔ ھیچ ۔

لاکھا — پان کی سرخی ھونٹوں پر جانا ۔

لام کاف — گالی گفتار ۔

لا یعنی — بے کار ۔ فضول ۔

لقّا کبوتر — ایک قسم کا کبوتر جس کی گردن ہر وقت اکڑی رھتی ہے ۔

للّو پتّو — خوشامدانہ باتیں ۔

لوتھ — لاش ۔

لہنا — نصیب ۔ بہرہ ۔ نفع ۔ فائدہ ۔

لینت — نرمی ۔

م

ماخوذ — پکڑا ھوا ۔ گرفتار ۔ نکالا ھوا یا اخذ کیا ھوا ۔

ما فی‌الضمیر — مطلب ۔ دل کی بات ۔

ماکولات — کھانے کی چیزیں ۔

مآل اندیشی — انجام کا خیال ۔ عاقبت اندیشی ۔

مالکان محبس — جیل خانے کے حاکم ۔

ماند و بود — رھن سہن ۔

متخیّلہ — قوت خیال ۔ تخیل ۔

متشرّع — پابند شریعت ۔

متعذّر — محال ۔ دشوار ۔

متکفّل — کفالت کرنے والا ۔ خرچ اٹھانے والا ۔

متمرّد — سرکش ۔ نافرمان ۔

مٹھلونا — نمک کی کمی سے پھیکا یا سیٹھا ۔

مجتہد — اجتہاد کرنے والا ۔ قرآن و حدیث کی روشنی میں نئی راہ نکالنے والا ۔

مجی — آنا ۔ (جاء سے مصدر میمی) ۔

محامد — حمدت کی جمع۔قابل تعریف باتیں ۔

محاکمہ — فیصلہ ۔

مختل الحواس — حواس باختہ ۔ پاگل ۔

مخمّر — گوندھا ہوا ۔ فطرت یا خمیر میں شامل ۔

مداخل — محاصل ۔ آمدنی ۔ مالیہ ۔

مدحت طرازی — قصیدہ خوانی ۔ مدح سرائی ۔

مرافعہ — مقدمہ ۔ اپیل ۔

مرتفع — بلند ۔ اونچا ۔

مردہ شو	میت کو غسل دینے والا ۔
مرزائی (یا مرزئی)	نیم آستین ۔ شلوکہ ۔
مرگ انبوہ	بیک وقت بہت سے آدمیوں کی موت ۔ فارسی مثل ''مرگ انبوہ جشنے دارد ۔''
مرگ مفاجات	ناگہانی موت ۔
مستبعد	محال ۔ بعید از امکان ۔
مستجمع الصفات	مختلف صفات کا جمع کرنے والا ۔ وہ شخص جس میں بہت سی خوبیاں ہوں ۔
مستقرّ الرّیاست	دارالحکومت ۔
مستمعین	سننے والے ۔ سامعین ۔
مستنبط	(بائے مفتوح) نتیجے کے طور پر جو بات اخذ کی گئی ہو ۔ استنباط (ایک بات سے دوسری بات اخذ کرنا) سے اسم مفعول ۔
مسلوب الاختیارات	جس کے اختیارات چھین لیے گئے ہوں ۔
مسہل	جلاب ۔
مضغۂ گوشت	گوشت کا لوتھڑا ۔
مطرود	مردود ۔ نکالا ہوا ۔
مطلق العنان	خود مختار ۔ آزاد ۔

معاذاللہ	خدا کی پناہ ۔
معاملہ باندھنا	غزل میں عشق کے راز و نیاز یا محبوب سے چھیڑ چھاڑ کی باتیں بیان کرنا ۔
معتقدات عوام	عام لوگوں کے عقیدے ۔
معوّض	(بہ کسر واؤ) ۔ سپرد کرنے والا ۔ (بہ فتح واؤ) سپرد کیا ہوا ۔ سونپا ہوا ۔
مکث	دیر ۔ ڈھیل ۔ توقف ۔
ممنوع التصرفات	جس کا عمل دخل اٹھا دیا گیا ہو۔
مناصب	منصب کی جمع ۔ عہدے ۔
مناکحت	باہم شادی بیاہ کرنا ۔
منتزع	(بالفتح) اکھاڑی ہوئی ۔ چھینی ہوئی ۔
مندا	کاروبار کا سست پڑ جانا ۔ گراں ہو جانا ۔
منفک	جدا ۔
منغّص	مکدر ۔ تیرہ ۔ ناخوش ۔
من و سلویٰ	(من : شہد کی مانند ایک شیریں رطوبت ۔ سلویٰ : ایک قسم کا پرندہ ۔ یہ دونوں چیزیں خدا کی رحمت سے ، حضرت موسیٰ کے

همراهیوں کو بہ طور غذا ملتی تھیں) ۔ مراد خوان نعمت یا نعمت آسمانی ۔

منہ کرنا — رعایت یا لحاظ کرنا ۔

مُواجہ — روبرو ۔ سامنے ۔

مُواخذہ — بازپرس کرنا ۔ جواب طلبی ۔

مُواکلت — باہم کھانا پینا ۔

مُوجّہ — وجہ کے ساتھ ۔ مدلّل ۔

میکائیل — فرشتۂ رزق رساں ۔

میمنت لزوم — با برکت ۔ مبارک ۔

میں کے گلے پر چھری — غرور اور انانیت کا نتیجہ ہمیشہ تباہی ہوتا ہے ۔ جیسے بکری ''میں میں'' کرتی ہے، گویا انانیت کا دم بھرتی ہے ، اسی لیے اس کی گردن پر چھری پھیری جاتی ہے ۔

ن

ناشدنی — کم بخت ۔ ناخلف ۔ ناممکن یا ان ہونی بات ۔

ناقل — نقل کرنے والا ۔

نا کد خدا (نا کتخدا) — کنوارا ۔

ناگزیر	لازم ۔ جس کے بغیر چارہ نہ ہو ۔
نا مشروع	احکام شریعت کے خلاف ۔ ناجائز ۔
نان شبینہ	گزشتہ شب کی بچی ہوئی (باسی) روٹی ۔
نسبت عبودیت	عبد و معبود ، بندہ و خدا کا تعلق ۔
نصاب	مال کی وہ مقدار جس پر سال بھر بعد زکواۃ واجب ہوتی ہے ۔
نفس الامری	واقعی ۔ حقیقی ۔
نقار خانے میں طوطی کی آواز (کون سنتا ہے یا کیا سنائی دے)	مخالفت یا حمایت کے شور و غل میں تنہا ایک آدمی کی رائے سنی نہیں جاتی ۔
نوج	خدا نہ کرے ۔ دور پار ۔ (عورتوں کی زبان میں نعوذ کی بگڑی ہوئی شکل) ۔
نیک نہادی	نیک دلی ۔ نیک طبعی ۔

و

وارے نیارے ہونا (یا وارا نیارا ہونا) ۔	بڑا نفع ہونا ۔ کسی معاملے کا ختم ہو جانا ۔
وا حسرتا	ہائے افسوس ۔

واسوخت	وہ صنف نظم جس میں محبوب کے ظلم و ستم کا بیان اور اس سے بے زاری کا اظہار ہوتا ہے ۔
وثیقہ	عہد۔ پیمان ۔ عہد نامہ ۔ دستاویز۔
ودیعت	امانت ۔

ہ

ہبہ	بخشش ۔ بغیر معاوضے کے عطا کر دینا ۔
ہڈڑا	بری گت ۔ برا حال (کرنا یا کرانا کے ساتھ) ۔
ہتھ چُھٹ	وہ شخص جو ذرا سی بات پر بے دھڑک مار بیٹھے ۔
ہتھیلی پر سرسوں جمانا	امر محال کی خواہش یا کوشش کرنا ۔
ہدف	نشانہ ۔
ہمہ دانی	سب کچھ جاننا ۔
ہنڈکلھیاں	لڑکیاں چھوٹے چھوٹے برتنوں (کلھیوں کی ہانڈی) میں کھانے پکاتی ہیں ۔ خانہ داری کا یہ کھیل ہنڈکلھیاں پکانا کہلاتا ہے ۔
ہیکڑی	اکڑ فوں ۔ زبردستی ۔ ڈھٹائی ۔